مجلس ادارت

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ مرحوم

عبداللطیف اعظمی

امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب کے انتقال کی منحوس خبر ۲ر دسمبر کو موصول ہوئی، اسی وقت جامعہ کے تمام ادارے بند ہوگئے اور ہر طرف رنج و غم کی فضا چھا گئی۔

خواجہ صاحب کا جامعہ سے تعلق روز اول سے رہا ہے۔ مشکل اوقات میں اس کو ہمیشہ اور ہر طرح کا سہارا دیا اور خون دل سے اس کی آبیاری کی۔ اگرچہ جامعہ کے بانیوں میں ان کا شمار نہیں ہوتا، مگر ان کی خدمات بانیوں سے کم نہیں ہیں۔ مرحوم دوسرے شیخ الجامعہ تھے، جن کا مولانا محمد علی مرحوم کے بعد ۲۹ر اپریل ۱۹۲۱ء کو انتخاب ہوا اور پہلے شخص ہیں جنھوں نے جامعہ کو سیاست کی ڈگر سے ہٹا کر تعلیم کی شاہراہ پر ڈالا۔ ان کے دور میں نازک سے نازک وقت آیا، مگر ہراساں اور مایوس ہو کر اس کی ذمہ داریوں سے کنارہ کش نہیں ہوئے اور اس وقت تک جامعہ کو کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے جب تک ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب اور ان کے دو ساتھی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب اور پروفیسر محمد مجیب صاحب جامعہ نہیں آگئے۔ ۱۵ر مارچ ۱۹۲۶ء کو ڈاکٹر ذاکر صاحب شیخ الجامعہ منتخب ہوئے، تو خواجہ صاحب کو جامعہ کی طرف سے اطمینان ہو گیا کہ اب جامعہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے، جو اس کو کبھی بند ہونے نہیں دیں گے۔ خواجہ صاحب اکثر فخر اور غرور کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ میں جامعہ کو ایسے جاں نثار خدمت گذاروں کے ہاتھوں میں دے کر الگ ہوا، جو جامعہ کو بہتر طور پر چلا سکتے تھے اور جو تعلیم کی خدمت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار تھے۔ زمانے نے ثابت کر دیا کہ خواجہ صاحب کا خیال کس قدر صحیح تھا۔

خواجہ صاحب کو بہت قریب سے دیکھنے کی مجھے عزت نصیب ہوئی ہے کچھ عرصہ ہوا، جامعہ کے خلاف کچھ شورش پسندوں نے مختلف اخبارات میں مضامین کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ یہ لوگ خواجہ صاحب سے ملتے، ان کو

خط لکھتے اور طرح طرح کی باتیں پہنچاتے۔ خواجہ صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ جامعہ سے کوئی شخص ہر ہفتہ ان کے یہاں جایا کرے، تاکہ وہ جامعہ کے صحیح حالات سے واقف ہو سکیں اور جامعہ کے متعلق ان کو جو خطوط موصول ہوتے ہیں، ان کے جوابات لکھوا سکیں یہ خدمت میرے سپرد ہوئی، ایک عرصے تک میں ان کی خدمت میں پابندی سے جاتا رہا۔ ان مواقع پر مجھے ان کی خلوت و جلوت سے آگاہی ہوئی، ان کے رجحانات کو سمجھنے اور ان کے خیالات کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ مجھے محسوس ہوا کہ انھیں جامعہ سے بے انتہا محبت اور خلوص ہے۔ وہ مولانا محمد علی مرحوم سے اس لئے خفا تھے کہ وہ جامعہ کی انفرادیت کو مانتے نہیں تھے اور چاہتے تھے کہ حالات سازگار ہوں تو مسلم یونیورسٹی میں اسے مدغم کر دیا جائے۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ جامعہ اور مسلم یونیورسٹی کے معاملات اور مسائل میں فرق کرتے تھے۔ ایک موقع پر انھوں نے اخبارات کو ایک بیان دیا، جس میں انھوں نے مسلم یونیورسٹی کی مذہبیت پر سختی سے نکتہ چینی کی۔ ایک صاحب نے اس سے فائدہ اٹھا کر انھیں جامعہ کی طرف توجہ دلائی۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھ سے جو خط لکھوایا تھا، اس میں جامعہ کی پوری حمایت اور مدافعت کی تھی، میں سنتا آیا تھا کہ وہ اپنی رایوں میں انتہائی بے لاگ اور بیباک ہیں۔ ان ملاقاتوں میں اکثر اس کے مشاہدے کا موقع ملا۔ باوجود اس کے کہ وہ کٹر نیشنلسٹ اور پکے کانگرسی تھے، مگر میں نے دیکھا ہے کہ کانگرسی رہنماؤں کی موجودگی میں کانگرس کے کاموں اور حکومت کی پالیسی پر سختی سے نکتہ چینی کرتے، اسی طرح وہ مذہبی اقدار کے سخت حامی تھے، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنے تعزیتی مضمون میں لکھا ہے کہ "ایمان کے مضبوط اور عبادات کے پابند ہمیشہ تھے" مگر جماعت اسلامی کے ہمدردیوں اور حامیوں کے سامنے بعض ایسے عقائد اور مذہبی رسوم پر جنھیں بہت سے لوگ اسلامی سمجھتے ہیں سخت اعتراض کرتے۔ انھیں اس کا احساس تھا کہ ان کی قومی خدمات کی صحیح قدر نہیں کی گئی، مگر پھر بھی قومی کاموں میں ہر قسم کی خدمت کے لئے پیش پیش ہوتے۔

خواجہ صاحب ان چند لوگوں میں ہیں جو لڑ بھڑ کر جامعہ کو علی گڑھ سے دلّی لائے۔ وہ مجھ سے فرماتے تھے کہ دلّی لے جانے کی کیسے کیسے اور کس کس طرح لوگوں نے مخالفت کی، میں نے کن کن مشکلات میں اور کس کس طرح جامعہ کا تمام اساسہ دلّی پہنچایا اور وہاں کی بے سروسامانی میں ایک ایک چیز کی کس کس

حیثیت سے حفاظت کی۔ دلی آنے کے بعد صحیح معنی میں جامعہ کا تعلیمی دور شروع ہوا اور حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور خواجہ صاحب کی مشترکہ کوششوں سے جامعہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو گئی۔ قاضی عبدالغفار مرحوم نے اس پوری کیفیت کو بڑے دلکش انداز میں تحریر فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں :-

"..... مجھے یاد ہے جب علی گڑھ میں، کبھی تصدق مرحوم کے گھر میں، کبھی خواجہ کی کوٹھی میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک کے یہ تینوں بانی اور معمار جمع ہوتے تھے۔ محمد علی کا مجاہدانہ جوش ضد کرتا تھا کہ نہیں جامعہ کو تو قومی تحریک کے لئے رضاکاروں کے تیار کرنے کا ایک مرکز بنایا جائے اور اجمل خاں اور انصاری کہتے تھے کہ تعلیم کے قدیم سرکاری مسلک سے یہ انحراف جس نے جامعہ کی صورت اختیار کی ہے مستقل اور پائدار ہونا چاہیئے۔ کیا کیا مباحثے اور فریقین کے استدلال کی کیا کیا کشمکش اُن ہفتوں اور مہینوں میں جاری رہی۔ بالآخر مسلم نوجوانوں کی ایک نئی نسل کا یہ سانچہ تیار ہوا اور پہلے ہی دن سے حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب اور خواجہ صاحب نے اس کشتی کے پتوار اپنے ہاتھوں میں لئے۔ کاغذ کی یہ کشتی ــــ ارادوں اور تمنّاؤں کی یہ ناؤ جو اس زمانے کے طوفانی سمندر میں ڈالی گئی ــــ رفتہ رفتہ لکڑی اور لوہے کی کشتی بن گئی، اس کے ٹوٹے ہوئے پتواروں اور بادبانوں کے بجائے رفتہ رفتہ نئے بادبان اور نئے پتوار اس ناؤ کو میسر آئے اور تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات کی کشاکش سے نکل کر بالآخر نوجوان ملاحوں کا قافلہ ایک ایسے بندرگاہ تک پہنچ گیا، جہاں سے اب ہر سال مسلمانوں کی ایک نئی نسل علم و عمل کا پیام لے کر ملک کے گوشے گوشے میں پھیل رہی ہے۔"

خواجہ صاحب نے شیخ الجامعہ کی حیثیت سے بڑی سرگرمی اور جوش کے ساتھ جامعہ کے کاموں میں دلچسپی لی، مگر ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد ۲۳ رمئی ۳۶ء کو وہ امیر جامعہ منتخب ہوئے تو جامعہ کے معاملات سے بڑی حد تک بے تعلق رہے، انھوں نے یہاں کے کام کرنے والوں پر تمام تر بھروسہ کیا اور صرف خاص خاص اور اہم مواقع پر اپنے مشوروں سے نوازتے اور ضرورت ہوتی تو اپنی بے لوث خدمات پیش فرما دیتے مگر آخری دور میں انھیں بہت اصرار تھا کہ ان کی ضعیفی اور صحت کی خرابی کے پیش نظر انھیں امیر جامعہ کی ذمہ داریوں سے بری کر دیا جائے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں جب ان کی مدتِ کار ختم ہوئی تو انھوں نے معتمد انجمن جامعہ ملیہ اسلامیہ کو لکھ کر بھیجا کہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو امیر جامعہ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب کو شیخ الجامعہ منتخب کر لیا

جاتے۔ اس وقت ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے علی گڑھ جا چکے تھے۔ اور پروفیسر محمد مجیب صاحب نائب شیخ الجامعہ کی حیثیت سے شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دے رہے تھے مگر ڈاکٹر ذاکر صاحب نے اصرار کرکے انھیں امیر جامعہ رہنے پر راضی کر لیا، چنانچہ وہ حسب سابق امیر جامعہ منتخب ہوئے اور پروفیسر مجیب صاحب شیخ الجامعہ۔ نومبر ۶۰ء میں جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا، تو خواجہ صاحب نے جلسۂ خاص میں اعلان فرمایا کہ انھوں نے ریٹائر ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے، اب کسی اور کو امیر جامعہ منتخب کر لینا چاہیے۔ مگر شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب، ڈاکٹر عابد حسین صاحب اور جامعہ کے دوسرے بزرگوں نے ان سے اصرار کے ساتھ درخواست کی کہ جامعہ کو جلد ہی یونیورسٹی کا درجہ ملنے والا ہے۔ انھیں بڑی خوشی ہوگی، اگر خواجہ صاحب کی سرپرستی میں جامعہ کو یہ اعزاز حاصل ہو۔ اگرچہ ان کا اصرار باقی رہا، مگر خدا کو منظور تھا کہ ان ہی کے دور میں جامعہ کو یونیورسٹی کی حیثیت حاصل ہو اور جامعہ سے ۱۹۲۱ء میں ان کا جو رشتہ قائم ہوا تھا وہ آخر دم تک باقی رہا۔

ابھی تک میں نے خواجہ صاحب کی زندگی کا صرف ایک رخ پیش کیا ہے جس کا تعلق جامعہ سے ہے، مگر قومی اور علمی خدمات بھی ان کی کچھ کم نہیں ہیں۔ جامعہ میں مرحوم کی یاد میں جو تعزیتی جلسہ ہوا تھا، اس میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے ان کی قومی خدمات کو بہت تفصیل سے بیان فرمایا تھا۔ موصوف نے خواجہ صاحب کی خدمات کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "خواجہ صاحب پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ تھے، پنڈت جی کی طرح خواجہ صاحب بھی ایسے باپ کے بیٹے تھے، جنھوں نے بڑی دولت چھوڑی تھی۔ خواجہ صاحب نے اپنی یہ دولت آزادی پر نچھاور کر دی، مسلم لیگ کا اس زمانے میں مسلمانوں پر جادو چل گیا تھا، خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو سمجھتے تھے کہ اس سے ملک کی تحریک آزادی کو نقصان پہنچے گا اور ملک کی تقسیم مسلمانوں کے لئے مفید نہیں ہوگی، اس لئے وہ تقسیم کی مخالفت کرتے تھے، خواجہ صاحب نے مسلم مجلس قائم کی، مسلمانوں کے بہت سے لیڈر مسلم لیگ کی مخالفت کیا کرتے تھے مگر احتیاط کے ساتھ، لیکن خواجہ صاحب ان میں سے تھے جو احتیاط کو جانتے ہی نہیں، بے دھڑک اور بے لاگ کہتے تھے، ان کی تنقیدوں میں جوش ہوتا غصہ نہیں

ہوتا تھا، مگر بے لاگ ہوتی تھیں۔" آخر میں ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ خواجہ صاحب کی خدمات میں جو زندہ رہیں گی، ان میں جامعہ ملیہ ہے، جو ان کے خلوص اور ایثار کی ایک جیتی جاگتی زندہ مثال ہے۔"

خواجہ صاحب کے انتقال پر اخبارات میں جو تعزیتی اداریے لکھے گئے ہیں، ان میں مرحوم کی خدمات کا بھرپور اعتراف کیا گیا ہے اور ان کی زندگی کے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں، اس لئے ذیل میں ان کے اہم حصے پیش کئے جاتے ہیں :-

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی ان کے حالات زندگی کے متعلق لکھتے ہیں "علی گڑھ سے اخلاص ترکے میں پایا تھا، ان کے والد محمد یوسف مرحوم سرسید کے مخلصوں میں تھے۔ شادی نواب محمد سمیع اللہ خاں مرحوم کی پوتی سے ہوئی۔ یہ سمیع اللہ خاں وہ تھے جو ابتداء تحریک علی گڑھ میں سرسید کے مخلص ترین رفیق ہی نہیں، بلکہ کہنا چاہیئے کہ برابر کے سہیم و شریک تھے۔ علی گڑھ میں پڑھ کر ولایت گئے، کیمبرج کو بی اے کیا، لندن رہ کر بیرسٹر ہوئے، واپسی پر بیرسٹی پہلے پٹنہ میں شروع کی، پھر علی گڑھ میں اس کے بعد الہ آباد ہائی کورٹ میں۔ آخر میں سالہا سال سے پھر علی گڑھ آگئے ہیں اور سارا وقت قومیات کی نذر کرنے لگے تھے۔ اخیر میں بیرسٹری سے بالکل ہی دست بردار ہو گئے تھے، قومی اور ملّی دلچسپیاں آخر تک نہ چھوڑیں بلکہ اب ان مشغلوں سے انہماک صحت سخت خراب رہنے کے باوجود بڑھ ہی گیا تھا۔" روزنامہ قومی آواز (لکھنؤ) نے لکھا ہے کہ "خواجہ صاحب بہت پکے مسلمان تھے اور اتنے ہی پکے قوم پرور بھی تھے۔ وہ اس زمانے کی بہت سی اصلاحوں اور آزادیوں کے خلاف تھے اور پرانی روایات اور اقدار کے زبردست حامی تھے۔ مذہبی پابندیوں کی وہ قدر کرتے تھے اور نئی نسل کو اسی راہ پر تربیت دینا چاہتے تھے۔" ہفتہ وار ندائے ملّت (لکھنؤ) اپنی ۱۵ دسمبر کی اشاعت میں خواجہ صاحب کے بارے میں لکھتا ہے "...... تحریک خلافت کے علاوہ جنگ بلقان و طرابلس میں ترکوں کی حمایت کی تحریک اور آزادی کی جملہ تحریک میں ہمیشہ پیش پیش رہے، جیل بھی گئے اور دوسری قربانیوں کے میدان میں بھی آگے آگے رہے، خلافت کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے، ایک زمانے میں تو کانگریس کے سکریٹری بھی رہے ہیں۔ آپ کی کوٹھی سمیع منزل ہمیشہ سیاسی اور علمی و ادبی مجلسوں کا مرکز رہی ہے۔ وفات کے وقت آپ کی عمر ۷۷ برس تھی۔"

آزادی کی قیمت

پروفیسر محمد مجیب

انسان کی ان تمام صفات کو دیکھا جائے جن کے یکجا ہونے سے اس کی طبیعت اور شخصیت بنتی ہے تو اس کا مقام صرف اس دنیا میں نہیں ہے بلکہ پاتال سے لے کر عرش تک پھیلا ہوا ہے، مگر انسان اپنے میدان کو محدود نہ کرے، خون کی گرمی کو زندگی کی گرمی نہ مان لے تو اس کی اپنی طبیعت بجلی بن کر سب کچھ جلا کر خاک کردے گی۔ اسی وجہ سے اس کے حیوانی عنصر کو اس کے روحانی عنصر کا، اس کے جذبات کی تڑپ کو اخلاق کا، اس کے عمل کو عام انسانی افادیت کا پابند کیا گیا ہے، اس کی زندگی قاعدے قانون اور رسم ورواج کے مطابق بسر ہوتی ہے اور اسے اپنی جانچ کرتے رہنے اور صحیح راستے پر چلنے کی ہدایت کی جاتی رہی ہے۔ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر زمانے میں انسانی جماعتیں اپنی تنظیم کرتی رہی ہیں، اس تنظیم کی بنیاد انھوں نے ایسے اصولوں اور ایسی قدروں پر رکھی ہے جو انھیں سب سے اعلیٰ معلوم ہوئیں اور انھوں نے آزادی کا ایک مطلب یہ لیا ہے کہ مخالف جماعتوں سے اپنی جماعت کو محفوظ رکھیں اور دوسرا مطلب یہ لیا ہے کہ جماعت کے افراد کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور بے جا دباؤ ڈالنے سے روکیں۔ گویا اب انسان کی انسانیت کا پیمانہ آزادی کا وہ تصور ہے، جس کی بدولت جماعتیں اپنے وجود کو قائم رکھتی ہیں اور افراد اپنے اختیارات اور فرائض طے کرتے ہیں۔

آزادی کی خواہش انسان کی طبیعت میں ہے، مگر اس خواہش کے علاوہ وہ اور بہت سی باتوں سے متاثر ہوتا رہتا ہے۔ اسے کھانے پہننے کو چاہیئے، روزگار چاہیئے، آل اولاد چاہیئے کہ اس کا نام باقی رہے، اس کا اطمینان چاہیئے کہ وہ اپنی زندگی بغیر صدموں اور حادثوں

سے گذار سکے گا۔ یہ ضرورتیں افراد اور سماج کے اندر آزادی کے دشمن پیدا کرتی رہتی ہیں۔ قدیم مصریوں
نے یہ سمجھ کر کہ ان کی فلاح و بہبود کا مدار فرعون پر ہے، بادشاہ پرستی اختیار کی، قدیم یونانیوں کو
یقین تھا کہ غلام رکھنا ضروری ہے تاکہ آزاد شہری حکومت کے کاموں کے لئے پورا وقت دے سکیں،
قدیم رومیوں میں، جب تک کہ ان کی حکومت جمہوری تھی، بڑے جاں باز شہری پیدا ہوتے رہے
مگر دولت اور ملک کی ہوس نے ان میں شہنشاہی قائم کر دی۔ ایشیائی ملکوں میں فساد سے بچنے کی
خواہش نے بادشاہوں کی طاقت کو بہت بڑھا دیا۔ جدید زمانے میں یورپی ملکوں نے بیجا قوم پرستی
کے ہاتھوں بہت نقصان اٹھایا اور لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھا دیا کہ اگر ان کی قوم دوسروں
سے لڑ کر انھیں نیچا نہ دکھا سکی تو اس کی اپنی آزادی اور آبرو قائم نہ رہ سکے گی۔ برطانیہ اور امریکہ
کی متحدہ ریاستیں آزاد جمہوری حکومتوں کی نمایاں مثالیں ہیں، لیکن ان کی صنعتی اور معاشی تنظیم پر
یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ اس میں سماج کے ایک طبقے کے مفاد کی خاطر جمہور کی حق تلفی کی جاتی ہے۔
روس میں ۱۹۱۷ء میں ایک انقلابی حکومت قائم ہوئی، جس کا دعویٰ تھا کہ وہ مزدوروں اور کسانوں
کی حکومت ہے اور ایسی ہی قومی انقلابی حکومت بڑی جد و جہد اور خوں ریزی کے بعد ۱۹۴۹ء
میں چین میں قائم ہوئی۔ دونوں ملکوں میں در اصل کمیونسٹ پارٹی کی حکومت ہے، جس کا اپنا
فلسفۂ حیات اور اپنے معاشی اور سیاسی منصوبے ہیں۔ ان سے مزدوروں اور کسانوں کو کتنا
فائدہ پہنچا ہے، اس کا اندازہ ابھی نہیں کیا جا سکتا، البتہ اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں
ہے کہ روس اور چین میں افراد کی آزادی حکومت کے اختیار میں غائب ہو گئی ہے۔
تاریخ میں اس کی اتنی مثالیں ملتی ہیں کہ بادشاہوں اور قوموں نے محض اپنی طاقت کے
بل پر دوسرے ملکوں پر قبضہ کر لیا اور ان کی آبادی کو اپنا محکوم بنا لیا کہ اب سیاسی خود مختاری ایک
بنیادی قدر بن گئی ہے اور جب کبھی یہ سوال اٹھتا ہے کہ قوم کی آزادی کو برقرار رکھا جائے یا افراد کی
آزادی کو، تو ہمیشہ قوم کی آزادی اور خود مختاری کو ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ اصولاً صحیح ہے، اس
لئے کہ افراد کے حقوق کا مدار اس نظام پر یعنی اس قوم اور قومی حکومت پر ہوتا ہے جو انھیں

دستور اور قانون کے ذریعے یہ حقوق دیتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ قومی آزادی پر مال اور جان قربان کرنے کو تیار رہتے ہیں اور ہر اچھی مثال دوسروں کی ہمت کو بڑھاتی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ بھی ہوا ہے کہ قومیں اپنی آزادی کو محفوظ اور اپنی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے صرف اپنی فوجی طاقت پر بھروسا کرنے لگیں، فوج کی تعداد بڑھانے اور نئے نئے جنگی آلات تیار کرنے کی فکر میں لگ گئیں اور سائنس کی ترقی کی بدولت ایٹم بم بنے جو پل بھر میں بیسیوں شہر برباد اور لاکھوں آدمیوں کو ہلاک کر سکتے ہیں۔ اب جنگ نہ ہو تب بھی جنگ کا خوف طاری رہتا ہے اور ایسی حالت میں سب سے طاقت ور قوموں کی آزادی بھی گرفتاری کی شکل ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس فضا میں جو کسی اعتبار سے بھی امن اور عافیت کے لئے سازگار نہ تھی آزاد ہندوستان نے بڑی اخلاقی ہمت سے کام لے کر ایک نئی راہ اختیار کی، اپنی آزادی اور خودمختاری کو برقرار رکھنے کے لئے، اپنی جنگی طاقت پر نہیں بلکہ اس امن پسندی پر بھروسا کیا جو مہذب انسانوں میں ہونا چاہیئے اور ہوتی بھی ہے اور دوسری طرف شہریوں کی آزادی کا ضامن صرف دستور اور قانون اور عدالت کو نہیں بنایا بلکہ خود شہریوں کو، آزاد ہندوستان کا ایک نصب العین یہ رہا ہے کہ بین اقوامی معاملات میں خیر خواہی کے جذبے کو ابھارے اور اگر اختلافات پیدا ہوں تو انھیں غیر جانب دار قوموں کی مدد سے گفتگو کے ذریعے دور کرے اور دوسرا نصب العین یہ رہا ہے کہ رفتہ رفتہ ملک کے عوام کو ملک کی فلاح و بہبود کا ذمہ دار بنائے، حکومت کا کام حکم دینا نہ رہے بلکہ مشورہ دینا افراد کی رہنمائی کرنا، یہاں تک کہ وہ جنتا کی مرضی کو پورا کرنے کا ایک ذریعہ بن جائے۔ ہمارے زمانے میں آزادی کا اس سے اعلیٰ اور اس سے زیادہ ہمہ گیر تصور پیش نہیں کیا گیا ہے اور اس سے عمل میں لایا جا سکا تو یہ انسانی تاریخ کا ایک انقلاب انگیز سیاسی اور انتظامی کارنامہ ہوگا۔

اب ہمیں سوچنا چاہیئے کہ اگر دوسرے ملکوں کے شہریوں نے قومی آزادی کے ایسے تصور کے لئے جو دراصل محدود تھا بڑی بڑی قربانیاں کی ہیں تو ہمیں آزادی کے اپنے اعلیٰ تصور

کے لئے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ دوسروں نے اس تصور کی بہت قدر کی ہے۔ امریکہ کی متحدہ ریاستوں، برطانیہ، کومن ویلتھ کے ملکوں، جرمنی، روس اور مشرقی اور مغربی یورپ کے دوسرے ملکوں نے ہمارے پنج سالہ منصوبوں کو کامیاب کرنے میں مختلف طریقوں سے مدد پہنچائی ہے، اگرچہ ہم برابر یہ کہتے رہے کہ ہم امن پسندی کا طریقہ نہیں چھوڑیں گے اور جمہوری یا کمیونسٹ ملکوں کے ساتھ اس طرح نہ مل جائیں گے کہ کوئی ہمیں اپنا مخالف سمجھنے لگے۔ ہم نے ایک سوشلسٹ ولیفر اسٹیٹ کے نقشے کو سامنے رکھ کر بغیر جبر سے کام لئے صنعتی اور کاروباری نظام میں بڑی بڑی تبدیلیاں کی ہیں اور سرمایہ دار اور مزدور کا جھگڑا اٹھائے بغیر دونوں کو ترقی کے کاموں میں شریک کیا ہے اور اس طرح جمہوری اور کمیونسٹ فلسفے کی خوبیوں کو لے کر انھیں ہم آہنگ کیا ہے۔ جو لوگ آزاد مقابلہ کے حامی ہیں، وہ ہمارے طریقے کو پسند نہیں کرتے مگر اسے اپنے لئے خطرہ بھی نہیں مانتے۔ چین جو اچانک ہمارا مخالف بن گیا ہے اور ہمارے ساتھ لڑائی چھیڑ دی، اس کا ظاہری سبب تو یہ ہے کہ وہ نیفا اور لداخ کے بعض حصوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اس کا اصل مقصد ہمارے صنعتی اور سیاسی منصوبوں اور امن پسندی کے ذریعہ تمام ترقی یافتہ ملکوں سے امداد حاصل کرنے کے عظیم الشان تجربے کو ناکامیاب کرنا چاہتا ہو۔ ہم نے صرف ایک ایسے تجربے میں کئی منزلیں طے نہیں کرلی ہیں جو یہ ثابت کرتا ہے کہ معاشی اور صنعتی ترقی کے لئے ظلم اور جبر کا جو طریقہ چین میں اختیار کیا گیا ہے وہ غلط ہے، بلکہ ہم نے رفتہ رفتہ اپنی کمیونسٹ پارٹی کی اکثریت کو اس پر آمادہ کرلیا کہ وہ جبر اور تشدد کو چھوڑ کر اپنی مخصوص پالیسی پر عمل کرنے کے لئے دستور اور قانون کے مقرر کئے ہوئے طریقوں کو اختیار کرے۔ اس میں چین کی بڑی شکست ہے، جس کا بدلہ وہ لینا چاہتا ہوگا۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اب ہماری جد و جہد کے دو میدان ہیں، ایک تو وہ جس میں سنگینوں اور توپوں، ٹینکوں اور ہوائی جہازوں سے مقابلہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ کہ جس

میں انسان کی تمام صلاحیتیں جانچی جاتی ہیں، ایک میدان میں فائدے اور نقصان کا حساب بہت جلد لگایا جا سکتا ہے، دوسرے میں فائدے اور نقصان دونوں کی اتنی مختلف صورتیں ہیں کہ حساب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ جو حق کی خدمت کرنا چاہتا ہو اسے فائدے نقصان کے پھیر سے نکل جانا چاہیئے۔ ہم اس پھیر سے نکل سکے تو ہمارا اٹھنا بیٹھنا، جاگنا اور سونا، ہماری محنت اور ہماری آرزوئیں سب ایک ہی قدر سے وابستہ ہو جائیں گی، ہماری صلاحیتیں ہماری مشعل ہوں گی، ہمارا ضمیر ہماری رہنمائی کرے گا اور ہم آزادی کی اس منزل پر پہنچ جائیں گے جو انسان کا اصل مقام ہے۔

(یہ تقریر ۱۱ر دسمبر ۱۹۶۲ء کو آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر ہوئی

عہدِ قاچار میں فارسی شاعری کا احیاء

جناب آفتاب اختر

احیار سے ہماری مُراد کسی خاص طرز کو جسے ترک کر دیا گیا ہو دوبارہ اس کے اصلی رنگ میں پیش کرنے سے ہوتی ہے۔ اس کی ضرورت اُسی وقت پیش آتی ہے جب کوئی مخصوص رنگ ختم ہو گیا ہو یا ختم ہونے کی طرف تیزی سے مائل ہو۔ احیا ایسی ہی کسی زوال شدہ حالت میں ممکن ہے۔

قاچاری عہد میں احیار کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اور طرزِ قدیم کے ختم ہو جانے کے کیا وجوہ تھے۔ اس کے صحیح اسباب کی دریافت کے لئے ایران میں فارسی شاعری کی ابتدا اور قاچاری عہد تک اس کے ارتقار کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔

ایران میں اسلام کے فروغ کے بعد سامانی عہد میں شاعری کا چرچا ہوا۔ شبلی کا خیال ہے کہ ایران میں فارسی شاعری کے باقاعدہ آغاز کا سہرا رودکی کے سر بندھتا ہے جو عہدِ سامانی کا مستند شاعر تھا۔ اسی زمانہ میں دقیقی نے اپنی شاعری کے ذریعے رزمیہ کی ابتدا کی تھی اور ایک ہزار اشعار فردوسی کے شاہنامہ کے لئے شمعِ راہ کے طور پر چھوڑ گیا تھا۔ اس عہد کے ادب کی خصوصیات میں صفائی، سلاست اور انسانی جذبات کی صحیح ترجمانی اساسی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس دور میں شاعری کے مضامین اسلاف کے کارناموں دلی جذبات کے اظہار اور مناظرِ قدرت کی عکاسی پر مشتمل ہوتے تھے۔ رودکی نے منظرکشی اور طرزِ ادا کی سلاست کو پُرکاری اور صناعی کی حد تک پہنچا دیا تھا۔ دقیقی نے اپنی شاعری کے ذریعے جوشِ بیان بے ساختگی اور جنگی سے ایرانی شعرا کو روشناس کرا دیا تھا اور بڑی حد تک شاعری کی زبان غیر ملکی الفاظ سے اتنی پاک ہو گئی تھی کہ اُس پر موجودہ دور کی شاعری کا شبہ ہوتا ہے۔ اس زمانے کے قصیدے تصنع بناوٹ اور غلو سے

پاک تھے۔ شعراء کی تخئیل میں الجھاؤ کم اور خیالات میں ندرت وصفائی زیادہ تھی۔ شاعری میں استعمال کی جانے والی تشبیہات صاف سادہ سہل اور نیچرل تھیں۔ جب ہم اس دور کی شاعری پر نظر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شعراء نے اس قدر ترقی کر لی تھی کہ اس دور کی شاعری یورپ کی جدید زبانوں کی شاعری کی صف میں رکھی جا سکتی ہے۔

عہدِ غزنویہ میں قصیدے نے بہت ترقی کی تھی اور اس دور میں عنصری جیسے باکمال شعراء سے تعارف حاصل ہوتا ہے جس کی شاعری میں اعلیٰ مضامین صحیح جذبات اور پرزور مدح موجود ہے۔ عنصری اور منوچہری کے قصاید میں واقعہ نگاری اور قدرتی مناظر کی بولتی ہوئی تصویریں نظر آتی ہیں انھوں نے صنایع وبدایع کا استعمال بہت احتیاط سے کیا ہے۔ فرخی نے محمود کی وفات پر مرثیہ لکھ کر مرثیہ نگاری کی طرز میں جدید اضافہ کیا تھا۔ اس دور میں زبان کی ترقی کی طرف بھی توجہ کی گئی تھی۔ اس دور کی شاعری میں خیالات کی صفائی سادگی طرزِ ادا میں پرجستگی اور اعتماد پایا جاتا ہے خیالات کی ندرت اور بلند پروازی بھی اس دور کی نمایاں خصوصیت ہے۔ فردوسی نے اپنی شاعری کے سادہ طرز سے صنف شاعری میں نیا رنگ نیا جوش اور نیا ولولہ بھی بھر دیا تھا۔

سلجوقیوں کے زمانہ میں تصنع مبالغہ پیچ در پیچ خیالات مشکل اور بلند آہنگ الفاظ کا استعمال بعید از قیاس استعارات کی کثرت متاعِ شاعری ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی شاعری نے ڈیڑھ سو سال کی اس قلیل مدت میں نیچر کا دامن چھوڑ دیا تھا۔ شاعری میں جذبات کی سادگی اور طرزِ ادا کی بے ساختگی اور برجستگی تصنع اور آورد میں تبدیل ہو گئی تھی۔ آخر دورِ سلجوقیہ میں صوفیانہ شاعری کا بے حد عروج ہوا۔ حکیم سنائی نے اس صنف میں بہت اضافہ کیا۔ قصاید کو اگرچہ کوئی خاص ترقی نہیں ہوئی کیوں کہ خوشامد اور مبالغہ میں کوئی کمی نظر نہیں آتی۔ قصیدے نہ تو ہیئت کے لحاظ سے تبدیل ہوئے اور نہ تخئیل ومواد کے لحاظ سے۔ لیکن اس زمانہ میں فارسی شاعری کے مروجہ سبک (طرز) میں تبدیلی شروع ہو گئی۔ عربی کے مغلق الفاظ عربی ترکیبیں اور علمی ومذہبی اصطلاحیں نظم میں آہستہ آہستہ جگہ پانے لگیں اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور شعراء انوری وخاقانی تک

پہنچتے پہنچتے اس کے آثار و اثرات کافی نمایاں ہو گئے۔ اس دور کے بعض شعرا نے مشکل گوئی قافیہ پیمائی اور باریک بینی شروع کر دی اور پڑھنے والے کو حیران و ششدر کرنے کے لئے اپنی شاعری میں معمے اور دقیق علمی مسائل شامل کرنے لگے۔

اس کے بعد مغل اور تیموری دور میں جو عام تباہی اور قتل و غارت گری ہوئی۔ انسانیت کو تہ و بالا کرنے کے جو کھیل کھیلے گئے۔ انھوں نے شمالی ایران اور خاص کر خراسان کے علمی و ادبی آثار کو فنا کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں پر قنوطیت کا اس درجہ غلبہ ہوا کہ ان کے شجاعانہ جذبات فنا ہو گئے اور رزمیہ شاعری کی موت واقع ہو گئی۔ ہر طرف تصوف ہی تصوف نظر آنے لگا۔ عشق مجازی عشق حقیقی بن گیا۔ قصیدہ گوئی برائے نام رہ گئی۔ علمی و فنی اصطلاحات کی کثرت لفظی بازیگری اور مبالغہ کا دور دورہ ہو گیا۔ اس دور میں فارسی سبک بگڑنا شروع ہوا اور خاص کر مشکل ترکیبوں ادق استعاروں اور عربی جملوں کی بھرمار شروع ہو گئی۔ استعاروں اور تشبیہوں میں ابہام چھوٹی چھوٹی باتوں میں مبالغہ پیدا ہو گیا۔ شاعر ممدوح یا معشوق کی حد سے زیادہ تعریف کرنے لگے۔ بے جا خوشامد اور چاپلوسی نے ان کی خودداری نہ صلاحیتوں کو سلب کر لیا۔

مغل دور کے اس غیر فطری سبک کی صفوی عہد میں کافی ترقی ہوئی۔ عجیب و غریب ترکیبیں، غیر مانوس الفاظ مسلسل صنعتیں، نکتہ گوئی، مضمون آفرینی پیچیدہ اور باریک معانی پیدا کرنے کا عام رواج شروع ہو گیا۔ اس عہد میں حکمراں طبقے کا مذہبی عروج صوفیوں پر زوال لے آیا یہ حقیقت ہے کہ اس دور کی شاعری انتہائی پستی میں جا پڑی تھی اور اس کا انحطاط عہد قاچار سے قبل ہی اپنی تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اس حقیقت کا تقریباً سبھی نے اعتراف کیا ہے۔ مجمع الفصحا کے مصنف رضا قلی خاں ہدایت نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے مرزا محمد عبدالوہاب قزوینی اس کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بے شبہ فارسی شاعری دور صفویہ میں انتہائی پستی میں جا گری تھی۔ ڈاکٹر آیتے نے بھی اپنی کتاب "فارسی شاعری" میں اس کا

اظہار کیا ہے۔ پروفیسر براؤن نے بھی شعر و سخن کے اس زوال پر افسوس کیا ہے۔

بارہویں صدی ہجری کے آخر میں ایرانی ادبیات نے پھر ایک کروٹ لی۔ مغلیہ اور تیموری دور کے پُر تکلف طرز پر زوال آنے لگا خاص طور سے صفوی دور کی مضمون آفرینی، نکتہ سنجی، جملہ بندی کے رواج کے بعد قدما کے اسلوب سے رجوع کرنے کی نئی تحریک ایران میں شروع ہوئی۔ اس کا بڑا مرکز اصفہان تھا۔ شعراء نے مسعود کی منوچہری۔ فرخی۔ معزی۔ فردوسی جیسے متقدمین کا اتباع شروع کر دیا۔ پیچیدہ مضامین کی تکرار اور پُر تکلف عبارتیں لکھنے کا رواج آہستہ آہستہ کم ہوتا گیا۔ شاعر سیدھی سادی سلیس زبان لکھنے لگے۔ دور از کار تشبیہیں استعارے اور مضامین نظم سے خارج کئے گئے۔ قدما کی طرز سخن اور ان کے مضامین کا احیاء شروع ہوا۔ شاعری کے خد و خال تبدیل ہو گئے۔ اس کے دو سبب تھے ایک مغربی تہذیب و تمدن کا ایرانی شعراء پر اثر دوسرے استبدادی (قاچاری) حکومت سے اہل ایران کی بیزاری ان جذبات و خیالات نے ان پر براہِ راست اثر کیا اور جذبۂ حریت کی بیداری شروع ہو گئی۔ دراصل قاچاری عہد کش مکش کا دور ہے جس میں انقلاب کے جراثیم تیزی سے نشو و نما پا رہے تھے۔ اور شعراء کے دلوں میں مغربی اثرات کے ماتحت تصنع اور لفظی صناعی اور معاملہ بندی سے نفرت بڑھ رہی تھی۔ اس دور کے شعراء دور متوسطین کے شعراء کی پھیلائی ہوئی مشکل پسندی اور دقت پسندی جیسی بیماری سے محفوظ رہتے ہوئے دور متقدمین کی روش پر اس لئے چلتے ہیں کہ یہی وہ طرز ہے جس کو اپنا کر بڑی سادگی سے اثر انگیز انداز میں دلی جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔

قاچاری دور کے شعراء کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی۔ اس لئے وہ طرز قدیم پر کچھ عصری خوبیوں کے اضافہ کے ساتھ چلنے لگے۔ اس احیاء کی کوشش نے ان پر اس درجہ غلبہ کر لیا کہ لوگ ان کو دور قدیم کا نقال سمجھنے لگے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ نقال نہیں تھے، بلکہ انھوں نے اس میں بہت سے اہم اضافے بھی کئے تھے۔ جنھیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دور احیاء کے اولین علم برداروں میں سید محمد شعلہ اور میر سید علی مشتاق کا شمار ہوتا ہے۔ یہ بہترین غزل گو تھے اور شاعری کا فطری اور سچا ذوق تھا۔ ان کے بعد اس طرح کی طرز کو زندہ کرنے والوں

کی صف میں نشاط اصفہانی، قاآنی، عاشق اصفہانی، سید محمد ہاتف، عمر اصفہانی، صبا کاشانی، وصال شیرازی، یغمائے جندقی، سپہر کاشانی اور طاہرہ قرۃ العین کا شمار ہوتا ہے جن کی شاعری کو محض تقلید نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ ان کی شاعری عصری تحریکات کا پرتو بھی لئے ہوئے تھی اور واردات قلبی کی آئینہ دار بھی تھی۔ یہ لوگ جو دیکھتے یا جو دل پر گزرتی اس کی فطری تصویر کشی کرتے تھے۔ تصنع لفاظی۔ الجھاؤ اور آورد کا نام نہ تھا۔ جذبات احساس فطری تھے۔ تخیل کی ان دیکھی دنیا میں گم کردہ راہ مسافر کی طرح کبھی بھٹکتے نہیں تھے۔ سیاسی ماحول اور ملکی اثرات کی وجہ سے ان کی شاعری میں وطنیت قومیت ایثار اور آزادی کے جذبات کا اضافہ ہوا تھا۔ ان کے کلام میں جوش روانی پختگی سلاست زور سادگی صفائی فصاحت شیرینی شوخی درد اور سوز بھی ملتا ہے۔"

بلاشبہ اس دور کے دامن میں عہد قدیم کی تمام خوبیاں موجود تھیں جو اس دور کے شعراء کو راس آئیں اور اس طرح قدیم دور کے سادہ اور صاف سبک کا احیاء ہو سکا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ دور مشروطہ کی شاعری کو اس سے بہت فائدہ پہنچا اور انھوں نے ان کے سبک کو زیادہ نکھار کر پیش کرنے کی کوشش کی جس میں وہ زیادہ کامیاب تو نہ ہو سکے لیکن ان کی شاعری ان کے سماج اور اس میں پائی جانے والی کش مکش کی آئینہ دار ضرور بن گئی۔ سیاسی شعور بے انتہا بیدار ہو گیا لیکن شاعری میں شیرینی پہلے جیسی نہ آ سکی۔ البتہ جوش ولولے اور امنگ نے ان کی شاعری کو ایک نئے آہنگ سے آشنا کر دیا۔ مٹھاس کی جگہ گھن گرج پیدا ہو گئی جس نے قاچاریوں کے ظلم و استبداد اور روسیوں اور انگریزوں کے مظالم کے خلاف رجز کا کام دیا۔

"ڈاکٹر بجنوری کے چند خطوط"

جناب نادم سیتاپوری

خطوط بھی ہوں چاہے ادبی! اپنے مذاق اور شعور کے مطابق بہرحال کچھ نہ کچھ جاذبیت رکھتے ہی ہیں۔ لیکن مشاہیر کی تحریرات اور مکاتیب اکثر خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں۔ شہرت یا ناموری خواہ کسی شعبۂ زندگی سے تعلق رکھتی ہو فطرتاً انسان کی اجنبیت کو اس طرح دور کر دیا کرتی ہے جیسے یہ شخصیت یا کردار نامانوس نہ ہونے کی وجہ سے اپنا ہی ہے۔

غالب تو اردو خطوط نگاری کے ایک نئے اسلوب و انداز کے بانی ہی تسلیم کئے گئے ہیں لیکن ان کے معاصرین اور بعد کے شعراء اور ادیبوں میں بھی ایک اچھی خاصی تعداد ان لوگوں کی سامنے آچکی ہے جن کے خطوط ادبی حیثیت سے کافی مقبول ہوئے۔ سرسید، شبلی۔ مہدی الافادی۔ حالی، اکبر الہ آبادی۔ امیر مینائی۔ اقبال، غرضیکہ مشاہیر میں شاید ہی کوئی بچا ہو جس کے خطوط نے اردو زبان و ادب میں کسی نہ کسی نہج سے اضافہ نہ کیا ہو، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کا نام بھی اس فہرست میں آجاتا لیکن ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ ابھی تک شاید چھپا نہیں۔ اور اگر چھپ چکا ہے تو اتنا کمیاب ہے کہ میں حاصل نہ کر سکا متفرق خطوط ضرور نظر سے گذرے ہیں لیکن ان میں بھی اکثر ذاتی اور نجی! جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے ان کے ادبی خطوط کچھ زیادہ ہوں گے بھی نہیں۔ ان کی ادبی زندگی کی عمر ہی اتنی کم تھی کہ اگر ان کی بلند پایہ تخلیق "محاسن کلام غالب" قبول عام حاصل نہ کر لیتی تو ڈاکٹر بجنوری بھی اپنے دوسرے معاصرین کی طرح گمنام رہ جاتے۔

ڈاکٹر بجنوری اتنے پاکیزہ ادبی مذاق اور سنجیدہ شعور انسان تھے کہ اگر انھیں زندگی موقع دیتی تو شاید "غالبیات" کے بہت سے گوشے تشنۂ تکمیل نہ رہ جاتے۔ خوش نصیبی یہ تھی کہ انہیں

زمانہ قیام بھوپال میں چند ایسے "رفیق کار" بھی مل گئے تھے جو ہر ہر قدم پر ان کے ایک اچھے شریک سفر رہے! "دیوان غالب" کے نسخہ حمیدیہ" کی اشاعت کے ساتھ مفتی انوارالحق مرحوم کا نام تو "حیات جاودانی" پا گیا لیکن شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کام میں ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے ساتھ ان کے ایک ساتھی اور بھی تھے جن کے بلند ادبی شعور میں ڈاکٹر بجنوری مرحوم سے کچھ کم پختگی نہیں تھی۔

ڈاکٹر وارثی مرحوم رہنے والے تو "امروہہ" ضلع مراد آباد کے تھے لیکن بسلسلہ ملازمت بھوپال میں رہ بس گئے تھے! انگریزی ادب و لٹریچر سے انھیں بھی اتنا ہی شغف تھا جتنا خود ڈاکٹر بجنوری مرحوم کو تھا! مرحوم مہدی الافادی کی طرح ان کی لائبریری انگریزی اور اردو کی نئی مطبوعات سے مزین رہتی۔ ڈاکٹر بجنوری نے جب "نسخہ حمیدیہ" کی ترتیب و تدوین کا کام شروع کیا تو ڈاکٹر وارثی مرحوم بھی ان کے شریک کار تھے ـــــ اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ یہ دونوں دوست آگے پیچھے راہی ملک عدم ہوئے!

ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے یہ خطوط غیر مطبوعہ نہیں ہیں لیکن انھیں چھپے ہوئے تقریباً نصف صدی ضرور گذر چکی ہے اور اس طویل مدت میں انھوں نے ایک ایسی اہمیت حاصل کر لی ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

یہ خطوط پہلی اور آخری بار اب سے چالیس سال ادھر "عباس حسین قادری دہلوی" کے ماہنامہ "تمدن" دہلی میں شائع ہوئے تھے۔ قاری صاحب اپنے دور کے مشہور صحافیوں میں تھے۔ مولانا محمد علی کے "ہمدرد" اور سید جالب کے ساتھ "ہمدم" کے ادارۂ تحریر میں بھی شامل رہ چکے تھے۔ "تمدن" کئی برس تک لکھنؤ سے نکلتا رہا۔ پھر قاری صاحب کے ساتھ دہلی چلا گیا اور غالباً ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۱ء تک شائع ہوتا رہا!

ڈاکٹر بجنوری کے چند خطوط جون ۱۹۱۹ء کے ماہنامہ "تمدن" (جلد ۲ شمارہ ۱۰) میں شائع کئے گئے تھے اور ان خطوط پر قاری صاحب مرحوم کا ایک ادارتی نوٹ بھی ہے۔

"آج ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری ہم میں نہیں ہیں مگر اس قابل فرد قوم کی یاد آج نہیں برسوں تک ہمارے دل میں موجود رہے گی۔ یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن جیسی قابلیت کے آدمی کم پیدا ہوتے ہیں اس لئے ایسے حضرات کے افکار جمیلہ کو جس قدر بھی عزت کے ساتھ محفوظ رکھا جائے وہ اس سے زیادہ کے مستحق ہیں۔ زندہ قومیں اسلاف کی یادگار کو جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ اگر ہمیں اپنی قوم کو عروج کے راستے پر لگانا ہے تو ہمارا یہی فرض ہے کہ ہم اپنے قابل لوگوں کے ایک ایک حرف کو قدر و منزلت کے ساتھ محفوظ رکھیں۔

ذیل میں ہم ڈاکٹر مرحوم کے خطوط کا اقتباس اپنے کرم فرما سے حاصل کرکے درج کرتے ہیں جو مرحوم نے مختلف اوقات میں انہیں لکھے تھے۔ اگر یہ خطوط محض سادہ خطوط ہی ہوتے تو بھی کچھ کم قابل قدر نہیں تھے۔ مگر اس میں اہل ذوق کے لئے بہت کچھ سامان درد پنہاں ہے انشاءاللہ آئندہ کبھی خطوط کی دوسری قسط شائع کریں گے جو ان خطوط سے زیادہ دلچسپ ہیں آخر میں ہم اپنے "کرم فرما" کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انھوں نے چشمۂ فیض سے پبلک کو مستفید کر دینے کی اجازت دی جو محض ان کے لئے جاری ہوا تھا۔"

اس ادارتی نوٹ میں قاری صاحب نے نہ جانے کیوں ان خطوط کے مکتوب الیہ اور اپنے "کرم فرما" کا نام ظاہر کرنے سے گریز کیا ـــــ حالانکہ سب سے آخری خط (بلا تاریخ) جو ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے "برائیٹن" سے لکھا تھا اس میں تحریر ہے۔

"میں نے آپ کی اجازت لئے بغیر اس امر کی جرأت بھی کی ہے کہ دیباچہ میں آپ کا شکریہ بدیں الفاظ (ادا) کیا ہے کہ جن احباب نے ہمیشہ اس کام میں میری ہمت افزائی کی ہے اس میں آصف علی صاحب کا بھی حصہ ہے......"

ان سطور سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ان خطوط کے مکتوب الیہ بلا شبہ دہلی کی مشہور شخصیت "آصف علی بیرسٹر مرحوم" ہی تھے اور یہ تمام خطوط انہیں کے نام لکھے گئے ہیں جو اس زمانے میں یورپ ہی میں قیام فرما تھے اور ڈاکٹر بجنوری مرحوم سے ان کے اچھے خاصے تعلقات تھے

ڈاکٹر بجنوری کے پیش نظر خطوط کی ادبی اور شخصیاتی افادیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن ان خطوط کے "اسلوب بیان" میں ویسی زندگی نہیں پائی جاتی جو غالب کے ایک عمیق مطالعہ کار کے بیاں ہونا چاہیئے۔ ان خطوط میں نہ محض برجستگی روانی اور سلاست زبان کا فقدان ہے بلکہ ان خطوط میں ڈاکٹر بجنوری کے انداز بیان کی وہ "حسن کاری" بھی نہیں ہے جو ان کے یہاں اکثر نظر آتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان خطوط کی تاریخی اہمیت اور افادیت سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ خطوط بہر قیمت اردو ادب کی تاریخ کے وہ زریں اوراق ہیں جنھیں محفوظ رہنا ہی چاہیئے۔

(۱)

۲۰ مارچ ۱۲ء

رفیق شفیق وحبیب صدیق!

تسلیم۔ صد تسلیم۔ گذارش ہے۔

شب سیاہ کی زلف کمر رسیدہ ہو چکی ہے مگر قریب کے ایک مکان سے آواز نغمہ آرہی ہے اور آج غیر معمولی طور پر خواب کا بھی طبیعت پر غلبہ نہیں! اس لئے چند سطریں اور لکھتا ہوں۔

آپ کی تصویر پہنچی — قدیم مصر بھی افق تواریخ پر ایک عجیب وغریب نقش ہے جس کو وقت بھی محو نہیں کر سکا۔ آپ کے اس نقرہ سے کہ

احرام تا ہنوز ایک راز و معمہ ہیں

میرے دل میں سحریات۔ نجوم۔ کیمیا وغیرہ کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ انسان میں فوق الفطرت طاقت تھی جو بوجہ تحمل نہ ہو سکنے کے اس سے واپس لے لی گئی۔

صحرائے اعظم میں ضرور کوئی شہر دبا ہے بلکہ شاید آباد ہے۔ بہشت شداد وہیں ہے آواز نغمہ خاموش ہو گئی۔ تحریر بالا اس سرود کے اثر میں لکھی گئی اس لئے لائق معافی ہے۔ آپ نے بارہا مطالعہ فرمایا ہوگا کہ ابوالہول "ایک معمہ ہر کس وناکس کے سامنے پیش کیا کرتا تھا۔ اس معمہ کا جواب" انسان" تھا۔ آپ کی تصویر گویا اس معمہ کا مرقع ہے۔

ابوالہول بھی موجود ہے جو سراپا استفہام ہے اور آپ بھی! مصر، یونان، روما یہ سب میخانے ہیں جہاں ساقی زمانہ آتش بہ جام کر چکا ہے ــــ جدید یورپ بھی ایک میخانہ ہے جس کے ساغر الوان شراب سے پر ہیں۔ اس کے جام بہت سی قوموں کے خون سے لبریز ہیں۔ ساقی زمانہ وہی ہے! اور اہل بزم کے رقص و خندہ پر خود خندہ کناں ہے۔ یہ لوگ آخری دور سے کام آشنا ہو رہے ہیں۔ اب دیکھئے کہ دوسرا میخانہ کہاں قائم ہوتا ہے؟

آپ اپنے مشاغل اور حالات سے بھی اطلاع دیجئے۔

میں بخیریت ہوں

گو وقت اور فاصلہ درمیان میں حائل ہو گیا ہے۔ دوری ابدان انشاء اللہ تعلقات دل و جان کو کم نہ ہونے دے گی۔ ہمیشہ آپ کی اور آپ کے متعلقین کی صحت اور عافیت کے لئے دعا گو ہوں اور امید کرتا ہوں کہ بحصول عریضہ آپ بہمہ وجوہ مع الخیر ہوں گے۔ جویان عافیت۔

بندہ۔ عبدالرحمٰن

(۲)

۱۱ر اگست ۱۳ء

میونش (میونک)

محب و مولائے من ــ

باوجود میری تقصیر کوتاہ نویسی کے آپ از راہِ دوستی برابر یاد فرماتے رہے۔ آپ کی وہ عنایت اور میری یہ نالائقی! معافی تک مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اس زمانے میں پریشان بھی رہا اور بیمار بھی۔ بہر حال اب تندرست ہوں۔

آپ کے ارسال کردہ مضمون "اعدا" کو حسب ارشاد واپس کرتا ہوں۔ ماشاء اللہ خوب ہی ہے خصوصاً آغاز اور انجام بہت پر زور ہے! "فطرت اشک" اور "نقیب مسرت" اپنے اپنے انداز میں وقار اور سادگی میں کسی سے کم نہیں ہیں چونکہ کم لیاقتی کے باعث انگریزی کلام کی ماہیت کے پلنے سے باوجود کوشش

بے بہرہ رہ جاتا ہوں۔ اُردو کلام کا اور زیادہ تشنہ ہوں اگر کوئی چیز ارقام فرمائی ہو تو روانہ فرمایئے نثر ہو یا نظم ! "فرہاد" کو پورا کیوں نہیں فرما لیتے ۔ افسوس کہ جن کو تخیل نصیب ہے ان کو صبر نہیں! اور جنھیں ضبط ہے وہ مرغ خیال کے شہپر کی آواز تک نہیں سُن پاتے ! اس کی پرواز دیکھنا تو کیا؟

آج دو ہفتہ سے اس شہر میں ہوں سہروردی صاحب بھی ہمراہ ہیں یہاں چند یوم اور قیام ہے پھر لندن کا قصد ہے۔ آپ تو اس مقام کو دیکھ ہی چکے ہوں گے۔ یہاں کے نگار خانے حقیقت میں تعریف سے بالا ہیں : لوئی ثانی "(LUDWIG II) کی دیوانگی نے اس شہر کو ایک فردوس نظر بنا دیا۔ دیوانہ ہونا بھی ایک داد الہی ہے ۔

آپ اغلب اس وقت "اسوتیج" (سوئیزرلینڈ) میں ہوں گے۔ کب تک ان اطراف میں رہنے کا قصد ہے ۔ کیسا افسوس ہے کہ جب آپ نے "فرائی برگ" تشریف لانے کا قصد فرمایا تو بخت نارسا نے مجھے وہاں سے یہاں پہنچایا۔

والا نامہ جات تحریر فرماتے رہیئے ۔ آپ کی خطاپوشی اور عذر پذیری سے اسی کا متوقع ہوں از حد شوق ملاقات ہے ۔ احوال تازہ سے مطلع کیجئے ــــــ امید ہے کہ مزاج گرامی بہمہ وجوہ بسلامتی ہوگا ۔ سہروردی صاحب سلام کہتے ہیں۔

عبدالرحمٰن

(۳)

آکسفورڈ

یکم جنوری ۱۴ء

تسلیم ۔ سال تو طلوع ہوئے دیر نہیں ۔ آپ کی خدمت میں عریضہ کے ذریعہ حاضر ہو کر اس کو آغاز کرتا ہوں اور شگون نیک لیتا ہوں ۔

امید ہے کہ آپ کے لئے نیا برس گذشتہ امیدوں کی کامرانی ہمراہ لایا ہوگا اور اپنے تحائف پیش کرنے میں بجائے تاخیر کے عجلت کو کام میں لائے گا۔

علاوہ بریں نئی اُمنگیں اور نئے ارادے نہ صرف قلب میں پیدا ہی ہوں گے بلکہ عالم خیال سے روئے کار پر ظاہر ہوں گے۔ میں شروع ہی میں آشیرباد عرض کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ اختتام سال پر آپ میری بابت کہہ سکیں۔

اک برہمن نے کہا تھا کہ یہ سال اچھا ہے

زیادہ۔ والسلام

عبدالرحمٰن

(۴)

"فرائی رش"

۸ر فروری ۱۴ء

جیبیم۔ تسلیم۔ یہاں پہنچ گیا۔ دل نہیں لگتا۔ "شاہد" اور آپ دونوں سے ایک ساتھ جدائی سخت گراں ہے۔ خدا جانے کیوں اس زمانے کے ہاتھوں اس سرزمین میں رو گرداں ہوں ورنہ!   وقت آنست کہ پرسی خبرم از بغداد

یہاں کوئی امر قابلِ گوش گذار نہیں! سردی لندن سے بیشتر ہے۔ برف ہر طرف چھا رہا ہے۔ قدرت کی اس کیفیت کو دیکھ کر دل اور بھی تنگ ہوا جاتا ہے۔

اپنی کیفیات سے بالتفصیل اطلاع دیتے رہیے: "چترا" کے ترجمہ کو بہ کوشش ضرور ختم کر دیجیے ذراسی دلبری اور آزادگی سے لاجواب چیز ہو جائے گی۔ بہ تاکید التماس ہے کہ کوتاہی نہ کیجیے گا جب "قفنس" مکمل ہو جائے تو ضرور روانہ کیجیے گا اور جو کچھ طبع آزمائی ہو اس سے مطلع اور مسرور کرتے رہیے گا۔

لندن کے کیا تازہ حالات ہیں۔؟ "سید صاحب" کی خیریت لکھیے اور سلام ملکہ کورنش میری طرف سے عرض فرما دیجیے۔ "مسز نائیڈو صاحبہ" کی کیفیت صحت سے بھی باخبر رکھیے گا۔ آپ کے اس دن یہ کہنے سے کہ مرض کے عود کر آنے کا احتمال ہے، تعلق خاطر ہے۔

اس مرتبہ دو بار پیرس کے راستے سے "فرائی برش" آیا۔ پیرس کا دیکھنا میری قسمت ہی میں نہیں ہے۔
بغیر قیام کئے ہوئے ویسا ہی ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن کو روانہ ہو گیا۔

"شاہد" کا خط آکسفورڈ سے ملا بخیر یت ہیں۔ اپنی جملہ کیفیات سے با خبر رکھئے۔ حیدرآباد سے کوئی مفصل خبر دریافت ہوئی؟

میری تو اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ جب اپنے اشعار کو دیکھتا ہوں تو تعجب معلوم ہوتا ہے کہ شعر بھی کہہ سکتا تھا! روحِ شاعری کسی صدمۂ قلبی کے باعث جان بحق تسلیم ہو چکی ہے۔ خدا ہی ہے جو اب شعر کہہ سکوں!

میں ہمیشہ سکون کا طالب تھا روز بروز سکون حاصل ہوتا جاتا ہے! اگر اسی کو "سکون" کہتے ہیں تو ایک روز سکون دائمی حاصل ہو جائے گا۔ اس سے تو پہلا درد دائم ہی مغتنم تھا کہ اب۔

نہ نالۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے

اور کوئی امر لائقِ گوش گذار نہیں جو عرض کروں۔

ہمیشہ جویانِ عافیت ہوں —

زیادہ سلام شوق
عبد الرحمٰن

(۵)

مراد آباد
مورخہ ۱۴ر فروری ۱۵ء
آداب عرض کرتا ہوں!

آپ کے دو قطعہ محبت نامجات واصل ہوئے۔ اور دونوں میں کلام سحر بیان بھی میرے سر آنکھوں پر نازل ہوا۔

سینۂ ارض پہ رہنے کا فنا نام سہی — غالب مردہ تو زندہ ہے دل عالم میں
تربت کہنہ کے مٹ جانے میں بھی معنی ہیں — خاک مرحوم مل جا کے گلِ عالم میں

سبحان اللہ ـــــ مرحبا!

اس سے بڑھ کر لوحِ غالب کی کیا؟ کسی کی کسی نے کم لکھی ہوگی۔ مضمون کی بلند پائیگی اس پر آپ کی زبان! قیامت پیدا کر دی ہے بحر بھی موزوں تو ملنا ناممکن ہے۔

خاکِ مرحوم ملی جا کے گلِ عالم میں

آپ ہی کا حصہ ہے۔

دوسرے صحیفہ ہمایوں میں ـــــ ؎

فردوس میں گناہ کی جب قدر ہی نہیں   کیا جایئے وہاں کہ جہاں آبرو نہ ہو

یہ مضمون آپ نے طرفہ پیدا کیا۔ آپ کے سوا کسی کے بس کا نہ تھا۔ مقطع ماشاء اللہ استادانہ رنگ میں ہے۔

آپ کے عالی نامے تو ایک ضیافت روحانی ہوتے ہیں۔ مگر میری کوتاہ قلمی بلکہ کوتاہ نصیبی کہ جواب عرض کرنے میں ہمیشہ تاخیر ہی کرتا ہوں اور مزید تکرار کتابت کے حظ سے محروم رہتا ہوں۔

تقصیر کرنا میری عادت ہو گیا ہے آپ عفو کو اپنا شیوہ بنایئے۔ جب یہ تضاد موافقت پائے تو سلسلہ استوار ہو۔

میرے مضمون کی بابت آپ نے اتنی تعریف کی کہ گونہ ندامت سی ہوئی۔

کاتب نے واقعی بہت ظلم کیا ـــــ مگر کاتب اور کیا کریں؟ اگر یہ نہ کریں!

آپ کی قدردانی کا بہت ممنون ہوں۔

کچھ آپ نے اس طرح سے دی دادِ سخن   شک مجھ کو بھی اپنی بے کمالی میں ہوا

مگر ایک لمحے کے لئے ـــــ

جلد مرادآباد آیئے ـــــ اور پہلے سے اطلاع دیجئے۔

ہمائے اوجِ سعادت بدام ما افتد   اگر ترا گذرے بر مقام ما افتد

آداب ـــــ   عبدالرحمٰن

(۶)

محبی من۔ آداب۔ کل پہلی مرتبہ کی طرح پھر آستانہ پر حاضر ہوا تھا مگر معلوم ہوا کہ
آپ نقل مکانی کر رہے ہیں۔ ملاقات نہ ہوئی محروم واپس ہوا۔
اپنی کتاب کا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ہمراہ لایا تھا وہ مکان کی
صاحبزادی کو آپ کو دینے کے لئے دے آیا۔ گر قبول افتد.....
جرمنی کتاب آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی جرأت صرف اس وجہ سے کی کہ میرا یقین
ہے کہ جو کچھ بھی مجھ سے عمل میں آئے اس سے آپ کو بوجہ مجھ ناکارہ سے انس رکھنے کے انس ہے۔
میں نے آپ کی اجازت لئے بغیر اس امر کی جرأت بھی کی ہے کہ دیباچہ میں آپ کا شکریہ بدیں
الفاظ (ادا) کیا ہے کہ جن احباب نے ہمیشہ اس کام میں میری ہمت افزائی کی ہے۔ اس میں
آصف علی صاحبؒ کا بھی حصہ ہے ــــ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے "شاہد" کا اور آپ کا
نام اپنے سے کسی نہ کسی بہانہ منسوب کرنے سے ایک قلبی اور دلی خوشی ہوتی ہے۔
کتاب پر ہدیہ کے چند الفاظ پنسل سے یوں لکھے کہ قلم اور روشنائی اس وقت آپ کے
مکان پر نہ مل سکی۔
میں بخیریت ہوں اور جلد آپ سے آکر پھر ملوں گا۔
ابوالحسن صاحب کی کامیابی سے ازحد خوش ہوا ہوں۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔
آپ سے ملاقات کو ازحد جی چاہتا ہے۔ باقی عندالملاقات عرض کروں گا۔
زیادہ والسلام
عبدالرحمٰن
کتاب ہنوز شائع نہیں ہوئی ہے۔ دو تین روز میں شائع ہو جائے گی۔ عبدالرحمٰن

ساون کی رات

جناب سلام مچھلی شہری

اللہ اللہ اس قدر توبہ شکن ساون کی رات
بن گیا ہے میکدہ چرخِ کہن ساون کی رات
تیرے گھر برسے گی صہبائے "چمن" ساون کی رات
کہہ رہا ہے مجھ سے یہ اک برہمن ساون کی رات
کاش ہوتے ہم بھی اک مے خوارِ صہبائے حیات
سوچتا ہوگا یقیناً اہرمن ساون کی رات
ایک شعلہ، ایک بجلی، ایک طوفان کے لئے
منتظر ہے جیسے اک نازک بدن ساون کی رات

چھا گئی جمنا کے تٹ پر کرشن کی بنسی کی لے
گوپیوں سے بھر گئے ہیں "برج بن" ساون کی رات

سج رہی ہیں اپسرائیں بادلوں کی اوٹ میں
"اِندر نگری" بن گیا سارا گگن ساون کی رات
مَوج میں ہیں تیر برسانے کی، جیسے کام دیو
چل رہی ہے پریم میں ڈُوبی پَوَن ساون کی رات
میں نے بس اِتنا کہا تھا، کتنی سُندر ہے یہ رُت
بھر گئے ہیں مَد سے خود اُن کے نَین ساون کی رات

میں نہ کہتا تھا کہ اک شہزادۂ تخئیل ہوں
کِھل گیا ہے میرے گھر آخر چمن ساون کی رات
حکم دو، میں زندۂ جاوید کر دوں حُسن کو
بن گیا ہُوں ایک معبودِ سخن، ساون کی رات

——— ہائے وہ "نلیا"، وہ "پلٹا باغ" پچھلی شہر کے
یاد آتا ہے سلام! اپنا وطن ساون کی رات

(دہلی، ۲۵/۷/۶۲ء)

غلامی سے آزاد کر لیا اور ہمارے عزم و استقلال، ہمارے اٹل ارادے اور دکھ اٹھانے اور قربانیاں کرنے کی بے مثال صلاحیت کا لوہا ساری دنیا نے مانا اور اسے سراہا۔

کچھ دولتیں اور نعمتیں ورثے میں مل جاتی ہیں، کچھ اپنے قوتِ بازو کے بل پر حاصل ہوتی ہیں جو چیز مصیبتیں جھیل کر، قربانیاں دے کر، اپنی کوششوں کے بل پر حاصل ہو اس کی قدر، عزت، اس کی حفاظت کی لگن انسان کے دل میں اس چیز سے بہت زیادہ ہوتی ہے جو بیٹھے بٹھائے ورثے میں مل جائے۔ اس لئے ہمیں بھی اپنی آزادی اتنی پیاری ہے۔ ہماری آزادی کی کہانی کوئی قصۂ پارینہ نہیں۔ ابھی کل ہی کی بات تو ہے جو ہم نے جانوں پر کھیل کر اس گوہر گراں مایہ کو واپس لیا ہے۔ ہم جنگ آزادی کے سپاہی رہے ہیں اور اپنے دیس کی انقلابی تاریخ بنتے دیکھی اور اس کے کردار ہونے کا شرف حاصل کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آزادی وہ بنیادی انسانی حق ہے جو ہر ایک کو ملنا چاہیئے۔ اس لئے ہمیں اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ ساری دنیا کی آزادی پیاری ہے۔ ہم سب محکوم ملکوں کے مددگار، حامی اور دوست رہے ہیں۔ ہم اپنے پڑوسیوں سے دوستی اور محبت کے رشتے استوار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم امنِ عالم کے پرستار ہیں اور ساری دنیا کے ایک برادری ہونے پر عقیدہ رکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے سبھی دور دیس کے ملکوں سے بھی بھائی چارہ اور دوستی قائم کی۔ یہاں تک کہ وہ ملک جن کی سامراجیت کا صدیوں شکار رہے تھے اس سے بھی ہم نے دشمنی نہیں باندھی بلکہ برابری اور مساوات کی سطح پر اس سے دوستی قائم کی۔ ہمارا تو یہ ایمان ہے کہ دنیا کے سب ہی لوگ بھائی بھائی ہیں۔ سب کو جینے اور سکون و آزادی سے زندگی بسر کرنے کا یکساں حق ہے اور سب کو آزادی اور امن کے سائے میں، پھولنے پھلنے اور ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملنا چاہیئے۔

خود ہمیں اپنے دیس میں بہت کچھ کرنا تھا اور ہے۔ ہمیں اپنے دیس کی غلامی کی پیدا شدہ لعنتوں سے پاک کرنے کی جد و جہد کرنی تھی۔ ہم پس ماندہ تھے۔ غریب، جاہل ہم میں نا اتفاقی، بے عملی اور بے حسی پیدا ہو گئی تھی۔ ہمیں ان سب بلاؤں سے اپنے دیس

کو چھٹکارا دلاکر اسے ایک خوش حال، ترقی یافتہ، ملک بنانا تھا۔ ہمیں اپنے دیس کے باسیوں
میں پھر سے خوش حالی، ایکتا، یک جہتی پیدا کرنی تھی، علم کی روشنی گھر گھر پھیلانی اور عمل کی لگن
ہر ہر من میں لگانی تھی۔ اور ہم دل وجان سے اس مقدس کام میں لگ گئے۔ ہمارا عقیدہ تھا
اور ہے کہ ہم غیر جانب دار رہ کر، بغیر گٹھ بندیوں میں شامل ہوئے، سب کے دوست اور خیر خواہ
رہ سکتے ہیں اور اپنے دیس میں ایک غیر مذہبی اور سچی جمہوریت قائم کر سکتے ہیں جو ہر ہر فرد کے
لئے بھی اور پورے دیس کے لئے بھی فائدہ مند ہو۔ ہم امنِ عالم کے پرستار، جنگ کے دشمن
انسانیت کے خادم بن کر خود اپنے ملک کو ترقی یافتہ، مہذب ممالک کی صف میں ایک
ممتاز درجہ دلانا چاہتے ہیں۔ اس بڑے اور کٹھن کام میں اگرچہ رکاوٹیں بھی پڑیں، روڑے
بھی اٹکائے گئے، مخالفتوں کی آندھیوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا، دوسرے دیسوں کے رشک
اور بدگمانی کا شکار بھی ہوئے، خود اپنے دیس کی پھوٹ اور جھگڑے فسادوں نے ہمارے
لئے سخت مشکلیں پیدا کیں — مگر ہمارے سامنے ایک عظیم مقصد تھا۔ ہم اپنے کام میں لگے
رہے۔ اور سمجھتے رہے کہ ایک دن آئے گا جب ہمارے یہ سب بڑے بڑے منصوبے پورے
ہوں گے۔ ہم اندرونی مشکلوں پر فتح حاصل کرلیں گے۔ اور بیرونی مخالفتوں کو دور کر دیں
گے۔ اس لئے کہ اپنی ناتجربہ کاری کی بنا پر ہم یہ سمجھتے رہے کہ جب ہم خود سب کے دوست ہیں
تو دوسرے دیس کیوں ہمارے دشمن ہوں گے؟

لیکن دنیا میں نیکی بدی، حق و باطل، دوستی و دشمنی، خیر سگالی اور حسد کا مقابلہ ہمیشہ
سے ہوتا آیا ہے۔ اکثر افراد یا قومیں دوسروں کی محض اس لئے دشمن بن جاتی ہیں کہ فریق
ثانی اچھا کیوں ہے؟ یہی اشرف المخلوق جب ہوس، لالچ، غرور، حسد اور خود غرضی کے امراض
میں مبتلا ہو جائے تو افراد کی حیثیت سے چند گھرانوں کی زندگی عذاب بنا دیتا ہے اور قوم کی
حیثیت سے اس کی شیطانی کارفرمائیاں پورے پورے ملکوں کی عافیت اور سکون کو خطرے میں
ڈال دیتا ہے۔ بلکہ اب تو پوری دنیا کا امن و سلامتی کے لئے خطرہ بن جاتا ہے اور آج اس ازلی حقیقت

کی تصدیق چین کے اس جارحانہ حملے نے کر دی جو اس نے اچانک ہندوستان پر کر دیا۔ چین! ہمارا پڑوسی! اپنچ شیل کا حامی!! ہمارا بھائی بننے والا — آج اس شعر کی صداقت کا یقین دلا رہا ہے ؎

آدمی ہے چاہ یوسف سے صدا دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

اس نے سارے معاہدوں کو پس پشت ڈال دیا۔ بھائی چارے کے رشتوں کو توڑ ڈالا شرافت انسان شناسی اور دوستی کے پرخچے اڑا دیئے اور ہندوستان جیسے امنِ عالم کے حامی اہنسا کے پجاری، سب کے دوست ملک پر کمینہ پن سے اچانک دھاوا کر کے اسے جنگ کی بھٹی میں جھونک لیا۔

ہاں — آج شاید پھر تاریخ ہمارا امتحان لینا چاہتی ہے۔ شاید وہ دیکھنا چاہتی ہے کہ جس قوم نے اپنے دیس کو دنیا کی سب سے طاقت ور حکومت کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے وہ وہ کٹھنائیاں سہیں وہ وہ قربانیاں دیں جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے، اب آزادی پا کر وہ بے فکر، بے عمل، کم حوصلہ اور بے جان تو نہیں ہو گئی؟ آج وہ ہمارا امتحان لے رہی ہے دنیا کی ایک بہت بڑی فوجی طاقت رکھنے والی حکومت سے بھڑا کر۔ کہ دیکھے کہ ہندوستان کس طرح اس کٹھنائی کو جھیلتا ہے!! کیا اس میں تیاگ، بلیدان، ویرتا، اور آزادی کی پرستش کا جذبہ اب بھی اتنا ہی شدید ہے جیسا ماضی میں تھا؟

ہاں تاریخ نے ہندوستان کو یہ چیونی دی ہے جسے اس نے ایک لمحے کی جھجک کے بغیر قبول کر لیا ہے۔ وہ اپنی آزادی کے دشمن سے مقابلہ کرے گا۔ اپنی ساری قوت، ساری طاقت سارے وسائل کو کام میں لا کر۔ وہ دشمن جو اس کی ترقی سے جلتا، اس کی جمہوریت سے خار کھاتا اور اس کی عزت و وقار سے حسد کرتا ہے جو اس تھوڑی سی مدت میں اس نے حاصل کر لی ہے۔ اس کا اور کچھ بس نہ چلا تو یہ چال چلی کہ ہندوستان کو جنگ کی آگ میں کھینچ لو تاکہ ایک طرف اس کی ترقی کے منصوبے (خاک اس کے منہ میں) خاک میں مل جائیں اور دوسری طرف دنیا میں وہ بدنام ہو جائے۔ چین نے شاید یہ بھی سمجھا ہو کہ ہندوستان جو امن و شانتی کا پرچار کرتا ہے

وہ بزدل ہے لیکن اس نے اور دنیا نے دیکھ لیا کہ ہندوستان بزدل نہیں دنیا کا سب سے بہادر ملک ہے جس کا ارادہ اٹل، حوصلہ بلند، عزم پہاڑوں سے زیادہ مضبوط اور استقلال چٹانوں سے زیادہ استوار ہے۔ چین کا عمل خود اس پر الٹ گیا۔ ایک آدھ چھٹ بھیّے ملک کے سوا ساری دنیا نے چین کے حملے کی مذمت اور ہندوستان کی حمایت کی۔ خود اس کے ساتھی کمیونسٹ ملکوں تک نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور بہت سے دیسوں نے بلا کسی شرط کے ہندوستان کو ہر طرح کی مدد دینے کی پیش کش کی اور ہر تعاون کا یقین دلایا ہے۔

اور شاید چین اس غلط فہمی میں بھی مبتلا تھا کہ ہندوستان کے اندر ہی پھوٹ پڑ جائے گی۔ ہندوستان میں بہت سی نسلیں، بہت سے مذہب، بہت سی زبانیں، بہت سی سیاسی پارٹیاں ہیں جن میں آپس میں اختلافات ہیں۔ ان میں پھوٹ ہے۔ ذرا ذرا سی باتوں میں آپے سے باہر ہو کر سر پھٹول پر اتر آتے ہیں۔ اور جب اس جیسی طاقت سے مقابلہ کا وقت آئے گا تو ان کی یہ آپس کی پھوٹ اور مخالفت اندرونی طور پر ہندوستان کو اتنا کمزور کر دے گی کہ وہ چین کے مقابلے کی ہمت ہی نہ کر سکے گا۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا ہوگا کہ مصیبت کے وقت سارا ہندوستان اس طرح متحد ہو گیا ہے جیسے وہ ایک جسم ہو اور اس کے سارے باسی اس جسم کے مختلف حصے۔ خدا کا شکر و احسان ہے کہ ہندوستانیوں نے اس وقت اپنے دیس کی لاج ساری دنیا کے سامنے رکھ لی۔ اس نازک وقت میں وہ اپنے سارے اختلافات بھول گئے۔ سارے مطالبے، ساری مخالفتیں پس پشت ڈال دیں۔ ان کے دل میں سوئی ہوئی یک جہتی، اتحاد اور محبت کی جوت جاگ اٹھی اور آج وہ ایک جان ایک دل ہو کر دیس کی حفاظت کے لئے کمر بستہ ہو چکے ہیں۔

ہو سکتا ہے چین کے پاس دنیا کی سب سے بڑی فوج ہو، ہو سکتا ہے اس کے پاس بہت مہلک ہتھیار ہوں، چین کو وقتی اور عارضی فتح بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان

کے پاس حق کی طاقت ہے۔ اور حق و باطل کی لڑائی صرف آج ہندوستان اور چین کی سرحد پر ہی نہیں لڑی جا رہی ہے۔ ازل سے لڑی جاتی رہی ہے۔ یہ چنگیز و ہلاکو کے ورثہ دار شاید یہ نہیں جانتے فتح آخر میں ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ ہزار ہا سال کی تاریخ کے ورق الٹ جایئے یہ حقیقت کبھی بدلتی نظر نہ آئے گی۔ تاریخ ہمیشہ اپنے کو دہراتی ہے، آج بھی دہرائے گی۔ چین کو اپنی طاقت کا بہت غرۃ ہے مگر ہندوستان کے پاس جتنی فوج اور جو ہتھیار ہیں ان کا مقابلہ وہ کر سکے گا؟ ہندوستان کو ناز ہے، بھروسہ ہے اپنی چالیس کروڑ کی سینا پر جس کا ہر ہر فرد، مرد، عورت، بوڑھا، بچہ، جوان، اپنی مقدس سرزمین کی ایک ایک انچ زمین کے لئے اپنے خون کا آخری خطرہ تک بہا دے گا۔ چین کو اپنے آٹومیٹک ہتھیاروں کا غرور ہے ـــــ مگر ہندوستان کو بھروسہ اور غرور ان ہتھیاروں پر نہیں ہوگا جو وہ دوسرے دیسوں سے حاصل کر سکتا ہے اور کرے گا اور جو چین کے دنیاوی ہتھیاروں کا توڑ کر سکتے ہیں۔ ہند کی فوج کے یہ سپاہی تو اس زیورِ جنگ سے آراستہ ہو کر میدانِ جنگ میں آئیں گے جن کو دنیا کی کوئی طاقت توڑ نہیں سکتی! یہ چالیس کروڑ فوج آراستہ ہوگی حب الوطنی کی زرہ، سچائی اور انصاف کے جوشنوں عزم و ثبات کی تلواروں، آزادی کی سپر اور حق کے خود سے۔ چین کی مجبور فوج جو بھوک غلامی، جبر و تشدد کا پہلے ہی سے شکار رہی ہے، وہ بچاری تو ان اٹوٹ ہتھیاروں کا کیا مقابلہ کرے گی؟ یہ تو وہ طاقتیں ہیں جن کے سامنے عظیم الشان پہاڑوں کی قوت سرنگوں ہو جاتی ہے، سمندروں کے سینے دہل جاتے ہیں، طوفانوں کے دل کانپ جاتے ہیں۔ آج جس عزم و استقلال، جس عزم و حوصلہ، جس یک جہتی اور اتحاد کا مظاہرہ ہندوستان نے کیا ہے، اس کی مثال خود ہماری تاریخ میں بھی نہیں ملتی۔ آج کروڑوں سینوں میں ایک ہی دل دھڑک رہا ہے، کروڑوں دماغوں میں ایک ہی خیال پل رہا ہے، کروڑوں گلوں سے ایک آواز نکل رہی ہے۔ ہندوستان ہمارا ہے۔ ہمارا رہے گا اور اس کی چپہ چپہ

زمین کی حفاظت کے لئے ہم خون کا ہر ہر قطرہ نچھاور کر سکتے ہیں۔

یہ بھیم وارجن کا، نانک و کبیر اکبر و پرتاب، حیدر علی و ٹیپو، حضرت محل اور رانی جھانسی آزاد و انصاری، گاندھی اور جواہر لال کا دیس ہے ـــــ یہ کبھی ظلم کے سامنے سر نہ جھکائے گا۔ کبھی ناانصافی کے سامنے گھٹنے نہ ٹیکے گا۔ کبھی باطل سے سمجھوتہ نہ کرے گا۔

بے شک ہندوستان امنِ عالم کا پجاری، انسانیت کا دوست، حق کا پالن ہار اور اہنسا کا پیامبر ہے اور انھیں قدروں کی حفاظت کے لئے وہ دشمن سے مقابلہ کرے گا۔ یہاں تک کہ حق ثابت ہو جائے اور باطل مٹ جائے۔ اس لئے کہ ہمیشہ سے سچائی کی فتح اور ظلم و ناانصافی کی ہار ہوتی آئی ہے اور آج بھی ہوگی۔ آج ہندی اپنے عمل سے دنیا پر یہ ثابت کرے گا کہ ؎

ہو محفلِ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے ہندی

عظمت رفتہ ——— ایک تاثر

جناب ابو علی اعظمی

ملک میں مہاتما گاندھی کے علاوہ جہاں اور بہت سے اپنے عمل و اخلاص اور جوش خدمت کے اعتبار سے "گاندھی" پیدا ہو گئے تھے، ان میں ایک مسز سروجنی نائیڈو بھی تھیں، جن کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز جنوبی ہندوستان اور خصوصیت کے ساتھ بمبئی تھا جس طرح خان عبدالغفار خاں سرحد کے، خان عبدالصمد خاں بلوچستان کے۔ سی راجگوپال اچاریہ مدراس کے، بابو راجندر پرشاد بہار کے، سی آر داس بنگال کے، پنڈت موتی لال نہرو یوپی کے، جمنالال بجاج سی پی کے، ولبھ بھائی پٹیل گجرات کے گاندھی سمجھے جاتے تھے، اور ان کا ملک کے ہر حصہ میں اسی حیثیت سے پرجوش استقبال ہوتا تھا، اسی طرح بمبئی میں خاص طور سے اور پورے ملک میں عام طور سے گاندھی جی کی عقیدت مند مسز سروجنی نائیڈو سمجھی جاتی تھیں، وہ آزادی سے بہت پہلے کانگریس کے سالانہ جلسہ کی جو ۱۹۲۵ء میں کان پور میں منعقد ہوا تھا، صدارت بھی کر چکی تھیں، ان کے حلقۂ احباب میں جہاں اور مذاہب کے ممتاز ماننے والے تھے، وہاں ہر مکتب فکر اور ہر شعبۂ زندگی کے بکثرت ممتاز اور سربرآوردہ مسلمان بھی تھے، جن کے ساتھ وہ بڑے اخلاص اور محبت سے پیش آتی تھیں اور ان کی بڑی قدر کرتی تھیں، اور ان سے مل کر بہت خوش ہوتی تھیں، انہی میں ایک ضیاء الدین برنی بھی ہیں۔ جو فارسی زبان کے ایک نامور و صاحب تصانیف مورخ ضیاء الدین برنی کے ہم نام، شاہجہاں کی علم پرور و ادب نواز شاہزادی جہاں آرا کے سوانح نگار اور بہت سی کتابوں کے مصنف اور مترجم ہیں۔ انھوں نے ابھی حال میں "عظمت رفتہ" کے نام سے پروفیسر رشید احمد صدیقی کی "گنجہائے گرانمایہ" بابائے اردو مولوی عبدالحق کی "چند ہم عصر" اور مولانا سید سلیمان ندوی کی "یاد رفتگان" کے طرز پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق سینکڑوں اشخاص کے متعلق جو دنیا سے

گذرے گئے ہیں۔ اور جوان کی نظر میں باعظمت محترم اور کسی نہ کسی حیثیت کے مالک تھے، اپنے نقوش و تاثرات پیش کئے ہیں۔

ہم مصنف سے ان کی مقبول ترین کتاب جہاں آرا کی وجہ سے واقف تو ضرور تھے بلیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ تصنیف تالیف وسوانح نویسی کا اتنا اچھا ذوق رکھنے کے ساتھ وہ سرکاری ملازم بھی ہیں۔ اور اتنے وسیع الملاقات بھی، اس کا علم بالکل پہلی مرتبہ ان کی اس گرانقدر کتاب سے ہوا، ان کے دائرہ ملاقات میں مذہب کے اعتبار سے ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں اور پارسی بھی، اور پھر ذوق وفکر اور پیشہ و مشغلہ کے لحاظ سے مصنف بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، عالم بھی ہیں، وکیل بھی ہیں اور معلم بھی زبان کے لحاظ سے اردو داں بھی ہیں، فارسی داں بھی ہیں، اور انگریزی داں بھی، مرز و بوم کے اعتبار سے، انگریز بھی ہیں، عرب بھی ہیں اور ترکی و ایرانی بھی، اشخاص و اعاظم رجال کے اعتبار سے گاندھی جی بھی ہیں، قائد اعظم بھی ہیں، سر آغا خاں بھی ہیں، اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی، صنف نازک میں مسز اینی بسنت بھی ہیں۔ بیگم حسرت بھی ہیں، اور مسز سروجنی نائیڈو بھی، اور تینوں خواتین جیسا کہ معلوم ہے، اپنی زندگی میں ہر اعتبار سے بڑی عظمت، عزت اور شہرت کی مالک تھیں، اور ملک وملت کی راہ میں جن کی بیش بہا قربانیوں اور کارناموں سے اس ملک کا بچہ بچہ واقف ہے، ان میں سے ہر ایک سے مصنف کے کسی نہ کسی نوع کے تعلقات تھے اور وہ اُن کی شخصیت سے متاثر تھے، انھوں نے اپنی اس کتاب میں شاعرۂ ہند مسز سروجنی نائڈو پر بھی اپنے تاثرات لکھے ہیں۔ جو ۱۶ صفحوں میں آئے ہیں حافظ شیرازی کا وہ مشہور شعر بھی درج کر دیا ہے جو خطیبۂ ہند اپنی اردو تقریروں میں اکثر و بیشتر لوگوں میں جوش پیدا کرنے یا ان کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پڑھا کرتی تھیں، یعنی

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بسے ۔۔۔ شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

جب یہ فارسی شعر اپنے خاص ترنم میں جلسوں میں پڑھتی تھیں تو ایک سماں بندھ جاتا تھا، راقم الحروف نے بھی اعظم گڈھ کے ایک پولیٹکل جلسہ میں جو انہی کی صدارت میں، خالص کھدر کے پنڈال میں، مولانا سید سلیمان ندوی، اور مولانا مسعود علی ندوی کے زیر اہتمام منعقد ہوا تھا،

یہ شعر ان کی زبان شیوا بیان سے سنا ہے، اور ان کے پڑھنے کا سماں اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔

مسز سروجنی نائیڈو کو حافظ شیرازی کے علاوہ خیام و اقبال اور بہت سے ممتاز اردو شعراء کے اشعار بھی بکثرت یاد تھے، جنھیں وہ بقول مصنف کے اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر حاضرین میں خاص ولولہ پیدا کر دیتی تھیں، اقبال سے ان کے بڑے تعلقات تھے۔ ان کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے ان کی مزاج پرسی کے لئے لاہور بھی تشریف لے گئی تھیں، اقبال خود بھی، کبھی کبھی اپنا کلام انھیں بھیجتے رہتے تھے، اور ان کا کلام سُن کر وہ بہت محظوظ ہوتی تھیں۔

انہی کے ہم نام اردو زبان کے دوسرے مشہور اور نعت گو شاعر علامہ اقبال سہیل سے بھی مسز نائیڈو کو بڑا اخلاص تھا، اور وہ ان کے اردو فارسی کلام کو بہت پسند کرتی تھیں۔ ان کی علی گڑھ میں پہلی آمد کے موقع پر اقبال سہیل نے قاآنی کے طرز پر، ان کی شان میں ایک مختصر خیر مقدمی نظم پڑھی تھی، جس کو سُن کر اور تو اور خود بلبلِ ہند پر وجد و کیف کا عالم طاری ہو گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی شاعر کی ان سے ملاقات ہوتی، یہ نظم پڑھوا کر سنتیں اور اس سے لطف اندوز ہوتی تھیں، یوں تو یہ پوری نظم بہت مرصع، دلآویز اور موسیقیت سے لبریز ہے لیکن ان چند اشعار میں تو شاعر نے ممدوح کی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔

کنول بہ چشمِ روشنی چو جلوہ زد سروجنی ۔۔۔ فلک بہ سطحِ سوسنی بساطِ ماہتاب زد

تبسمش شکفتہ گلشنش ترنمے ۔۔۔ سزد اگر تلاطمے بہ جانِ شیخ و شاب زد

شکستِ رنگِ سامری چو زد نوائے شاعری

نمودہ سحرِ سامری اگر در خطاب زد

بقول مرزا احسان احمد صاحب ان نغموں سے صحیح طور پر وہی لطف اندوز ہو سکتا ہے جس کو مسز نائیڈو کی تقریر سننے کا کبھی اتفاق ہوا ہو، واقعہ یہ ہے کہ جب وہ تقریر کرتی تھیں، تو یہ معلوم ہوتا تھا، کہ کسی رباب رنگین کے پردے مشتعل ہو گئے ہیں، اور سامعہ نغمہ و سرود کی نشاط انگیز

موجود میں ثبت کیا ہے۔

کتاب کے مصنف ضیاء الدین صاحب برنی کی مسز نائیڈو سے پہلی ملاقات ۱۹۱۷ء میں مسز اینی بسنت کے قائم کردہ تھیو سوفیکل ہائی اسکول کانپور میں ہوئی تھی، جہاں وہ ٹیچر تھے، اسی ملاقات نے بعد میں دوستی، یگانگت اور اخلاص کی صورت اختیار کر لی تھی، وہ جب تک ہندوستان میں تھے، اور موصوفہ بقید حیات تھیں۔ وہ برابر ان سے ملتے رہے اور وہ ہمیشہ ان پر لطف و کرم اور عنایات کی بارش کرتی رہیں۔ وہ تقسیم سے پہلے سکریٹریٹ کے شعبۂ اطلاعات سے متعلق تھے، اس تعلق کے زمانہ میں ایک مرتبہ وہ بمبئی سے رمضان کے مہینہ میں اپنے وطن دہلی گئے، جہاں کسی ضرورت سے یہ مخدومۂ ملک بھی قیام فرما تھیں، ایک دن سہ پہر میں یہ گشت کے لئے شہر میں نکلے، تو پھرتے پھراتے موصوفہ کے یہاں پہنچ گئے، دیکھ کر باغ باغ ہو گئیں، اور فرمایا کہ اس وقت تم خوب آئے، چلو میرے ساتھ ایک ٹی پارٹی میں، انھوں نے ہر چند عذر کیا، لیکن مسموع نہیں ہوا، آخر میں عرض کیا، کہ میں روزہ سے ہوں، فرمایا کوئی ہرج نہیں ہر تم میرے ساتھ چلو تو، چنانچہ وہ موصوفہ کی قابلِ فخر معیت میں' ٹی پارٹی میں' جو انہی کے اعزاز و اکرام میں تھی' پہنچے، کوئی ڈیڑھ سو مہمان مدعو تھے، جو ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، اور قاعدہ سے ان کے پہنچتے ہی پارٹی شروع ہو جانی چاہیے تھی، لیکن روزہ کھولنے میں ابھی ۱۵ منٹ کی دیر تھی، موصوفہ بجائے اس کے کہ چائے کے پیالہ و ساغر کی طرف ہاتھ بڑھائیں، اور چائے نوش فرمائیں، فرمایا کہ میرے ساتھ بمبئی کے ایک مسلمان دوست بھی آئے ہیں، جو روزہ سے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تھوڑی دیر آپ اور انتظار کی زحمت کریں، تاکہ روزہ کھولنے کا وقت ہو جائے، اور ہمارے معزز دوست بھی اس میں شریک ہو جائیں، چنانچہ ٹی پارٹی ۱۵ منٹ کی تاخیر کے ساتھ بعد مغرب شروع ہوئی، اس پارٹی کی مہمان خصوصی تو در حقیقت مسز نائیڈو تھیں، اور سب کی نگاہوں کا مرکز وہی تھیں۔ لیکن ان کے تعارف کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خود مصنف کتاب حاضرین کی توجہات کا مرکز بن گئے اس دور میں اس رواداری کی توقع تو در کنار کیا اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے۔

مسز نائیڈو جیسا کہ معلوم ہے، حیدر آباد کے ایک معزز ہندو بنگالی گھرانہ میں پیدا ہوئیں،

وہ ہر اعتبار سے ہندو تھیں، ہندو روحانیات اور ہندو اخلاق و فلسفہ کی بڑی دلدادہ تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ بڑی فراخ دل، وسیع القلب، اور وسیع المشرب تھیں، ان کے دل میں دنیا کے سب مذاہب کے لئے گنجائش تھی، ان کی بڑی قدردان تھیں، کسی مذہب کی طرف سے تعصب یا نفرت کا شائبہ تک ان میں نہیں تھا، وہ اسلام کی خوبیوں کی بڑی معترف تھیں، خصوصاً اخوت، مساوات اور جمہوریت کے متعلق اس کی جو تعلیمات ہیں، اور اس کے ماننے والوں نے اس کے جو شاندار نمونے پیش کئے ہیں، اور جو تاریخوں میں محفوظ ہیں، ان کی وہ دل سے قدردان تھیں، اور اپنی تقریروں میں شاندار اور موثر الفاظ میں ان کا ذکر کرتی تھیں، ان کی رواداری کی ایک عجیب و غریب مثال ابھی آپ کی نظر سے اوپر گذری ہے، دوسری یہ ہے،

یوں تو شروع سے آخر تک ان کا پورا خاندان ہندو تھا، اور اس کے ہر فرد کو اپنے ہندو ہونے پر فخر تھا، خود مسز نائیڈو بھی ہندو روایات و معتقدات کی حامل تھیں ان کو ہر چیز پر ترجیح دیتی تھیں، لیکن ان کے بھائی، عیسائی مشنریوں کی تبلیغ، اور انجیل کے مطالعہ سے عیسائی ہو گئے تھے، اور خاندان سے الگ تھلگ زندگی بسر کرتے تھے، اور اس تبدیلی مذہب کی وجہ سے ان کو خاندان سے بڑا بُعد ہو گیا تھا، لیکن مسز نائیڈو نے زندگی کے آخر تک ان سے اپنا تعلق قائم رکھا، اور ان کو اپنا بھائی سمجھتی رہیں۔ اپنی کسی بات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا، کہ ان کا مذہب کچھ اور، اور ان کے بھائی کا کچھ اور ہے۔

"عظمت رفتہ" مصنف کے ہم عہد اشخاص سے متعلق اسی قسم کے دلچسپ اور سبق آموز واقعات حکایات سے لبریز ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اور واقعات بھی زیادہ تر ایسے، جن سے براہ راست مصنف کا تعلق رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ مصنف دوسروں کے واقعات و حالات نہیں خود اپنی آپ بیتی بیان کر رہا ہے۔ اس کتاب سے اردو کے سوانحی ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہوا ہے، مصنف کا انداز بیان اتنا سادہ، بے تکلف اور دلچسپ ہے، اور اس میں اتنا خلوص ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی، جی چاہتا ہے کہ اس کو بار بار پڑھا جائے، اور اس سے لطف اٹھایا جائے۔

انسانی حقوق کا شعور

اب سے پندرہ سال قبل دس دسمبر ۱۹۴۸ء کو انجمنِ اقوامِ متحدہ کی مجلس عام (جنرل اسمبلی) نے انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامے کو باضابطہ اور واضح طور پر منظور کیا۔ اسی دن سے تمام اراکین پر یہ ذمہ داری عائد ہوگئی ہے کہ اس تاریخی کارنامے کی ترویج، واشاعت ہر ممکن طریقے سے اپنے اپنے ممالک میں برابر کرتے رہیں۔ تعلیمی اداروں میں اس اعلان نامے کے نکات کی واقفیت پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ اس پیغامِ اخوت سے زیادہ سے زیادہ دلوں کو گرمانے کی غرض سے ہر سال دس دسمبر کو 'یوم حقوقِ انسانی' منایا جاتا ہے۔ لیکن فطرتِ انسانی کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ہر مرتبہ فرزندِ آدم کی سال بھر کی کارگذاریوں کے پیش نظر اس اعلان نامے کو دُہرانے کی ضرورت کا احساس کچھ اور بڑھ جاتا ہے۔ آج جو انسان تمام قدرتی حدود پر عبور حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہے، جو سارے عالم کو چند لمحوں کے اندر باخبر کر سکتا ہے اور جسے بڑی سے بڑی مسافت طے کرتے ہوئے کچھ دیر نہیں لگتی، وہی انسان تنگیٔ قلب و نظر کا کچھ ایسا شکار ہے کہ ہر جگہ اتفاق و اتحاد کے بجائے انتشار و ادبار کے آثار برابر بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ تاہم اولادِ آدم میں مساوات کا اصول ہی امن و آشتی کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر اس جہان میں آدم کی جنت بنانی ہے تو بیان و خیال کی آزادی سب کو دینی ہوگی اور مجبوری و لاچاری سے ہر ایک کو چھٹکارا دلانا ہوگا۔ ان حقائق سے منہ موڑنے کی صورت میں ابتری لازمی۔ اس لئے نہایت ضروری ہے کہ دنیا کی تمام قومیں ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھیں اور انسان سے انسان، پیار و محبت کے رشتے میں دائمی طور پر منسلک ہو جائے۔

اس اعلان نامے کی غرض وغایت یہی ہے۔ یہاں شخصی احترام پر زور دیا گیا ہے اور عورت و مرد کے ساتھ برابری کا برتاؤ بتایا گیا ہے تاکہ سماجی ترقی کا بہتر معیار جلد قائم ہو سکے۔ ملکی اور غیر ملکی تعلقات میں اِن باتوں کو پورے خلوصِ نیت کے ساتھ برتنے پر زور دیا گیا ہے۔ اعلان نامے میں کل تیس دفعات ہیں۔ پہلی دفعہ میں ہی اعلان کیا گیا ہے کہ سب انسان آزاد پیدا ہوتے ہیں جو اپنے حقوق اور عزّتِ نفس کے اعتبار سے بالکل برابر ہیں۔ وہ صاحبانِ عقل و دل ہیں اور اُن سب کو ایک دوسرے کے ساتھ برادرانہ رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اسی طرح دوسری دفعہ کے تحت رنگ وروپ، زبان و ایمان، جنس و خیال کا پاس کئے بغیر انسانیت کے تمام حقوق سب کے لئے برابر قرار دئے گئے ہیں۔ دیگر دفعات کے اندر غلامی سے نجات، قانون کی مساوات، آزادیٔ عقائد جیسے حقوق کو سراہا گیا ہے۔ اس اعلان نامے کی چھبیسویں دفعہ میں ہر فرد کے حقِ تعلیم کو بیان کیا گیا ہے۔ کم از کم ابتدائی منزل تک کی تعلیم لازمی اور مُفت قرار دی گئی ہے۔ فنّی تعلیم اور مخصوص پیشوں کی تربیت حاصل کرنے کا حق تسلیم کیا گیا ہے اور اہلیت کے مطابق ہر ایک کو اعلیٰ تعلیم کی یکساں سہولتوں کا حق دار قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم کا مقصد، شخصیت کی تشکیل و تکمیل اور اس کا احترام بتایا ہے۔ حصولِ امنِ عالم اور بین الاقوامی مفاہمت اس کی ذمہ داریاں قرار دی گئی ہیں۔ اگلی دفعہ میں ہر شخص کو سماجی مشاغل میں شرکت کرنے، فنونِ لطیفہ سے لطف اٹھانے اور سائنس کی برکتوں سے فیض یاب ہونے کا حق دیا گیا ہے۔ مزید برآں ہر فن کار ادیب اور سائنس داں کو اپنے فکر و عمل کے اخلاقی اور مادّی فوائد میں بھی شریک مانا گیا ہے۔

تعلیم کا یہ نصب العین نیا نہیں ہے۔ لیکن انجمنِ اقوامِ متحدہ نے اُسے انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامے میں بجا طور پر دہرایا ہے کیونکہ آج کی دنیا میں انسان کی اپنی افتادِ طبع کی بدولت ظلموں کی بدلیاں کچھ اس طور سے گھِر کر آ رہی ہیں کہ خود وجودِ انسانی ہی معرضِ خطر میں نظر آنے لگا ہے۔ تعلیم کو حصولِ اقدار کے بجائے تکمیلِ اغراض کا ذریعہ بنا لیا ہے لیکن

ہندوستان نے ہر دَور میں تعلیم کو روحانیت کا وسیلہ سمجھا ہے اور اسے ہمیشہ ایک مذہبی فریضے کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ پنڈت ہو یا مولوی، درویش ہو یا سنیاسی، جبہ پوشانِ شرع ہوں یا گدلئے خرقہ پوش، سب اپنے اپنے طریقے سے خلق خدا کے ظاہر و باطن کو سنوارنے میں لگے رہے ہیں اور اس خدمتِ خود اختیاری کو عبادت سمجھ کر کیا ہے۔ کسی نے کوئی گروکل یا مٹھ آباد کیا ہے اور کوئی مسجد و خانقاہ میں بیٹھا ہے لیکن علم کی آبیاری ہر ایک نے کی ہے اور انسانی قلوب کی تسکین کو سب ہی نے اپنا مسلک قرار دیا ہے۔ اس دیس میں تعلیم کو تجارت کبھی نہیں بنایا گیا بلکہ اُسے انسانی صفات کا سرچشمہ، راہ نجات، اور خدمتِ خلق کا موثر ذریعہ مانا گیا ہے بس اقدارِ مغرب کے دَور میں پہلی مرتبہ تعلیم کی خواری دیکھنے میں آئی اور مادیت کے غلبے کی بنا پر اس عہد میں بے شک اُسے محض دنیاوی ضروریات کی تکمیل کے ایک آلہ کار کی حیثیت دی گئی۔ یہ دورِ غلامی کی ایک لعنت تھی جسے چار و ناچار جھیلنا پڑا۔ لیکن جبر سے دست و بازو کو گرفت ہو سکتی ہے، زبان پر مہر سکوت لگ سکتی ہے مگر دل نہیں بدلے جا سکتے۔ اس دورِ آزادی میں ہمیں اپنی روایاتِ کہن کو از سرِ نو تازہ کرنے کی ضرورت ہے۔

اب یہ ذمہ داری قوم کے اساتذہ پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے منصب کو پہچانیں اور ایگی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھیں۔ تعلیم دراصل انسان بناتی ہے۔ اگرچہ یہ کام اس ملک کے رہنمایانِ تعلیم کی زیرِ نگرانی ہوا کرتا ہے لیکن اصل ہاتھ ایک استاد کا ہی سامنے آتا ہے۔ جس قدر یہ ہاتھ ہنرمند ہوگا اسی قدر اس کی دستکاری چمکے گی۔ ہمارے دیس میں تعلیم کا مسئلہ، بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمیں اپنے دیس میں جلد از جلد ابتدائی تعلیم کو لازمی اور مفت کرنا ہے۔ اگر حالات سازگار رہے اور ہمارے اندازے ٹھیک نکلے تب ۱۹۷۵ء میں چھ سال سے لے کر گیارہ سال تک کے سب بچے مدرسوں میں پہنچ سکیں گے۔ اور یہ بھی اس وقت ممکن ہوگا جبکہ قومی آمدنی خاطر خواہ بڑھتی رہے اور اس کا چار فیصدی تعلیم پر

صرف کیا جائے جس میں نصف، ابتدائی تعلیم کے لئے محفوظ رہے۔ ثانوی مدارس میں طلبہ کی مختلف صلاحیتوں کو بیدار کرنے اور ابھارنے کی غرض سے مختلف نوعیتوں کے مضامین کا انتظام کرنا ہے تاکہ ذہین طلبہ اپنے ذوق وشوق کو پورے طور پر ابھار سکیں۔ اس زمانے میں مغربی ممالک نے جو حیرت انگیز مادی ترقی کی ہے، اور فطرت کو مطیع اور قوت کو دست نگر بنا لیا ہے، اس کا واحد سبب ان ممالک میں سائنس کی تعلیم کا بہتر انتظام اور اعلیٰ معیار ہے۔ ہمیں اس وقت ثانوی تعلیم کی منزل پر سائنس کی تعلیم کا بہت کچھ اہتمام کرنا ہے۔ ہماری حکومت نے اس طرف ضروری قدم بھی اٹھالیا ہے۔ تیسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں سائنس کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ دی گئی ہے اور سائنس کے اساتذہ کی تربیت کے لئے ضروری اقدامات کئے گئے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم میں صرف وسعت ہی نہیں بلکہ وقعت بھی پیدا کرنے کا سوال ہے تاکہ ہونہار فرزندانِ وطن، بساطِ علم وفن کے درخشندہ ستارے ہو سکیں۔ اس کام میں مادّی وسائل کے ساتھ ساتھ کارکنوں کا خلوصِ نیت بھی نہایت ضروری ہے۔ وطن کے اساتذہ ہی اس کی آبرو رکھ سکتے ہیں اور ان ہی کے سوزِ دروں سے لاکھوں ننھی ننھی جانیں اپنے ذہن کے چراغ، روشن کر سکتی ہیں جن سے وطن کی عظمت کو چار چاند لگتے ہیں۔ اس لئے وطن کی ساری فلاح وبہبود، اس کا وقار وافتخار سب کچھ وطن کے اساتذہ کی اہلیت ومحنت پر منحصر ہے۔ علاوہ ازیں تعلیم کا کام وقتی ہنگامہ آرائی سے انجام نہیں پاتا۔ اس عمل میں دیر لگتی ہے۔ تعلیم کے پھل مسلسل جدوجہد کے بعد برسوں میں نصیب ہو پاتے ہیں اور وہ بھی کچھ اس طرح کہ پودا کوئی اور لگاتا ہے اور پھل کسی دوسرے کی موجودگی میں آتے ہیں۔ لیکن پھل آتے ضرور ہیں۔ گلزارِ وطن کی بہار کے لئے نونہالوں کو سرسبز وشاداب کرنا لازمی ہے تاکہ ایک دن وہ بار آور ہو کر فیضِ رساں ثابت ہو سکیں۔ پود لگانے کا کام ابتدائی مدرسے میں ہوتا ہے۔ یہ منزل سب سے کٹھن بھی ہے اور اہم بھی۔ پھر دوسری منزلیں آتی ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی خاص حیثیت اور اہمیت رکھتی ہے اور اسی لحاظ سے ان کی طرف

توجہ دردکار ہے۔

ہمیں اپنے تعلیمی نظام کی بنیادیں پورے طور پر استوار کرنی ہیں۔ آزادی کے بعد ایک ساتھ تعلیمی میدان میں جو توسیع ہوئی ہے اس کی وجہ سے خاطر خواہ معیار قائم نہیں ہو سکا یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اور اس صورتِ حال سے ہراساں ہونے کا سوال نہیں اٹھتا۔ اس وقت تک قومی معاشرے میں ڈھیلے پن کے جو آثار نظر آئے ہیں، انھیں حالات کا مظہر سمجھنا چاہیے۔ وہ ہماری فطرت کے آئینہ دار قطعی نہیں ہیں لیکن اب آزادی حاصل کئے ہوئے پندرہ سال گذر چکے ہیں لہذا غلامی کی گرد قطعی طور پر ضرور جھڑ جانی چاہئے تاکہ قوم کا اصلی رنگ و روپ نکھری ہوئی صورت میں جھلک سکے۔ اس مقصد کے لئے تعلیمی کارکنوں کو سختی سے اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ تعلیمی کام میں دوسرے درجے کے نتائج سے مطمئن ہو جانے کی قطعی گنجائش نہیں ہے۔ یہاں ملمع سازی اور نعرہ بازی کے ذریعے کام نہیں چل سکتا۔ اس میں صبر و استقلال کے ساتھ لگ جانے کی ضرورت ہے۔ اب تک قوم کی تعمیر نو کا کام پنج سالہ منصوبوں کی صورت میں میانہ روی کے ساتھ ہوتا رہا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے کہ تیسرے منصوبے کے اختتام پر ہمارے خوابوں کا ایک عکس واضح طور پر سامنے آئے گا لیکن چین نے ہمارے شمالی مشرقی سرحدی علاقے کو اپنی ہوس ناکی کا نشانہ بنانا چاہا۔ موج بلا کے یہ تھپیڑے ہمیں چونکانے کے لئے کافی ہیں۔ اس وقت سارے ملک میں بیداری کی لہر دوڑ گئی ہے اور ہمارے حوصلے بلند ہو گئے ہیں لیکن اس عزم کو عزم مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ ہمیں موجودہ حالات کے تحت صرف فوری انتظامات سے اپنی تسکین نہیں کرنی ہے بلکہ قوم کا مزاج بدلنا ہے۔ ہمارے سامنے صرف وقت کی پکار پر کان دھرنے کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ زمانے کی چال پہچاننے کا مسئلہ ہے۔ درندگی کو دفع کرنے کی غرض سے طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ہم اپنی قوم کو ہر حیثیت سے مضبوط بنائیں گے تاکہ آئندہ

کوئی ہم پر نگاہِ بد نہ ڈال سکے۔ اس غرض سے ہمیں اپنی تعلیم کا چولا بدلنا ہوگا۔ لیکن تعلیمی مصارف کو کم کرنے یا نظر انداز کرنے کی بات کم نگاہی پر مبنی ہے بلکہ حالات کے تقاضے اس باب میں ہماری مزید توجہ چاہتے ہیں۔ کسی ملک کی سب سے بڑی دولت اُس ملک کے بچے ہوتے ہیں اور سب سے زیادہ منفعت بخش کاروبار، تعلیم۔ ہمیں بہرطور تعلیمی کام کی طرف زیادہ سے زیادہ دھیان دینا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنی ہے کہ چین یا کسی اور ملک کی بدسلوکی کی بنا پر ہم اپنا مسلک ہرگز نہیں بدلیں گے۔ دنیا کے سامنے دین و ایمان کی بات ہم نے ہمیشہ کی ہے اور اب بھی کرتے رہیں گے۔ ہم نے انسانی حقوق کے عالمی اعلان نامے کی تائید حسن خلوصِ دل سے کی تھی، آج کے حقائق کی روشنی میں ہمیں اس کی وقعت کچھ اور محسوس ہوتی ہے۔ ہمارا استاد اپنے ہاتھ میں محبت کی مشعل لئے ہوئے تہذیبِ نفس کا درس برابر دیتا رہے گا۔ اس نے حادثاتِ زمانہ سے گھبرانا نہیں سیکھا ہے۔ اُس کا پیغام ایک ہی ہے کہ:

انسان بن انسان، یہی ہے تری معراج!

"مُعلّم"

تعارف و تبصرہ

(تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے)

مرزا رسوا کے تنقیدی مراسلات مرتبہ : ڈاکٹر محمد حسن

سائز ۲۰×۳۰/۱۶ ۔ حجم ۲۳۸ صفحات ۔ غیر مجلد ۔ قیمت : ساڑھے تین روپے ۔ تاریخ اشاعت دسمبر ۱۹۶۱ء ۔ جناب مرتب سے "رابعہ منزل ۔ بدر باغ ۔ علی گڑھ" کے پتے پر مل سکتی ہے ۔

مرزا احمد ہادی رسوا سے کون واقف نہیں ؟ "امراؤ جان ادا" نے انھیں شہرت دوام عطا کردی ہے، مگر زیر تبصرہ مراسلات سے ان کی ایسی خصوصیات اور خوبیاں سامنے آتی ہیں، جن سے بہت کم لوگ واقف ہیں ۔ اردو ادب کا تنقیدی سرمایا بہت کم ہے، شبلی اور حالی کے بعد اس موضوع پر کوئی جامع اور مستقل کتاب نہیں لکھی گئی، مگر تنقیدی مضامین کے بہت سے مجموعے چھپے ہیں، جن کے مضامین زیادہ تر عملی تنقید سے تعلق رکھتے ہیں، نظری سے کم، مگر اس میں شبہ نہیں کہ یہ مجموعے جدید خیالات و رجحانات کی پوری طرح ترجمانی کرتے ہیں اور مستقل تصنیف کے احساس کمی کے باوجود ان سے اردو ادب میں اضافہ ہوا ہے، آج بھی [illegible] اردو ادب نے کافی ترقی کرلی ہے اور مغرب کے اثرات سے ہمارا مزاج اور ذوق کافی بدل چکا ہے، مرزا رسوا کے یہ تنقیدی مراسلات جو اب سے کوئی بیس سال پہلے لکھے گئے تھے ۔ بقول مرتب خاصے کی چیز ہیں ۔

مرزا رسوا عربی فارسی کے جید عالم تھے، فلسفہ اور منطق سے نہ صرف گہری واقفیت تھی بلکہ طبیعت کو ان سے مناسبت بھی تھی، اس کی وجہ سے ان مراسلات کی زبان اور اصطلاحیں بہت مشکل اور غیر معروف ہیں، فاضل مرتب نے پیش لفظ میں موضوع بحث کی وضاحت کی کوشش

کی ہے اور آخر میں "تعلیقات" کے عنوان سے بعض ضروری باتوں، خصوصاً اصطلاحوں کی صراحت کردی ہے، لیکن مجھے شبہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ ان سے پوری طرح استفادہ کرسکے گا۔ البتہ مرزا کی سیرت وسوانح اور ان کے علمی کارناموں پر ممتاز حسین عثمانی اڈیٹر "اودھ پنچ" اور مرزا ہادی عزیز لکھنوی کے مضامین بہت دلچسپ ہیں اور ان سے مرزا رسوا کی بیشتر شخصیت کے بہت سے تاریک گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

نئے ڈرامے   مرتبہ : ڈاکٹر محمد حسن

سائز $\frac{20\times30}{16}$، حجم ۲۱۴ صفحات، غیر مجلد، قیمت پانچ روپے۔ سنہ اشاعت ۱۹۶۰ء۔
ناشر: انجمن ترقی ہند۔ علی گڑھ۔

اردو میں ڈرامے کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن صاحب ان لوگوں میں ہیں جن کو اس موضوع سے طبعی لگاؤ ہے اور اس کے فن اور اسٹیج کے مسائل سے بخوبی واقف ہیں۔ اس کتاب میں اردو کے مشہور ادیبوں کے بارہ ڈرامے شامل ہیں، انتخاب میں اس کا خیال رکھا گیا ہے کہ انھیں آسانی سے اسٹیج کیا جاسکے اور ان کا ادبی معیار بھی بلند ہو۔ ان میں سے بیشتر موجودہ سماجی مسائل پر لکھے گئے ہیں اور جدید رجحانات وخیالات کے آئینہ دار ہیں، کردار وہی ہیں جو ہماری دنیا میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں اور زبان وہی ہے جو روزمرہ بولی جاتی ہے۔

کوائفِ جامعہ

امیرِ جامعہ کی وفات

تیسرے امیرِ جامعہ ڈاکٹر عبدالمجید خواجہ صاحب کا ۷۷ سال کی عمر میں ۲ر دسمبر کو ۱۱ بجے علی گڑھ میں انتقال ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اطلاع ملتے ہی جامعہ میں چھٹی کر دی گئی۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کافی عرصے سے سخت بیمار تھے اس لئے وہ تو علی گڑھ نہ جا سکے، مگر قائم مقام شیخ الجامعہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب، مسجل جامعہ جناب ارشاد الحق صاحب اور بعض دوسرے اساتذہ تعزیت کے لئے تشریف لے گئے۔ ۴ر دسمبر کو سیوم کے دن جامعہ میں قرآن خوانی ہوئی جس میں اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی، اس کے بعد شیخ الجامعہ پروفیسر مجیب صاحب کی صدارت میں تعزیتی جلسہ ہوا، استاد اسلامیات مولانا قاضی زین العابدین صاحب کی تلاوت قرآن کے بعد ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے تقریر کی اور مرحوم کی قومی خدمات کو تفصیل سے بیان کیا۔

آخر میں صدر جلسہ کی طرف سے حسب ذیل تجویز پیش کی گئی:-

جامعہ ملیہ کے استادوں کارکنوں اور طالب علموں [illegible] امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ صاحب کی وفات پر اپنے رنج والم کے گہرے جذبات کا اور مرحوم کی [illegible] صاحبزادوں اور صاحبزادیوں سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ خواجہ صاحب نے اور چند برادران قوم کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تحریک آزادی کے سلسلے میں جامعہ ملیہ کی بنا رکھی۔ ایک مدت تک شیخ الجامعہ کی حیثیت سے اور چوتھائی صدی تک امیر جامعہ کی حیثیت سے اس کی رہنمائی کی۔ مرحوم ہمارے لئے حب وطن اور حب ملت خلوص ایثار اور خدمت کا ایک شاندار نمونہ چھوڑ گئے ہیں۔ ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ ان کی مغفرت کرے

اور ہمیں ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا کرے۔

جامعہ کے طلبائے قدیم کی ایک تقریب ۲ر دسمبر کی شام کو پہلے سے طے تھی۔ امیر جامعہ کی وفات کی وجہ سے یہ تقریب تعزیتی جلسہ میں تبدیل کر دی گئی۔ اس موقع پر ایک تجویز منظور کی گئی، جس میں مرحوم کی ملی اور قومی خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

"جنگ بند ہو گئی ہے، مگر دفاعی تیاریاں جاری رہیں گی"

جامعہ میں ملک کے دفاع کے لئے جہاں اور بہت سی تیاریاں شروع کی گئی تھیں، وہاں سول ڈیفنس کی تربیت کا ایک مختصر سا کورس شروع کیا گیا تھا۔ اس کورس کی ٹریننگ لینے والوں کے ایک جلسے میں شیخ الجامعہ صاحب اور دلی اسٹیٹ کے اسکاؤٹ ... سینہ صاحب نے تقریریں کیں۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محیب صاحب نے فرمایا کہ اگرچہ فی الحال لڑائی بند ہو گئی ہے، مگر ہماری تیاریاں اسی طرح جاری رہیں گی، جیسے کہ جنگ کے زمانے میں ہوتی ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ چینیوں کا کوئی اعتبار نہیں ہے کہ کس وقت وہ کیا کر بیٹھیں، اس لئے ہمیں جنگ بندی کے باوجود اپنی تیاری جاری رکھنی ہے۔ چینیوں کے حملے سے یہ بات صاف ہو گئی ہے کہ ہم کسی لڑائی کے لئے تیار نہیں تھے۔ ہماری حکومت تعمیری کاموں میں لگی ہوئی تھی، یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ آزادی کو قائم رکھنے اور اس کو مضبوط بنانے کے لئے یہ سب تعمیری کام بہت ضروری تھے، مگر جو خرابی تھی وہ یہ کہ ہم نے کبھی سوچا ہی نہیں کہ کسی طرف سے حملہ ہو سکتا ہے اور اگر حملہ ہو تو کیا کرنا ہوگا۔ بہرحال اب ہم کو اپنی کمزوریاں معلوم ہو گئی ہیں، اس لئے قومی دفاع کے سلسلے میں جو کام شروع کئے گئے ہیں، وہ جاری رہیں گے۔ موصوف نے فرمایا کہ ہمیں اس کو نظر میں رکھنا چاہیئے کہ بری سے بری شکل پیدا ہو سکتی ہے اور ایسی صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔ یہ بات سب کو معلوم ہونی چاہیئے۔ آپ نے فرمایا کہ تھوڑے سے دنوں میں موسم سرما کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں، اس میں ہماری تیاریاں حسب معمول جاری رہیں گی۔ جو لوگ اس زمانے میں سول ڈیفنس کی ٹریننگ لینی چاہتے ہیں وہ اپنے نام لکھوا دیں۔ شیخ الجامعہ صاحب نے آخر میں اس کی وضاحت فرما دی کہ ان تیاریوں کا تعلیم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ تعلیم معمول کے مطابق جاری رہے گی اور اگر کوئی یہ عذر کرے گا کہ ان دفاعی سرگرمیوں کی وجہ سے کوئی تعلیمی کام پورا نہیں ہوا ہے تو یہ عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔

مراسلہ بسلسلہ مضمون

"مولانا فضلِ حق خیر آبادی"

مکرمی، تسلیم

نومبر ۶۲ء کے "جامعہ" میں مولانا فضلِ حق خیر آبادی پر مولانا امداد صابری کا جو مضمون شائع ہوا ہے اس میں صفحہ ۲۶۹ پر ایک عجیب اور مضحکہ خیز عبارت نظر سے گزری۔ عبارت یہ ہے: "مولانا فضل حق .... دریا پار گئے، جنگلوں میں سے گزرے اور بھیکن پور ضلع علی گڑھ میں ۱۸ روز مقیم ہوئے۔ اس کے بعد آپ کے چچا نواب عبدالشکور رئیس بھیکن (پور؟) نے سانگرہ (سانکرہ؟) کے گھاٹ سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروا دیا۔" اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب عبدالشکور خاں، مولانا فضل حق کے چچا تھے! نہ معلوم یہ ستم ظریفی کاتب کی ہے یا خود مضمون نگار کی۔ مضمون نگار نے پیش نظر پیراگراف کے آخر میں "التورۃ الہندیہ" (مؤلفہ مولوی عبدالشاہد خاں شروانی) کا حوالہ دیا ہے۔ کتاب مذکور میں یہ واقعہ ص ۱۵۸ کے حاشیے میں اس طرح درج ہے: "نواب صدر یار جنگ بہادر کا بیان ہے کہ علامہ معہ متعلقین بھیکن پور ضلع علی گڑھ آکر ۱۸ روز رہے، صاحب زادہ مولانا عبدالحق بھی ساتھ تھے۔ ۱۸ یوم کے بعد موصوف کے عم محترم نواب عبدالشکور خاں رئیس بھیکن پور سانکرہ کے گھاٹ سے جو بھیکن پور سے ۸ میل ہے اور موصوف اور ان کے عزیزوں کی عمل داری میں واقع تھا اور اب بھی ہے اپنے انتظام سے بدایوں اور بریلی کی طرف اتروایا تھا۔" اس اقتباس سے واضح ہو جائے گا کہ "موصوف" سے مراد نواب صدر یار جنگ بہادر ہیں نہ کہ مولانا فضل حق!

نواب عبدالشکور خاں مرحوم ایک خدا ترس، دیندار اور علم دوست رئیس تھے۔ علماء و صلحائے سے بڑی عقیدت رکھتے تھے خود بہت سادہ زندگی بسر کرتے تھے لیکن دوسروں کی خدمت اپنی استطاعت سے زیادہ فرماتے تھے۔ آپ کے زمانۂ ریاست میں بھیکن پور متعدد نامور علماء و صلحائے کے قدوم سے مشرف ہوا۔

نواب صدر یار جنگ بہادر کے والد ماجد محمد تقی خاں صاحب مرحوم (جو نواب عبدالشکور خاں کے چھوٹے بھائی تھے) انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ دونوں بھائیوں میں اتنی محبت اور شیفتگی تھی کہ اس کی داستانیں ہمارے خاندان میں آج تک بیان کی جاتی ہیں۔ دونوں بھائیوں کی زندگی میں جائداد مشترک رہی۔ نواب صدر یار جنگ کی تعلیم و تربیت بھی عبدالشکور خاں صاحب مرحوم ہی نے فرمائی تھی محمد تقی خاں صاحب مرحوم کی وفات پہلے ہوگئی جس کا عبدالشکور خاں صاحب کو بہت صدمہ ہوا اور کچھ عرصہ کے بعد دنیا سے دل برداشتہ ہوکر سفر حج پر ایک بڑے قافلے کے ساتھ تشریف لے گئے۔ اُس وقت موصوف کے تین صاحب زادے حیات تھے لیکن کل جائداد کا انتظام بھتیجے کو سپرد کر کے گئے حج سے فارغ ہوکر واپسی میں جدہ میں ۱۹۰۷ء میں رحلت فرمائی۔ حد سے بڑھی ہوئی فیاضی کی بدولت جائداد پر کثیر قرض تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا چونکہ محمد تقی خاں صاحب مرحوم انتظام ریاست سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے اس لئے قرض کی سب دستاویزوں پر تنہا عبدالشکور خاں صاحب کے دستخط تھے۔ [illegible] نے نواب صدر یار جنگ کو مشورہ دیا کہ تقسیم جائداد کے بعد قرض کا سارا بار عبدالشکور خاں صاحب کے [illegible] گا، آپ اس سے محفوظ رہیں گے لیکن نواب صاحب نے اسے پسند نہیں فرمایا اور دستاویزوں پر جہاں جہاں عم محترم کے دستخط تھے، ان کے نیچے خود اپنے دستخط فرما دیئے اور پھر لوپے عزم و ہمت سے کل قرض جلد از جلد ادا فرمایا۔ یہاں ایک واقعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ نواب صدر یار جنگ فرماتے تھے کہ جب میں مولانا فضلِ رحمٰن گنج مرادآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو موصوف نے مجھے دعا دی کہ خدا تمہیں قرض کے بارسے سبکدوش کرے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ مجھ پر تو کسی کا قرض نہیں ہے۔ برسوں کے بعد جب مشترک جائداد کے قرض سے واقعی سبکدوش ہوا اُس وقت اس دعا کی مصلحت سمجھ میں آئی۔

حبیب منزل علی گڑھ ۹-۱۱-۶۲   نیاز مند   ریاض الرحمٰن شروانی

نوٹ: اس مراسلہ کے بعد ہم نے فاضل مضمون نگار سے رجوع کیا موصوف نے لکھا ہے کہ

"۱۰ نومبر ۱۹۶۲ء کے مولانا فضل حق خیرآبادی کے مضمون میں نواب صدر یار جنگ کے چچا نواب عبدالشکور کی جگہ مولانا فضل کا چچا منز شیع ہوتا تھا وہ لکھ دیا گیا تھا، جو غلط ہے۔"

ہم فاضل مراسلہ نگار کی اس تصحیح کے شکر گزار ہیں۔   (مرتب)

ہمدرد کا ماءُ اللحم

بھوک کو بڑھاتا ہے اور دوران خون کی اصلاح کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر ایک نئی طاقت نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے۔

دہلی
کانپور
پٹنہ

MSL. HMD. 1554 B

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی مطبوعہ یونین پریس دہلی ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

جامعہ

سالانہ چندہ
چھ روپے

قیمت فی پرچہ
پچاس نئے پیسے

جلد ۴۸	بابت ماہ فروری ۱۹۶۳ء	شمارہ ۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

پروفیسر محمد مجیب — ڈاکٹر سید عابد حسین

ڈاکٹر سلامت اللہ — ضیاء الحسن فاروقی

عبداللطیف اعظمی (مرتب)

خط وکتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر۔ نئی دہلی

تعلیم اور روایتی قدریں

از پروفیسر محمد مجیب — ترجمہ: عبداللطیف اعظمی

[اج]ازت دیں تو پہلے یہ عرض کردوں کہ سمپوزیم کے عنوان سے میں مطمئن نہیں [ہوں۔ ایسا] معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے طے کر لیا ہے کہ قدروں کی ماہیئت کیا ہے، یہ بھی [طے] کر لیا ہے کہ تعلیم قدروں کے ساتھ جو چاہے کر سکتی ہے، جو لوگ نصاب بناتے ہیں وہ اپنی [مرضی] [اور] [صوا]بدید کے مطابق جس قدر کو چاہیں قائم رکھیں، جسے چاہیں ترک کر دیں، گویا آدمی کو پورا اختیار ہے کہ اپنے عقیدے اور عمل کے بارے میں جو پسند ہو وہ کرے۔ یہ میں مانتا ہوں کہ ہماری زندگی کا ایک روایتی نقشہ تھا جسے سیاسی اور معاشی انقلابوں نے بالکل بگاڑ دیا لیکن کیا اس کے ساتھ ہماری فطرت بھی بدل گئی، کیا اب ہمارے عمل کو ایسی اخلاقی اور نفسیاتی طاقتیں ڈھالتی ہیں جن کا پہلے وجود نہ تھا؟ کیا ہم قدروں کی حقیقت میں شبہ نہیں پیدا کرتے اگر ہم بعض کو کہیں کہ یہ روایتی ہیں اور بعض کو جدید یا موڈرن ٹھہرائیں؟

"روایتی" کی تو شاید تعریف کی جا سکے، لیکن "موڈرن" کے کیا معنی ہیں؟ مجھے یاد ہے کہ ایک زمانہ تھا جب موڈرن سے مراد ایسا شخص ہوتا تھا جو ہر ایسی عادت، عقیدے اور طریقے پر ناک بھوں چڑھائے جو انگریزی نہ ہو، جو انگریزوں کا لباس پہنے اور انھیں کی طرح لوگوں کے ساتھ بیٹھے آئے، جو اس کوشش میں لگا رہے کہ انگریز اسے اپنی صحبتوں میں بلانے کے قابل سمجھیں اور بلائیں، صرف انگلستان اور جرمنی کی بنی ہوئی چیزوں کو خریدنا اور استعمال میں لانا چاہتا ہو، جو اپنی انگریزی کی قابلیت کی نمائش کرتا ہو اور ہندوستانی زبانوں کو حقارت کی نظروں سے دیکھتا ہو۔ اب خیال ہوتا ہے کہ موڈرن آدمی وہ ہے جو علمی اور

تہذیبی معاملوں میں دقت پسند ہو، تمام قدروں کو محض نسبتی سمجھتا ہو، عقیدہ اور عمل کے درمیان مطابقت کا ذکر کرنا بھی کٹ حجتی قرار دیتا ہو جس کا دماغ موجودہ دور کی علمی اور صنعتی ترقیوں سے چکرا گیا ہو، ہندوستان میں ان تمام ملکوں کے خیالات کو رائج اور تعلیمی اور اصلاحی اداروں کو قائم کرنا چاہتا ہو جو ہندوستانیوں کے لئے مفت سفر اور قیام کا انتظام کرتے ہیں، جو بہت موثر انداز سے ایٹمی جنگ کے ذریعہ انسانیت کے نیست و نابود ہو جانے کے خطرے کو بیان کرسکتا ہو۔ "موڈرن" کا لفظ استعمال کرنے سے ہمارے ذہن کا رخ کسی غلط سمت میں مڑ جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یقین نہیں رہتا کہ حقیقت اور چیز ہے اور نیاپن یا رواج یا علم کی منڈی کا پسندیدہ مال ہونا اور چیز۔ "موڈرن" کو ہم کسی صورت سے "دانشمندانہ" "یا مناسب" یا "مطابق عقل" کا مرادف قرار نہیں دے سکتے۔ "موڈرن" کے لفظ کو ہم ایک تاریخی دور کے لئے بے تکلف استعمال کرسکتے ہیں، لیکن قدروں کی بحث میں اس کے استعمال سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا چاہیئے۔

موجودہ نظامِ تعلیم انیسویں صدی میں بتدریج قائم ہوا اور جس جذبے کے ساتھ اور جس طریقے سے قدیم طرزِ تعلیم کی جگہ اس کو قائم کیا گیا، اس کے اثرات اب تک باقی ہیں۔ یہ تبدیلی کچھ اس طرح عمل میں لائی گئی، جس طرح کسی خاندان کی نوعمر نسل اپنے ان بزرگوں کو جن کے سایۂ عاطفت میں اس نے پرورش پائی ہے، لعنت ملامت کرکے اور ٹھوکریں مار کر گھر سے باہر نکال دے۔ قدیم نظام کی کوئی چیز اس قابل نہیں سمجھی گئی کہ اسے باقی رکھا جائے، کیونکہ اس کی بنیاد سنسکرت یا عربی اور فارسی پر تھی، نیز اس لئے کہ اس کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا تھا وہ بہت محدود اور فرسودہ تھا اور اس بات پر زور دیتا تھا کہ ان عقائد و اعمال کو اپنایا جائے جن میں صدیوں سے تقریباً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ نئی تعلیم کے وسیلہ سے جو علم حاصل کیا جاتا تھا، وہ بھی محدود تھا اور چونکہ اس علم کے حاصل کرنے کا ذریعہ ایک بیرونی زبان تھی، اس لئے اس کی ترقی میں ہندوستانیوں کے کسی نمایاں حصے کا سوال مشکل ہی پیدا ہوتا تھا۔ وہ عقیدے اور وہ اعمال جن کی قدیم نظام میں بڑی اہمیت تھی، اوہام رسومات اور ممنوعات کا ایک پشتارہ تھا۔ نئی تعلیم نے ذہنی برتری کا احساس

پیدا کیا، نئی تعلیم پائے ہوئے لوگ ان ناواقفوں اور اوہام پرستوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اسے اپنی خوش نصیبی تصور کرتے کہ وہ ایسا کر سکتے تھے۔ مگر اس امر کے اپنے واضح فائدے تھے ایک ہندو اپنے کو ہندو کہتا ہے اور مسلمان اپنے کو مسلمان۔ مذہب نے رفتہ رفتہ وہ شکل اختیار کر لی، جسے ہم آج کل فرقہ واریت کہتے ہیں اور ہم میں سے وہ لوگ جو بہت جلد گھبرا جاتے ہیں وہ اسے ہماری بہت ساری کشیدگیوں کا ایک بڑا سبب قرار دیتے ہیں۔ نئی تعلیم نے ہمیں سبق دیا ہے کہ مذہب کو استعمال کرو بغیر اس کی تعلیمات پر عمل کئے ہوئے، آزادی کے ساتھ سوچے بغیر کسی گہری فکر کے۔ اس نے ان وفاداریوں کو بھی جو ہندوستان میں بنیادی طور پر مذہب کی دین اور غیر مشروط تھیں، رسمی اور کاروباری تعلقات کی شکل دے دی۔ اس نے مختلف رنگوں پر مشتمل زندگی کا ایسا خاکہ تیار کیا، جسے کسی زاویے سے بھی دیکھئے، کوئی تصویر سامنے نہیں آتی۔

اجازت دیجئے کہ کچھ اور کہنے سے پہلے، قدیم نظام تعلیم کے متعلق اپنے خیالات پیش کروں۔ جدید اصطلاح کے مطابق یہ کوئی نظام نہیں تھا، اس طرح کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں نہ تھیں، جیسی کہ آج ہمارے زمانے میں ہیں، اس طرح کا کوئی درجہ وار نصاب تعلیم بھی نہیں تھا، جس سے کہ ہم آشنا ہیں، البتہ یہ طے تھا کہ کونسی کتابیں پڑھنی ہیں اور کس ترتیب کے ساتھ۔ یہ کتابیں یا تو اپنے موضوع کی مسلم اور مستند کتابیں ہوتی تھیں یا مستند کتابوں کی شرحیں اور تمام تر توجہ ان ہی کتابوں پر مرکوز کی جاتی۔ معلومات کے لحاظ سے ان کی حیثیت محدود ہوتی، مگر یہ محض کتابیں نہ ہوتیں، ان کے اثرات اتنے قوی ہوتے کہ انسان کو ان سانچوں میں ڈھال دیتے جنہیں معاشرہ کی سند حاصل ہوتی۔ اپنے اُس ذاتی تعلق کی بنا پر جو اُسے اپنے طالب علموں سے ہوتا، ان کے ذہن کی ترقی اور سیرت کی تشکیل کے سلسلہ میں غیر معمولی طور پر اثر انداز ہوتا تھا۔ کتاب، استاد اور ماحول یہ سب مل کر عقیدے اور حصول فضیلت کی بنیادی اہمیت کو نوخیز طالب علموں کے ذہن نشین کرتے۔

خود عقائد کے جواز میں بہ مشکل کچھ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگرچہ اُن باتوں پر جو ہمارے معیار کے

لحاظ سے، صریحاً غلط اور نامناسب تھیں تعصب کی حد تک شدت سے زور دیا جاتا تھا، پھر بھی جو بنیادی اصول پیش نظر رہتا تھا وہ یہ تھا کہ جو کچھ حق، نیک اور احسن ہے اُس کی خدمت میں فکر وعمل کی ساری قوتیں صرف کر دی جائیں۔ آپ اجازت دیں تو میں اس مفہوم کی تھوڑی وضاحت کر دوں۔ زندگی کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ کبھی نہ بدلنے والے اوائل قوانین کی تابع ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ان قوانین کو بے چون وچرا تسلیم کرے اور پابندی سے ان پر عمل کرے، اُسے چاہیئے کہ وہ اپنے مادی، ذہنی اور رُوحانی وسائل کو ایک ایسی امانت تصور کرے جس کا ایک دن سختی سے حساب ہوگا۔ ایسے احترام اور افہام وتفہیم کا انداز پیدا کرنا اور ایسا طرز عمل اختیار کرنا ہوتا تھا کہ دوسرے اپنے عقیدے کے مطابق آزادی سے عمل کر سکیں اور اس آزادی کو اپنا حق سمجھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے علم دین کے بارے میں سمجھا جاتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں۔ لیکن یہ تردید بے اثر ہو جاتی تھی اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مروجہ رسم ورواج سے پرے انسانی اور عالم گیر اقدار پر نظر پڑنے لگتی تھی۔ چونکہ مذہب محض چند اصولوں اور نظریوں کا نام نہیں تھا، بلکہ عمل اور سیرت کی تعمیر بھی اس کے مدنظر ہوتی تھی اس لئے تہذیب وثقافت کے نمونوں کی کم وبیش وہی حیثیت ہوتی تھی جو مذہبی احکام کی ہوتی تھی اور اس طرح پوری زندگی قاعدے اور ضابطے اور مستند نمونوں اور مثالوں کے معیار پر جانچی جاتی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ کچھ لوگ اِن قاعدوں کی پروا نہیں کرتے تھے، بالکل اسی طرح جیسے کہ آج بہت سے لوگ قانون کی پروا نہیں کرتے، مگر مہذب وہی شخص سمجھا جاتا تھا جو ان کے مطابق زندگی بسر کرے۔ قدیم قاعدوں اور جدید قوانین میں فرق یہ ہے کہ نئے قوانین بنیادی طور پر منفی ہیں اور ان کا تعلق خاص طور پر اس بات سے ہے کہ غلط کاری کی روک تھام کی جائے لیکن پُرانے قاعدے اثباتی تھے، ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ انسان کو نیک عمل کی ترغیب ہو، اس زمانے

میں صحیح بات کو کرنے اور انھیں صحیح طریقے پر کرنے کے لئے نظریں موجود تھیں اور ان نظریوں کے [illegible] کی بنیاد وہ تصورات تھے جو جمالی بھی تھے اور اخلاقی بھی۔ یہ صحیح ہے کہ ان نظریوں نے روزمرہ کی زندگی کے تمام معمولات کو مذہبی رسوم کی مکمل اور جامع شکل دے دی اور اظہار رائے کو [illegible] ضابطے کا محکوم بنا دیا گیا، یہاں تک کہ اتفاق اور اختلاف، محبت اور نفرت لذت اور الم کے شدید جذباتی تقاضے اور نفسیاتی ضرورتیں بھی اس بات کا عذر نہیں بن سکتی تھیں کہ مقررہ تہذیبی نمونوں کی خلاف ورزی کی جائے۔ ہر شخص ہر موقع پر فضیلت کو اپنا مطمح نظر سمجھتا تھا۔ فضیلت اور ہنرمندی کا یہ آئیڈیل اُس زمانے کی مصنوعات مثلاً کپڑے، برتن اور زیورات میں ظاہر ہوا، اس کی جھلک اُس عہد کے ادب میں بھی ملتی ہے۔ کوئی پچاس سال پہلے قدیم خاندانوں کے نونہالوں کے اداب گفتگو، وضع قطع اور اخلاق وعادات میں بھی اِسے دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم نے اپنے فن اور دستکاری کی سرپرستی کو خیرباد کہا اور اپنے کلچر کی پیداوار پر مغربی مشینوں کی پیداوار کو ترجیح دی، ہم نے باور کر لیا ہے کہ اب تہذیب اور شائستگی کو برتنے کی فرصت نہیں ہے، ادیب اور مصنف کچھ کہنا چاہتے ہیں تو محاورے اور روزمرہ کے استعمال کی زحمت گوارا نہیں کرتے، سلوک اور معاملت میں شائستگی اور تمیز کی جگہ ذاتی خوشی اور مفاد نے لے لی ہے، اس طرز عمل اور انداز فکر سے جو انتشار پیدا ہو گیا ہے اُسے ہم عبوری دور کا ایک واقعہ تصور کرتے ہیں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس کی طرف سے بے پروا ہیں اور ہمیں یہ فکر نہیں ہے کہ اس کا حشر کیا ہوگا۔

لیکن تعلیم کے سلسلے میں جو مسائل اُبھرے ہیں، وہ پہلے ہی سے تشویش ناک ہیں اور عدم مداخلت کے اصول پر مزید عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی اور مذہبی تعلیم اور جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی کمیٹیاں اس ضرورت کا احساس دلاتی ہیں کہ اس سلسلہ میں عزم اور ارادے کے ساتھ مثبت اقدامات کئے جائیں۔

رومن کیتھولک چرچ ایک مثال ہے ایسے مذہب کی جس نے ایک ادارہ کی شکل اختیار کرلی ہو، یہ مذہب ایسے تمام رجحانات کو جو عقیدے کو بگاڑتے ہیں، چیلنج کرتا ہے اور انھیں باطل قرار دے کر ان کا زور توڑ دیتا ہے۔

کمیونزم نے ایک خاص عقیدہ کی جبری تعلیم کی مثالیں پیش کی ہیں، لیکن واضح اسباب کی بنا پر ان میں سے کوئی مثال ہمارے لئے مفید نہیں، رواجی مذہب کو، جیسا کہ یہ ہندوستان میں رہا ہے، دوبارہ رائج کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں اور احیار کی تحریکوں نے عام طور پر ننگ نظری کا ثبوت دیا ہے اور زمانے کے اصل تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ ہم نے مذہب کو ـــــ لیکن فرقہ پرستی کو نہیں ـــــ اپنے بس بھر تعلیمی اداروں سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا، لیکن اب ہم اپنے سے سوال کرتے ہیں کہ کیا کسی مشترک عقیدے کے بغیر منظم اور صحت مند زندگی ممکن ہے؟ کیا ہمارے دستور کے آدرشوں کو حقیقت کا جامہ پہنایا جا سکتا ہے، اگر ہم سرد مہری کے ساتھ ان کو مانتے ہوں، جس طرح بے دلی کے ساتھ سچائی اور دیا نت کو مانتے ہیں؟ کیا قانون سازی اور کسی مخصوص سیاسی پارٹی کی حکمرانی کے ذریعہ اشتراکی سماج قائم کیا جا سکتا ہے؟ بلاشبہ ان میں سے ہر سوال کا امید افزا جواب دیا جا سکتا ہے، لیکن ایک رجائیت پسند کو بھی موجودہ حالات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا پڑے گا، اگر وہ ٹال مٹول کرنا نہیں چاہتا یا غیر سنجیدہ نہیں ہے۔

یہ بحث و گفتگو کہ ایسی قدروں کے ساتھ جو مذہب اور اخلاق سے تعلق رکھتی ہیں تعلیم کا کیا رویہ ہونا چاہیے، اس وقت تک نتیجہ خیز نہیں ہو سکتی جب تک ہم اس عظیم ترین تبدیلی کی اہمیت کو تسلیم نہ کریں جو ہمارے ملک میں ہوئی ہے ـــــ ایک آزاد قومی ریاست کا قیام، ایسی ریاست جو مستحق ہے موثر وفاداری کی، مستعد خدمت کی اور اس معیاری شہری ڈیوٹی کی، جو خود شہریوں کے باہمی تعاون اور شہریوں اور انتظامیہ

ایڈمنسٹریشن کے باہمی اشتراک کے لئے، ضروری ہے۔
یہ بالکل اُس شخص پر جو نعروں اور ہیجان یا افتادہ باتوں کے دھوکے میں نہیں آجاتا،
یہ بات بالکل واضح ہوگی کہ آج بھی ہم ریاست سے وفاداری کا ایک بہت ہی مبہم تصور
رکھتے ہیں۔ سیاسی وفاداری ہمارے روایتی اوصاف میں شامل نہیں ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں
کی ریاستیں جن کی تاریخ ہماری سیاسی تاریخ ہے، درحقیقت اقلیتوں کی حکومتیں تھیں جن کے سامنے
صرف اپنا مفاد ہوتا تھا اور حق تو یہ ہے کہ جمہوری طرز حکومت کی دریافت سے پہلے دنیا کی
ساری حکومتوں کا یہی حال تھا۔ اور آج بھی تمام جمہوریتوں کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اکثریت
کی ایسی حکومتیں ہیں جن کی باگ ڈور اُن اقلیتوں کے ہاتھ میں ہے جو یہ ثابت کر سکتی ہیں کہ وہ عوام
کے مشترک اور حقیقی مفاد کی نمائندہ ہیں۔ لیکن مغربی جمہوری حکومتوں میں وفاداری کے جذبے کی جڑیں
اس قدر گہری ہیں کہ اختلاف آراء کے باوجود قومی اتحاد قائم ہے، ہندوستان میں بدقسمتی سے، خود
نظام تعلیم، جسے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا اور اس کو ترقی دینا چاہیئے، اس کو کمزور کرنے کا ایک ذریعہ
بنا دیا گیا ہے۔ انگریزی حکومت کو، جس نے جدید تعلیم کو رائج کیا، ایسے ماتحت افسروں کی ضرورت
تھی، جو انگریزی سے واقف ہوں۔ ایڈمنسٹریشن کی توسیع، امتیازی قاعدوں کے برتنے
اور رعایت، ملازمت اور ترقی کے قاعدے اور طریقے نے ہندوستانیوں کو آگے بڑھنے کا
موقع فراہم کیا، لیکن وہ نہ تو عوام کے سامنے جواب دہ تھے اور نہ حکمراں طبقہ کے پوری طرح رکن ہی بن سکے

موجودہ صدی کے آغاز سے ہی وفاداری رفتہ رفتہ سیاسی گالی کی ایک اصطلاح بنتی گئی،
کیونکہ اس کے معنی تھے بیرونی طاقت کے مفاد میں شرکت کے۔ ۱۹۴۷ء سے چند سال پہلے کا
وہ زمانہ، جب یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ ہندوستان آزاد اور حکمراں ریاست کی حیثیت اختیار کرلے گا
اس ذہنیت میں اُس انقلابی تبدیلی کے لئے جو ضروری تھی، ناکافی تھا۔ جدید تعلیم کے جلو
میں اُس ہندوستانی تاریخ و تہذیب کی نئی تشریحیں بھی اُبھریں جنھوں نے ہندوستانی قوم کو ہندوؤں
مسلمانوں، سکھوں اور عیسائیوں میں اس طرح تقسیم کر دیا کہ ان کے دلوں میں نفرت، خوف اور انتقام

کے جذبات جاگزیں ہوگئے۔ اور اس چیز نے پوری کامیابی کے ساتھ اُس جذبۂ فسادی کی نشوونما کو روک دیا جو کسی مخصوص جماعت کے بجائے پوری ہندوستانی قوم کو اپنے اثر میں لے لیتا۔

اگر تعلیم کا مقصد قدروں کی از سرِ نو تاویل و توضیح کرنا اور اس طرح اپنے [illegible] ثابت کرنا ہے تو اس کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ تمام ممکن ذرائع سے یہ عقیدہ جاگزیں کرے کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور تمام ہندوستانی ایک قوم۔ اتحاد اور یکجہتی ایسے الفاظ ہیں جنھیں ہر شخص دہراتا رہتا ہے، لیکن اگر جرح اور جانچ [illegible] تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو لوگ اتحاد اور یکجہتی کی باتیں کرتے ہیں، [illegible] سے زیادہ تر وہ ہیں جو اس "ضروری فریب" کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم تاریخ سے واقف ہیں اور حقیقت پسند ہیں تو سمجھ جائیں گے کہ اشوک اور اکبر جیسے چند بادشاہوں اور ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے چند واقعات کا تذکرہ اتحاد اور یکجہتی کے ثبوت کے لئے کافی نہیں ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا ہوگا کہ چھوٹے اور [illegible] فرقوں کی ذہنی اور مذہبی علیحدگی پسندی، ریاستوں اور مذہبوں کی کش مکش تقریباً [illegible] ہے۔ ہم صرف اسی وقت متحد ہو سکتے ہیں جب ہم اپنے اندر انقلاب [illegible] ہم آہنگی کے ساتھ اپنی طبیعت اور ذوق کے مطابق [illegible] کے لئے ایک فعال جوش اور ولولہ پیدا کریں، جو ہمارے گناہوں اور غلطیوں کے اخلاقی بوجھ کو اٹھا سکے۔ یہ پہلا قدم ہے اپنے گناہوں پر پشیمان ہوتا۔ ہم نیکی کی اصلیت سے صرف اسی وقت واقف ہو سکیں گے جب ہمارے احساس شرمندگی میں خلوص ہوگا۔

اتحاد کے لئے اس طریق کار کو اختیار کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی مقدس کام اور اس میں کامیابی صرف اسی [illegible] ہوگی جب دینداری اور تقویٰ کی روایات سے، جو ہماری تاریخ کا ایک جزو ہیں، غذا اور طاقت حاصل کی جائے۔ یہ اعلان کہ ہماری

ریاست سیکولر ہوگی، ہر شہری کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اپنے رسمی مذہب سے عیناً عمل کرکے شہری زندگی کو مالا مال کرسکتا ہے۔ سیکولرزم تعلیم کے لئے ایک چیلنج ہے کہ وہ اس نظریے — امید یا خواب — کو کہ تمام مذاہب بنیادی طور پر ایک ہیں۔ واضح شکل میں پیش کرے۔ ریاست کے وسائل مذہبی تعلیم کے لئے استعمال نہیں کئے جائیں گے، ... نوخیز دماغوں میں ایسے عقائد کے اوصاف جاگزیں کرنے پر صرف ... کا جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔

نفسیاتی نقطۂ نظر سے اگر یہ ممکن ہوتا کہ مختلف مذاہب کی اخلاقی تعلیمات سے جو تصورات وابستہ ہیں اُن سے صرف نظر کرکے کوئی اخلاقی نقطۂ بحث مل سکے تو پھر مذہب یا عقیدہ کے ذکر کی ضرورت نہ ہوتی، تاریخی حقائق کا ایک سلسلہ ہے، ان میں ایک تلازم ہے، ایک مرکزیت ہے جو ہمیں ایک جگہ قائم رکھتی ہے، یہ چیز اگر نہ ہو تو انسان جلدی میں اپنائے ہوئے نظریوں کے گورکھ دھندے میں بھٹکتا رہتا ہے — اگر تعلیم غور و فکر کی صلاحیت پیدا کرے، احترام کے جذبے کو پروان چڑھائے اور یقین کی ضرورت کا احساس دلائے تو اس سے مذہبی و اخلاقی تعلیم کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔

دوسری روایتی قدر جس کا میں نے ذکر کیا ہے، افضلیت تھی۔ تعلیم کے قدیم نظام کا فرض تھا کہ وہ افضلیت کو برقرار رکھے — افضلیت گفتگو میں، سلوک میں، سعی و عمل میں اور شخصی تعلقات کو مقید بنانے میں، اس قدیم خوبی کو ہم دوبارہ رائج نہیں کرسکتے، نہ صرف اس لئے کہ وہ ختم ہو چکی ہے، بلکہ اس لئے کہ محض کسی چیز کا احیا، ایک قسم کی نقالی ہے اور انسان کو سماجی بے قاعدگی کا مرتکب بناتا ہے۔ ہمارے افضلیت کے نئے تصور کے مدنظر یہ ہونا چاہیئے کہ حُسن سے خواہ وہ کہیں بھی ملے، ماضی میں یا حال میں فیضان حاصل کرے اور حُسن کے تصور کو ضروری عملی قدر عطا کرے۔

اگر تعلیم تلاش وجستجو کے ذریعہ ذاتی طور پر اطمینان بخش ترقی پذیر غور وفکر کی اور اجتماعی طور پر محرک عقیدوں کی دہری ذمہ داریاں قبول کرے اور افضلیت کے تصورات کو فرض کی انجام دہی اور تعلقات کے پیدا کرنے اور [illegible] قائم رکھنے کے لئے بروئے کار لائے، تو وہ تحقیق انکشافات اور تشخیص کے مناسب حدود میں رہے گی، بلکہ وہ اپنے حدود کو وسعت دے کر زندگی اور طور طریق کے ضروری امور کو، جنہیں اب تک نظر انداز کیا گیا ہے، شامل کرلیگی۔ روزگار [illegible] کے معاملہ میں بھی یہ اپنی قدر کو نہیں کھوئے گی، بلکہ ہندوستانی شہریوں کے لئے [illegible] مددگار ثابت ہوگی۔

احمد نگر کی ملکہ چاند سُلطانہ کی موت کس طرح ہوئی؟

محمد نصیر الدین ہاشمی

مہاراشٹر کا شہر احمد نگر نہ صرف دکن بلکہ ہندوستان کی تاریخ میں اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ یہاں اعلیٰ کانگریسی ارباب حل وعقد یورپ کی گزشتہ جنگ عظیم کے زمانے میں نظر بند رہے تھے اور دکن کی خود مختار حکومتوں میں احمد نگر نظام شاہی حکومت کا پائے تخت بنا ہوا تھا۔ نظام شاہی حکومت کو دکن میں کئی وجوہ سے خصوصیت حاصل ہے۔ اول تو یہ کہ ملک احمد نظام الملک دکن کا ہی باشندہ تھا وہ دوسرے دکنی حکمرانوں کی طرح باہر سے نہیں آیا تھا وہ دکنی سپوت تھا جو اپنے حسن خدمات۔ دیانت دارانہ کارگزاریوں۔ بہترین سلیقہ کے بل بوتے پر ترقی کرتے ہوئے بہمنی دور حکومت میں صوبہ احمد نگر کا صوبیدار بن گیا تھا۔ اور سلطنت بہمنی کے شیرازہ حکومت کے منتشر ہونے پر دوسرے صوبہ داروں کے خود مختار ہو جانے پر اس نے بھی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شاہ طاہر جیسے صاحب علم وفضل اور مجتہد عصر نے ایران سے آکر یہاں اشاعت علم و فن میں حصہ لیا تھا۔ علامہ شاہ طاہر کے تبحر علمی کا نہ صرف دکن میں غلغلہ تھا بلکہ ایران میں بھی آپ کی مجتہدی کا احترام کیا جاتا تھا۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ شمالی ہند کی مغلیہ حکومت کا مقابلہ سب سے پہلے اسی نظام شاہی حکومت سے ہوا۔ مغلوں کی عظیم الشان سلطنت کا مقابلہ احمد نگر کی چھوٹی سی حکومت نے جس طرح بہادری اور شجاعت سے کیا تھا وہ تاریخ کے صفحات سے پوشیدہ نہیں ہے۔ احمد نگر کو عرصہ دراز تک محاصرہ کئے ہوئے مغلیہ فوج لڑتی رہی اور کئی مرتبہ مغلوں کو چاند سلطانہ نے پسپا کر دیا تھا اس کی دلیری اور جاں بازی کا دشمنوں کو بھی اعتراف تھا۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ چاند سلطانہ اپنے کارناموں سے تاریخ دکن میں "عورت" کے نام کو زندگی جاوید دے دی ہے۔ چاند سلطانہ

نظام شاہی حکومت کی شہزادی عادل شاہی حکومت کی ملکہ تھی مگر اپنے شوہر علی عادل شاہ اول کے انتقال کے بعد احمد نگر آکر اپنی آبائی حکومت نظام شاہی کو بچانے کے لئے مغلوں کے خلاف جس طرح لڑتی رہی وہ تاریخ دکن کی درخشاں مثال ہے۔

[illegible] ہے کہ چاند سلطانہ نے اپنی جواں مردی۔ جانبازی۔ شجاعت اور دلیری اور مردانگی کے جو کارنامے تاریخ دکن میں نہیں بلکہ تاریخ ہند میں ثبت کئے ہیں ان کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ دکن والے فخر اور ناز کر سکتے ہیں۔

دکن کے لئے چاند سلطانہ دہلی کی ملکہ رضیہ سلطانہ سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے لیکن تعجب ہے کہ اب تک اس بہادر اور ملکہ کی موت کی وجہ صحیح طور پر متعین نہیں ہوئی ہے۔ احمد نگر کے بعض مورخین نے اس کو تیزاب سے لبریز کنوئیں میں گر کر خودکشی کرنے کی صراحت کی ہے اور بعض ایک باغی امیر سے لڑ کر شہید ہونے کی صراحت کرتے ہیں بیجاپوری اور مغلیہ مورخین آخر الذکر رائے سے متفق ہیں۔

قدیم مورخین سے قطع نظر بیسویں صدی کے مورخین میں بھی اختلاف ہے کسی نے ایک گروہ کی تائید کی ہے اور کئی مورخین کو دوسرے خیال سے اتفاق ہے۔

اس لئے صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لئے سنجیدگی اور پوری احتیاط کے ساتھ حالات اور واقعات پر غور کرتے ہوئے صحیح نتیجہ پر پہنچ سکتے ہیں۔ احمد نگر کے مورخین میں قاضی شہاب الدین صاحب تاریخ شہابی۔ امیر علی مصنف تاریخ احمد نگر اور قاضی عبدالغنی مولف جامع العلوم نے اس امر سے اتفاق کیا ہے کہ چاند سلطانہ تیزاب کے کنوئیں میں گر کر جاں بحق ہوئی۔ چنانچہ ایک حالیہ مولف سید احمد اللہ قادری نے اپنی کتاب سوانح چاند بی بی میں ان اصحاب کے خیالات کو نقل کرتے ہوئے احمد نگری مورخ ہونے کے لحاظ سے اسی خیال کی تائید کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

" مغل جب قلعہ میں داخل ہوئے تو چاند بی بی نے ایک باؤلی کو تیزاب سے بھروادیا

بعد اس میں غرق ہوکر جان بحق ہوگئی" (صفحہ ۱۶)

اس کے بعد جامع العلوم کے ضمیمہ جلد اول کی بصراحت نقل کی ہے۔ جو یہ ہے :-

"چاند بی بی کہ در حسن و جمال و سیرت و صورت بہ آفتاب و ماہتاب ہمسری داشت و اطوار لشکریاں دہلی چنیں برکوز خاطر آں خدیو گہبان عصمت و عفت شدہ بود کہ اگر بدست آنہاں افتد عفت او نخواہد ماند ازاں جہت در خم بزرگ کہ پُر از تیزاب آب گندک نمودہ بود خود را انداخت دو ظرفۃ العین لاش گردید نا قالب ہم از نظر نامحرمان محفوظ ماند" (سوانح چاند بی بی، صفحہ ۸۱)

دکن کی مشہور تاریخ "برہان المآثر" جو اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھی گئی ہے اس میں اس اہم واقعہ کی صراحت نہیں ہے بلکہ مولف نے اس کو مغلیہ حملہ پر ہی ختم کر دیا ہے حالانکہ جب چاند بی بی کی موت کے بعد اس کی ترتیب ہوئی ہے تو اس میں اس کا تذکرہ کر کے صرف حملے کے واقعات پر ختم کر دینا خصوصی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی مزید صراحت آگے آتی ہے۔ اس کے بعد بیجاپور اور مغلیہ مورخین کی صراحت ملاحظہ ہو۔ بیجاپور کے مشہور مورخ فرشتہ نے جو وضاحت کی ہے اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے :-

"شاہزادہ (دانیال) اور دیگر اکبری امیروں نے بلا کسی خدشہ کے قلعہ احمد نگر کا محاصرہ کر لیا اور امیروں نے مورچل تقسیم کئے۔ شاہزادہ دانیال و خانخان و سید یوسف وغیرہ نے مورچل کی طرف سے نقیب کھودنے لگے جب قلعہ قریب فتح کے ہوا تو چاند سلطانہ نے چیتہ خاں خواجہ سرا سے کہا کہ آہنگ خان اور دیگر امرا نے اس قدر سرکشی کی کہ ان کی شامت اعمال سے خود اکبر بادشاہ دکن فتح کرنے کے لئے آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قلعہ بھی چند روز میں سر ہو جائے گا چیتہ خاں نے جواب دیا کہ گزشتہ کا کیا ذکر ہے اب جو حکم ہو اس کے موافق عمل کیا جائے۔ چاند سلطانہ نے کہا کہ میری رائے یہ ہے کہ ہم یہ قلعہ شاہزادہ دانیال کو سپرد کر کے اپنی عزت و جان کو

بچائیں اور جنیر روانہ ہوجائیں اور وہاں قیام کر کے خدا کی مدد کا انتظار کریں جیتہ خاں نے تمام اہل قلعہ کو جمع کرکے ۔ آواز بلند کہا کہ چاند سلطانہ نے اکبری امیروں سے سازش کرکے یہ ارادہ کیا ہے کہ قلعہ شاہزادہ دانیال کے سپرد کردے ۔ اہل دکن یہ خبر سنتے ہی حرم سرا میں گھس آئے اور انھوں نے بڑی تکلیف و ظلم کے ساتھ چاند سلطانہ کو قتل کر ڈالا ۔ اکبری لشکر میں نقب تیار ہوئی اور قلعہ کی دیوار اڑادی گئی ۔ مغل فوج قلعہ کے اندر داخل ہوئی اور جوان بوڑھے بچے سب قید کر لئے گئے "۔

(ترجمہ تاریخ فرشتہ جامعہ عثمانیہ جلد چہارم صفحہ ۳۱۰)

اس کے ساتھ مغلیہ مورخین کے رائیں بھی اس نظریہ کی تائید کرتی ہیں چنانچہ ابوالفضل نے اکبر نامے میں اور بختاور خاں نے اپنی تاریخ مرآۃ العالم میں حسب ذیل صراحت کی ہے :۔

" شاہ رخ مرزا خانخاناں مرزا یوسف خاں میر مرتضیٰ جگناتھ شیر خواجہ مرزا علی بیگ خواجہ بیگ مرزا اعتبار خاں کچک خواجہ محمد خاں و دیگر را مردان چاند بی بی بہ تازہ کاری پیمان بر نشست ۔ ازیں آگہی چیتہ خان خواجہ سرائے با برخے درونی بہ گوہراں گزیں باتوراجان بہ شکرد ۔ و بیا دری اعتبار خاں و میر صفی و مرزا تقی و حاجی محمد تو یا ندازی فرا پیش گرفت "۔ (اکبر نامہ ۔ ابوالفضل فیضی جلد سوم مطبوعہ دہلی صفحہ ۵۳۶)

" دریں وقت قلعہ احمد نگر بہ حسن سعی شاہزادہ دانیال مفتوح گشت و ناسک بہ تصرف آمد ۔ و در آں زمانہ کہ تنزلزل بہ ارکان قلعہ احمد نگر راہ من یافت چیتہ خاں نام غلام حبشی چاند بی بی را ضائع ساخت "۔ (مراۃ العالم ۔ قلمی ۔ مولفہ محمد بختاور خاں خواجہ سرائے ۔ تالیف ۱۰۱۲ھ صفحہ ۲۰۶)

خانی خاں نے اپنی کتاب کے پہلے حصہ میں اگرچہ خودکشی کی صراحت کی ہے لیکن منتخب اللباب کے

حصے میں وہ صاف طور سے مختار خاں وغیرہ کے خیال کی تائید کرتا ہے چنانچہ لکھتا ہے :-

"شاہزادہ دانیال و خانخاناں کہ بعد تردداتِ وکوشش وکشش بسیار کار بر چاند بی بی ساختند در اکبرنامہ و تاریخ فرشتہ بہ شرح و بسط درج است - بہ روایتی چاند بی بی بعد از ملاحظہ آنکہ کار از دست رفتہ بہ تدبیری در ہلاک خود کوشید - کہ احدی واقعی بر احوال مطلع نہ گردید و اقوال مختلف دریں باب زبان زد کہن سالان دکن گردیدہ بود - "

(منتخب اللباب محمد ہاشم علی خافی خاں حصہ اول صفحہ ۲۱۵)

"از آں جماعہ چیتہ خاں خواجہ سرائے کہ مرضی چاند سلطانہ را بر سپردن قلعہ و طلبیدن امان اطلاع یافت بہ فریاد و شورش آمدہ ندائے علم نمود کہ چاند سلطانہ با سرداران چغتیہ ساختہ می خواہد کہ قلعہ را بہ منصوبان محمد اکبر بہ دہد و ہمہ اتفاق نمودہ غرہ محرم ۱۰۰۹ھ ہزار و نہ ہجری با شمشیر ہائے برہنہ بہ حرم سرائے چاند بی بی در آمدہ بہ زخمہائے پیاپے آں مظلومہ را شربت شہادت چشانند - و انیکہ شہرت عام دارد و بر السنہ مردم دکن جاری است کہ چاند سلطانہ خود را در باولی انداختہ مفقود الاثر گردید خلاف متون تاریخ فرشتہ و شہرت دادہ دکنیاں است"

(ایضاً - حصہ سوم صفحہ ۲۶۲)

قدیم مورخین کے بعد صمصام الملک شاہ نواز خاں نے ماثر الامرا میں اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ چاند سلطانہ بہادری سے اپنے امرا سے لڑتی ہوئی شہید ہوئی ہے اور تاریخ ماہنامہ کی صراحت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے - چنانچہ لکھتا ہے :-

"و دکنیاں کوتہ اندیش حماقت کیش خیال خام کردند کہ از کشتن آں مخدرہ تیغ عصمت بہ آنہا مسلم و برقرار خواہد ماند - بنا برآں غرہ محرم محترم ۱۰۰۹ھ با جمعی از دکنیاں بے ایمان درون حرم سرا آمدہ آں زہرہ فلک عصمت را بہ زجر و عقوبت تمام شربت شہادت چشانیدند"

(تاریخ دل افروز" موسوم بہ ماہنامہ غلام حسین خاں جوہر قلمی صفحہ ۲۴۰)

یہ تمام فارسی تاریخوں کی صراحت ہے۔ اب اُردو مورخین نے جو صراحت کی ہے وہ بھی قابل ملاحظہ ہے۔
سب سے پہلے غلام امان خاں جو کہ امرا رشید الدین خاں کا متوسل تھا اپنی "تاریخ رشید الدین خانی" میں ذیل صراحت کرتا ہے :-

"شہزادہ دانیال نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اس وقت چاند سلطانہ ناچار ہو کر چاہا کہ قلعہ مغلوں کو دے دے اور جان اور ناموس کو امن لینا۔ چیتہ خاں خواجہ سرائے باہر آکر روبرو دکھنیوں نے یہ بات کہی کہ سلطانہ کا ارادہ ایسا ہے۔ جہلا اس امر کو برا جان کر غزہ محرم بلا تامل حرم سرا میں گھس آئے اور نادانی سے اپنی بلقیس ثانی کو کاری زخم پہنچا کر شہید کیا"۔ (مطبوعہ ۱۸۶۲ء، صفحہ ۲۰۱)

غلام امان خاں کے بعد سید منصور خاں جنھوں نے سید علی بلگرامی کی نگرانی میں تاریخ دکن کی کئی جلدیں مرتب کی ہیں حسب ذیل وضاحت کی ہے :-

"اس وقت قلعہ میں چیتہ خاں حبشی بڑا سردار تھا۔ چاند سلطانہ نے بلا کر جب اس سے اپنی رائے ظاہر کی تو اس نا معقول نے بلا مال اندیشی ایک شور مچا دیا کہ چاند سلطانہ مغلوں سے مل گئی ہے اور چاہتی ہے کہ قلعہ ان کو دے دے چونکہ چاند سلطانہ نے پہلے برار کا علاقہ مغلوں کو دے کر صلح کر لی تھی اس کی بدنامی نظام شاہی سرداروں کے دل سے ابھی مٹی نہیں تھی بلکہ چاند سلطانہ کے ذمے سب سے بڑا یہی قصور لگا کر اس سے بغاوت کی جاتی تھی اگرچہ یہ الزام ان کا محض بے عقلی سے تھا مگر جہان بے عقلی کو کون دور کر سکتا ہے اس بات کے کہتے ہی سب نے چاند سلطانہ کو یکا مجرم تصور کیا اور بلوہ مچا کر حرم سرا میں گھس پڑے اور اس عاقلہ اور مصلحت اندیش کو بری طرح مار ڈالا۔"

(سلسلہ آصفیہ تاریخ دکن جلد ۳، صفحہ ۲۷۸)

حیدرآباد کے ایک دوسرے مورخ مولوی محمد مرتضیٰ نے اپنی کتاب "عہد سلف" میں اس سے اتفاق کیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

"چاند بی بی کا نام تاریخ میں یادگار ہے جس نے مغلیہ فوج کی مدافعت کی لیکن طاقت اور خوش نظمی کے مقابلہ میں محض جوش بدنظمی کو فرو نہیں کر سکتا۔ چاند بی بی کا ایک حبشی نے کام تمام کر دیا۔" (صفحہ ۱۰۷)

اس سلسلہ میں ڈاکٹر حفیظ سید نے اپنے مضمون میں جو رسالہ زمانہ کانپور بابتہ ماہ جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا ہے حسب ذیل صراحت فرمائی ہے۔

موصوف نے اس مضمون کو اکبر نامہ۔ تاریخ فرشتہ وغیرہ سے مدد لے کر مرتب کیا ہے اور مضمون میں ماخذ کے حوالے درج کر دیئے ہیں چنانچہ وہ صراحت کرتے ہیں :۔

"اپریل ۱۶۰۰ء میں مغلوں نے احمد نگر کا محاصرہ کر کے سرنگ لگانی شروع کر دی چاند بی بی نے مشورہ کے لئے حامد خاں خواجہ سرا کو بلایا۔ یہ قلعہ کا سربر آوردہ افسر تھا۔ اور اس جنگ میں مر مٹنے کے لئے تیار تھا۔ چاند بی بی نے دیکھا کہ اس محاصرے کا مقابلہ نا ممکن ہے تو اس نے مغلوں سے مصالحت کرنی چاہی تاکہ وہ قلعہ سے محاصرہ اٹھالیں اور چاند بی بی نوعمر بادشاہ کے ساتھ جونا چلی جائے۔ اور اس ارادہ سے باخبر ہو کر حامد خاں نے تمام شہر میں چاند بی بی کے مغلوں سے مل جانے کی خبر مشہور کر دی۔ ہر شخص ایک دوسرے سے سرگوشی کرنے لگا کہ چاند بی بی کے تمام سردار شہنشاہی فوج سے مل گئے اس سے دکھنی فوجوں میں شبہات پیدا ہو گئے اور غصہ کی حالت میں سخت ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے حامد خاں کی رہنمائی میں محل پر حملہ آور ہوئے۔ ملکہ کو دیوان عام میں نہ پاکر سب لوگ محل کے اندر جہاں ملکہ موجود تھی پہنچ گئے اس منظر کو دیکھتے ہی چاند بی بی اپنا انجام سمجھ گئی۔ اس نے نہایت دلیری سے ان کا مقابلہ اور ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا چاہا لیکن جوش غضب میں لوگوں کی عقلوں پر پردے پڑ گئے اور کسی نے اس کی ایک نہ سنی برابر یورش کرتے رہے۔ حامد خاں نے ملکہ پر پہلا وار کیا پھر جلد زخموں سے چور ہو کر گر پڑی اور اس کی روح قفس عنصری سے

اس کے ساتھ ایک انگریز مورخ کی رائے ملاحظہ ہو :۔

"Hearing this Hamid Khan ran into the streets, declaring that Chand Sultana was in treaty with the Moghals for the delivery of the fort. The shortsighted and ungrateful Dakanis, headed by Hamid Khan, rushed into her private rooms and put her to death..."

(Bombay Gazetteers-1888 Vol. XVII-Chapter VII-Page 386)

"یہ سن کر حامد خاں باہر نکل پڑا اور شور مچا مچا کر اس کا اعلان کرنے لگا کہ چاند سلطانہ نے مغلوں سے صلح کر لی ہے اور قلعہ ان کے حوالہ کرنا چاہتی ہے، کم اندیش اور ناشکر گزار دکنی جن کا سرغنہ حامد خاں تھا، اس کے محل سرا میں گھس گئے اور اُسے قتل کر ڈالا۔"

(بمبئی گزیٹرز، ۱۸۸۸ء جلد ۱۷، باب ہفتم، صفحہ ۳۸۶)

احمد اللہ قادری صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ احمد نگر کے مورخین کے خلاف بیجا پور کے مورخین کی رائے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ اس لئے خودکشی زیادہ صحیح ہو سکتی ہے۔ مگر اس کے ابطال کے لئے کئی اہم امور غور طلب ہیں جن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) جہاں احمد نگر کے بعض مورخین خودکشی کی صراحت کرتے ہیں وہاں چند مورخین نے باغی امرا سے لڑ کر ہلاک ہونے کی بھی تائید کی ہے۔ چنانچہ بختاور خاں اپنے چشم دید حالات کے طور پر اس واقعہ کی صراحت کرتا ہے اور اس کی تصنیف چاند سلطانہ کی موت کے کچھ ہی عرصہ بعد ہوئی ہے۔ اس لئے بختاور خاں کے بیان کو بہت زیادہ اہمیت دی جانی چاہیئے۔

(۲) مقامی مورخ اگرچہ صحیح حالات لکھ سکتے ہیں مگر یہ امر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ مقامی مورخین کو حکومت کا خوف بھی دامن گیر رہا کرتا ہے اور اپنے زمانے کے ارباب حل وعقد کے

حالات کو پیش نظر رکھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں۔ وہ اصل واقعات کو قصداً نظرانداز کردیتے ہیں یا ان کو دوسرے رنگ میں بیان کرتے ہیں جو زمانہ مابعد کے آنے والوں کو صحیح تو معلوم ہوجاتے ہیں مگر اصلیت کے منافی ہوتے ہیں اور اصل واقعہ کی پردہ پوشی ہوکر دوسرے رنگ میں سامنے آتی ہے۔

چاند بی بی کو قتل کرنے والے غدار امرا نے چاند بی بی کو قتل کرکے خود کو عوام کا محافظ اور نظام شاہی حکومت کا طرفدار ثابت کیا تھا اس لئے اس وقت کے مورخ مجبور تھے کہ اصل واقعہ پر پردہ ڈال کر خودکشی کی داستان قلم بند کردیں تاکہ ایک طرح سے چاند بی بی کی اصلی موت پوشیدہ رہے اور دوسری طرف غداروں کے کرتوت پر پردہ پڑجائے۔

اس قسم کے حالات ہر زمانہ کے مورخ پر گذرتے ہیں مثلاً حیدرآباد میں قطب شاہی مورخ سلطان قلی کی بھاگ متی کے حالات ظاہر نہیں کرتے۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی جو تاریخیں انگریزوں کے زمانہ میں قلم بند ہوئی ہیں۔ اور جنگ آزادی کی جو داستان انگریزوں کے زمانے میں لکھی گئی وہ اصل واقعات سے جس طرح خلاف ہے وہ چشم بصیرت سے پوشیدہ نہیں ہے خود سلطنت آصفیہ میں بعض واقعات ایسے ہوئے ہیں جن کا تذکرہ تاریخ دکن میں نہیں ہے۔ حالانکہ واقعات صداقت پر مبنی تھے مثلاً ناصرالدولہ آصف جاہ رابع کا بہادر شاہ ظفر سے خط و کتابت کرنا یا مثلاً میر محبوب علی خاں آصف جاہ کا سردار بیگم (سردار جان طوائف) سے عقد کرنا کسی تاریخ دکن میں نہیں ہے۔

[illegible] فرشتہ کو غیر متعلق نہیں کہا جاسکتا کیونکہ عرصہ دراز تک فرشتہ کو احمد نگر کی نظام شاہی سلطنت سے تعلق تھا اور وہ مرتضی نظام شاہ کا مصاحب تھا اس کا باپ نظام شاہی حکومت کے ارباب حل وعقد میں شامل تھا۔ علاوہ ازیں احمد نگر بیجاپور سے کوئی زیادہ فاصلہ پر نہیں تھا اور تاریخ فرشتہ کی تالیف کے وقت چاند سلطانہ کو واقعہ کو پیش آکر چند سال ہوئے تھے اس لئے کوئی وجہ نہیں ہے کہ فرشتہ کی رائے کو غلط قرار دیا جائے جس نے خودکشی کی صراحت نہیں کی بلکہ شہادت کا حال قلم بند کیا ہے۔

(۴) چاند سلطانہ کے کردار پر نظر ڈالی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ وہ مذہبی عورت تھی مذہب کے

احکام کی سختی سے پابندی کرتی تھی چنانچہ جب پہلی مرتبہ مغلوں کے حملوں سے احمد نگر کی فصیل شہر ٹوٹ گئی تھی تو وہ چہرہ پر نقاب ڈال کر دشمنوں سے لڑتی رہی اور اپنے سپاہیوں کو ہمت دلاتی رہی۔ ایسی خاتون کا جو بے پردہ نامحرموں کے سامنے آنے کو مذہب کے خلاف تصور کرتی تھی ، خودکشی کرنا جو مذہب اسلام میں حرام ہے کس طرح قرین قیاس ہو سکتا ہے جب اس کے سامنے دشمن موجود تھے تو ان سے لڑ کر شہادت حاصل کر سکتی تھی۔ شہادت کا مرتبہ حاصل نہ کر کے خودکشی کرنا اور حرام موت مرنا ایک بہادر اور دلاور عورت کبھی پسند نہیں کر سکتی تھی۔

(۵) خافی خاں نے اپنی کتاب میں پہلی مرتبہ اس واقعہ کو اس صورت میں لکھا ہے جو احمد نگر میں عام طور سے مشہور تھا مگر اس نے دوسرے حصہ میں پوری تحقیق کے بعد یہ واقعہ لکھا ہے کہ چاند سلطانہ نے خودکشی نہیں کی بلکہ بہادری سے لڑ کر شہید ہوئی ہے۔ پہلی صورت صرف دکھنیوں کی مشہور کی ہوئی ہے جو صداقت سے دور ہے۔

(۶) چاند بی بی کا اکبر سے صلح کرنے کا ارادہ کرنا تمام مورخین کا تسلیم کردہ ہے۔ خواہ وہ احمد نگر کے ہوں یا بیجاپور کے اور اس خیال کے مخالف امرا بھی موجود تھے اور ان کا مخالفت کرنا بھی ثابت ہے تو پھر ایک بہادر ملکہ کا ان سے مقابلہ نہ کر کے خودکشی کرنا کس طرح باور کیا جا سکتا ہے۔

(۷) احمد نگر کی ایک مشہور اور معتبر تاریخ برہان مآثر ہے اس میں نظام شاہی حکومت کے حالات تفصیل کے ساتھ درج ہیں اور اس کی تالیف چاند سلطانہ کے موت کے کچھ ہی بعد ہوئی ہے، مگر مولف نے اپنی تاریخ کو صرف حملہ کے حالات پر ختم کر دیا ہے اس کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی جب اس واقعہ کے بعد اس کتاب کی تالیف ہوئی ہے تو چاند سلطانہ کے موت کو کیوں نہیں بیان کیا گیا اور اس کے پہلے ہی کتاب ختم کر دی گئی۔ اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ برہان مآثر کا مولف صداقت پسند تھا وہ اصل واقعہ کو غلط نہیں لکھ سکتا تھا مگر حکومت کے خوف سے اس نے اپنی تاریخ کو اس واقعہ کے پہلے ہی ختم کر دیا ہے تاکہ اصل حقیقت کو غلط لکھنے کا دھبہ نہ آئے اور حکومت کے ارباب حل و عقد کی باز پرس سے بری رہے۔

ان تمام وجوہ کی بنا پر میں چاند سلطانہ کی خودکشی غلط قرار دیتا ہوں اور بڑی بہادری سے لڑتے ہوئے جان بحق ہونے کو تسلیم کرتا ہوں۔

[illegible] میں مہاراشٹر کے مورخین بھی روشنی ڈال سکتے ہیں کیونکہ ان کی رائے قابل تصدیق ہو سکتی ہے۔

غزل

حضرت تسکین قریشی

نشاطِ دل کے لئے یہ خیال کم بھی نہیں
کہ تیرے غم کے سوا اور کوئی غم بھی نہیں

وہ میرے دردِ رفاقت کی قدر کیا جانے
جو ہم سفر بھی ہے اور میرا ہم قدم بھی نہیں

میں ہر مقامِ جنوں سے گزر گیا، لیکن
وہاں گرا ہوں، جہاں کوئی پیچ و خم بھی نہیں

کہاں یہ ذکرِ عذاب و ثواب، اے واعظ
کہاں وہ رند جسے ہوشِ بیش و کم بھی نہیں

اک اور دل بھی دھڑکتا ہے میرے دل کے قریب
تمام عمر نہ ہو اب سکوں تو غم بھی نہیں

بنا لیا ہے محبت کو رہنما میں نے
کوئی مقام ہو اب مجھ سے دو قدم بھی نہیں

شکستِ دل ہو مبارک تجھے کہ اے تسکینؔ
ملال ان کو بھی ہے اور مجھ سے کم بھی نہیں

اِنقلاب مصر کا تاریخی پس منظر

شاہ عبد الحمید

ایشیا، افریقہ اور یورپ کے درمیان واقع نہر عظیم الشان جزیرہ کی سرزمین کا نام مصر ہے، جس کی گود میں دنیا کے نیل کی پرسکون و شاداب وادی ہیں کپاس کے خوشنما پھول مسکراتے ہیں، جہاں دیو ہیکل اہرام گذرے ہوئے جلیل القدر بادشاہوں کی عظمت و جبروت کی گواہی دیا کرتے ہیں، جس کی بے پناہ قدرتی دولت، علم و تہذیب کے قدیم مرکز، تجارتی منڈیاں، مذاہب کا سنگم اور مشرق و مغرب کی تجارت کے لئے آسان اور مختصر راستے اور اس کے امراء و سلاطین کے عیش و عشرت کی داستانیں، حسن اور رقص و موسیقی کے افسانے ہمیشہ سے دنیا کے حکمرانوں اور اقتدار پسندوں کے لئے باعث رشک رہے۔ اسی بنا پر جب کبھی کسی نے دنیا کو فتح کرنے کا خواب دیکھا ہے، مصر پر قبضہ اس کے لئے پہلی اور ناگزیر منزل رہا ہے۔ فارس، یونان اور روم کے دور اندیش بادشاہوں نے اس ملک کی جغرافیائی، تہذیبی اور تجارتی اہمیت کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے، عربوں اور ترکوں نے بھی اپنی سلطنت کی توسیع و استحکام کے لئے مصر پر ہمیشہ اپنا تسلط قائم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ ان میں سے جس قوم کے قدم مصر کی سرزمین پر جب تک مضبوطی سے جمے رہے، اس کی عظمت اور وقار پر آنچ نہیں آئی اور جس کا اقتدار یہاں متزلزل ہوا وہ دنیا کی بساطِ سیاست پر بہت دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔

نپولین نے بھی مصر کی اس اہمیت کو پوری طرح تسلیم کر لیا تھا۔ انگلستان کی بحری طاقت کو کمزور کرنے اور ایشیاء و افریقہ کی وسیع دنیا میں فرانسیسی اقتدار کی داغ بیل ڈالنے اور تجارت پھیلانے کے لئے لازمی تھا کہ پہلے مصر فتح کیا جائے جو اس وقت ترکی سلطنت کے ایک صوبے کی

حیثیت سے مملوک پاشاؤں کے زیر قیادت تھا۔ لیکن یہاں کے کارپرداز اپنی سخت گیری اور حکومت میں بدمعالی کی بنا پر عوام اور سلطان دونوں کی نظر میں غیر مقبول تھے۔ پنولین نے مصر کی اس سیاسی ابتری سے فائدہ اٹھایا اور ۱۷۹۸ء میں مصر پر فوج کشی کر کے قبضہ کر لیا۔ اسی وقت سے مصر کی جدوجہدِ آزادی، قوم پرستی اور ترقی کی تاریخ شروع ہوتی ہے۔ پنولین اور اس کے جانشینوں کے خلاف پورا مصر متحد ہوکر اپنی آزادی کے لئے لڑا اور ۱۸۰۱ء میں فرانسیسی فوجوں کو اپنے ملک سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔

آزادی کی اس ابتدائی جنگ میں ترکی اور برطانیہ نے اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر فرانس کے خلاف مصر کی پوری مدد کی۔ ترکی نے اس خیال سے مدد کی کہ سلطنت کا ایک اہم صوبہ [illegible] جا رہا تھا، اور برطانیہ نے اس لئے کہ مصر پر فرانس کا قبضہ ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان میں انگریزی حکومت اور تجارت کو ہر وقت خطرہ لاحق رہے گا۔

مصر کی اس جنگ آزادی میں ترکی فوج میں ایک البانوی سردار محمد علی بھی تھا، جو شروع سے مصری سیاست کے انتشار، گورنروں کی کمزوریوں اور عوام کی محرومیوں کا مطالعہ کر رہا تھا اور اس بات کو پوری طرح سمجھ چکا تھا کہ عثمانی سلطان کا اثر و اقتدار اس صوبہ میں محض برائے نام ہے۔ چنانچہ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ، شجاعت اور حکمت عملی سے عوام اور علماء کا تعاون حاصل کر کے مصر کا گورنر ہو گیا، جسے سلطان نے بھی تسلیم کر لیا۔

مغربی ایشیا کی سیاسی تاریخ میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ عوام نے جمہوری انداز میں اپنی مرضی اور منشاء کے مطابق ایک نااہل اور خودغرض پاشا کو برطرف کر کے کسی دوسرے کو حکومت کی ذمہ داریاں سونپ دی ہوں۔ اس واقعہ کو ہم مصر کی سیاسی بیداری اور قومی تحریک کی ابتدا کہہ سکتے ہیں۔

محمد علی نے مصر پر ۴۴ سال حکومت کی، اس عرصہ میں اس نے اپنی ذہانت، لگن اور حوصلہ مندی سے مصر کو ایک جدید قوم بنا دیا۔ اس نے ملک کی مالی حالت کو سنوارا، فوج کی

تشکیل وتنظیم نئے یورپی ڈھنگ پر کی، بحری فوج کی تربیت اور جنگی سامان کی فراہمی میں خصوصی دلچسپی لے کر مصر کی فوجی طاقت کو اتنا بڑھا دیا کہ اپنی حفاظت کے لئے کسی ملک سے ... گئے، چنانچہ ۱۸۱۵ء میں ... بیہ کے خلاف، ۱۸۲۰ء میں سوڈان میں، ۱۸۱۵ء میں یونان میں اور ۱۸۳۲ء میں شام اور فلسطین کی جنگوں میں محمد علی کی فوجوں نے عظیم الشان معرکے ... یہاں تک کہ ۱۸۴۰ء میں سلطان سے اَن بَن ہو جانے پر مصری فوجیں ترکی کے دارالخلافہ تک پہنچ گئیں اور قریب تھا کہ عثمانی سلطنت سپر ڈال دے کہ برطانیہ اور ... محمد علی کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ ان کے خیال میں ترکی سلطنت کی گدی پر عثمانی بادشاہ کی بجائے ایک غیور، شجاع اور ترقی پسند سلطان کسی صورت میں ... کی تجارت وسیاست کے لئے مفید نہیں ہو سکتا تھا، لہذا محمد علی کو اس شرط پر صلح کرنا پڑی کہ مصر ایک خود مختار ریاست ہوگا جس کی حکمرانی محمد علی کے خاندان میں موروثی ہوگی ... مصر اب ایک ماتحت صوبے کی بجائے ایک خود مختار ریاست تسلیم کر لیا گیا۔

اس کے علاوہ محمد علی نے عوام کی معاشی اور تہذیبی حالت کو سدھارنے کے لئے نصاب تعلیم میں جدید سائنسی علوم شامل کئے اور ذہین نوجوانوں کو تعلیم وتربیت کے لئے یورپی ممالک میں بھیجا، اور صنعت وحرفت کو بڑھانے کے لئے کارخانے اور فیکٹریاں قائم کیں، زراعت کی بہتری کے لئے آب پاشی کا معقول انتظام کیا اور بڑے پیمانے پر روئی کی کھیتی کے لئے سرکار نے خود زمینیں حاصل کر لیں۔

لیکن بعض مورخین کا خیال ہے کہ ترقی وبہبود کے یہ تمام کام، ملک کی طاقت بڑھانے کے یہ تمام منصوبے محمد علی نے اپنی ذاتی طاقت واقتدار کی مضبوطی کے لئے بنائے تھے، عوام کو اگرچہ اس سے فائدہ پہنچا اور ملک نے بہ حیثیت مجموعی ترقی کی، لیکن دراصل وہ ایک شاندار سلطنت قائم کرنے اور ایک عظیم فاتح کہلانے کے خیال سے یہ سب کر رہا تھا۔ ۱۸۴۹ء میں محمد علی کے انتقال کے بعد مصر کو کوئی لائق اور ہمدرد حکمراں نہیں

ل سکا۔ اس کے تمام جانشینوں نے اپنی نااہلیت، خود غرضی اور عیش کی خاطر ملک کی آزادی وناموس کو یورپی اقوام کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ عباس اول نے اپنی سخت گیری اور رجعت پسندی کی بنا پر ترقی و تعمیر کے تمام منصوبے منسوخ کر دیئے، اسکول اور کارخانے بند کر دیئے لیکن اس کے جانشین محمد سعید نے اس کے برخلاف یورپی باشندوں کو مراعات دیں، ان کی تہذیب و تصورات کو سراہا، یہاں تک کہ ۱۸۵۴ء میں ایک فرانسیسی دوست ڈی لیسپ کو نہر سوئز کی تعمیر کا ٹھیکہ دے دیا، جبکہ مصر کے سابق حکمران ہمیشہ اس پروجیکٹ کی مخالفت کرتے آئے تھے اور ڈرتے تھے کہ اس نہر کی تعمیر سے مصر کی آزادی کو ہمیشہ سخت خطرہ لاحق رہے گا، اور تاریخ نے اسے سچ ثابت کر دکھایا۔

نہر سوئز کی تعمیر کے ساتھ مصر میں فرانس کے اثرات بڑھنے لگے، چنانچہ برطانیہ نے اس کی سخت مخالفت کی اور ہر ممکن کوشش کی کہ نہر کی تکمیل نہ ہو سکے، لیکن جب نہر بن گئی، اور ۱۸۶۹ء میں جہازرانی کے لئے باقاعدہ کھول دی گئی تب انگلستان نے اس کی اہمیت کا اندازہ لگایا کہ اس کے ذریعہ یورپ اور ایشیا کے درمیان سمندری راستے میں تقریباً پانچ ہزار میل کی کمی ہو جاتی ہے۔ تجارتی سامان کی سہل آمدورفت کے علاوہ ہندوستان اور افریقہ کی نوآبادیات کی پوری طرح حفاظت کی جا سکتی ہے، چنانچہ اس اہم بحری راستے پر کنٹرول حاصل کرنا برطانوی حکمت عملی کا ایک بڑا مقصد بن گیا۔ اور یہ کام سعید اور اسمٰعیل کی عشرت پسندی، فضول خرچی اور قرض خوری نے بہت آسان کر دیا۔ اپنے محلآت کی آرائش، سیر وسیاحت اور تجدید مصر کے مبہم خاکوں میں مغربی تہذیب کے رنگ بھرنے کے منصوبں کے لئے اس قدر قرض لیا کہ اس کی ادائیگی اور حکومت کی ضروریات کے لئے اسمٰعیل کو اپنی رعایا سے کئی کئی سال کا پیشگی لگان لینا پڑا۔ لیکن جب اس سے بھی خزانے کی حالت میں کوئی بہتری نہ ہو سکی اور مزید قرض ملنے کا امکان نہیں رہا تو مجبوراً نہر سوئز کمپنی میں مصر کے "حصے" کم قیمت پر فروخت کرنا پڑے جنھیں برطانیہ نے فوراً ہی خرید لیا۔ ان حصوں کے ساتھ گویا پورا ملک بک گیا۔ انگریزوں نے فوراً ہی اپنے قرض کی واپسی کے لئے شاہی خزانے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر ترکی سلطان پر دباؤ ڈال کر اسمٰعیل پاشا کو برطرف کرا دیا اور اس کی جگہ توفیق کو مصر کا خدیو (گورنر) مقرر کرا دیا، جو ہمیشہ ان کے ہاتھ میں

کٹھ پتلی بنادیا۔ یہاں تک کہ جب ملک کے داخلی و سیاسی معاملات میں بڑھتے ہوئے انگریزوں کے ناجائز مداخلت کے خلاف کرنل عرابی پاشا نے احتجاج کیا تو اس نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔

سنہ ۱۸۸۲ء میں انگریزوں کی منظم داخلی فوجی طاقت نے کو عرابی کی تحریک آزادی کو کچل دیا، اور مصر کا مکمل انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا، لیکن آزادی کی لگن بدستور باقی رہی، جائز حقوق اور انصاف کے لئے جو آواز اٹھی تھی وہ اگرچہ وقتی طور پر دب گئی لیکن حریت کا جذبہ تیز سے تیز تر ہوتا گیا، مصری عوام لارڈ کرومر کی تعلیمی اور معاشی اصلاحات کے باوجود اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے، یہاں تک کہ انہی میں ایک رہنما پیدا ہوا جس کی شجاعت اور دانشمندی نے تحریک آزادی کو باقاعدہ منظم کیا اور دشمنوں کے خلاف صف آرا ہو گیا۔ جولائی سنہ ۱۹۵۲ء کا "شاندار انقلاب" جس نے محمد علی کے خاندان کے آخری تاجدار شاہ فاروق کو ملک بدر کردیا اور صدیا سال کی غلامی سے ملک کو آزاد کیا، کرنل ناصر اور ان کے ساتھیوں کی حب الوطنی اور قوم پرستی کی مثال ہے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کی وجہ سے انگریزوں نے مصر پر اپنے قبضہ کو باقاعدہ قانونی شکل دے دی تھی۔ گویا اس وقت تک مصر ترکی سلطنت کا ہی ایک خودمختار صوبہ تھا، لیکن جنگ عظیم میں چونکہ ترکی انگریزوں کے خلاف جرمنی کے ساتھ تھا، اس لئے مصر کو برطانوی تاج کے زیرنگرانی (PROTECTORATE) رکھا گیا، اور یہ وعدہ کیا گیا کہ جنگ کے اختتام پر مصر اور دیگر عرب علاقوں کو عثمانی سلطنت سے علیحدہ کرکے آزاد قومی حیثیت دی جائے گی، چنانچہ اسی امید پر شریف مکہ کی قیادت میں انھوں نے ترکی کے خلاف جنگ کی، اور بلاشبہ یہ عربوں کے ہی تعاون کا نتیجہ تھا کہ مغربی ایشیاء اور افریقہ کے محاذ پر انگریزوں کو فتح نصیب ہوئی۔ لیکن جنگ کے ختم ہونے پر انگریزوں نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اور مصر پر اپنا کنٹرول پہلے سے زیادہ مضبوط کردیا۔ چنانچہ آزادی کے خواب کو یوں مٹتا دیکھ کر مصری عوام کی بے چینی بہت زیادہ بڑھ گئی، معاشی بحران، بےروزگاری اور آزادئ فکر و خیال پر کڑی پابندیوں سے تنگ آکر عوام نے تخریبی کاروائیوں کا سہارا لیا اور سارا ملک سعد زغلول پاشا کی

قیادت میں متحد ہوگیا۔ جوں جوں انگریز کا ظلم بڑھتا گیا ویسے ویسے قومی تحریک میں شدت پیدا ہوتی گئی ادھر جنگ کے اختتام پر خود حکومت برطانیہ میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ اپنے مقبوضات کی ایسے مخالف حالات میں حفاظت کر سکتی، چنانچہ سنہ ۱۹۲۲ء میں حسب ذیل شرائط کے ساتھ مصر کی آزادی کو تسلیم کرنا پڑا۔

۱۔ مصر کی بیرونی حملوں سے حفاظت۔

۲۔ برطانوی مفادات کی نگرانی۔

اور ۳۔ اقلیتوں کے حقوق کی ذمہ داری برطانیہ پر ہوگی۔

۴۔ سوڈان کی آزادی یا مصر سے الحاق کا مسئلہ فی الحال جوں کا توں رہے گا۔

ان شرائط سے اگرچہ مصر کی آزادی بہت محدود ہو جاتی تھی لیکن مصر نے انھیں منظور کر لیا کہ مکمل آزادی کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

مشروط آزادی کے اس اعلان کے بعد مصر کو امید تھی کہ ملک میں عدل و انصاف رائج ہو سکے گا اور حکومت جمہوری دستور کی روایات کے مطابق کام کرے گی۔ مگر اس امید پر فواد اول کے رویہ سے اوس پڑ گئی۔ فواد ایک ڈکٹیٹر بننے کے خواب دیکھنے لگا۔ اور اپنے جد امجد محمد علی کے انداز میں حکمرانی کے منصوبے بنانے لگا۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء میں اس نے دستور میں ایسی تبدیلیاں کر دیں، جس کی وجہ سے تمام اہم اختیارات سمٹ کر اس کے ہاتھ میں آگئے۔ وفد پارٹی نے جو ۱۹۱۹ء میں سعد زغلول کی سرپرستی میں قائم ہوئی تھی اور اس وقت سے جنگ آزادی کی رہبری کر رہی تھی، فواد کے ان منصوبوں کی مخالفت کی، لہذا بادشاہ اور وفد میں اقتدار کے لئے جنگ آزمائی ہوتی رہی بادشاہ کو انگریزوں کی سرپرستی حاصل تھی تو وفد کو عوام کی حمایت۔ مگر سنہ ۱۹۲۷ء کے بعد وفد کا زور و اقتدار جاتا رہا۔ لیکن سنہ ۱۹۳۶ء کے بعد نحاس پاشا کی قیادت میں وفد کو ایک بار پھر عروج حاصل ہوا، اور انگریزوں نے پھر وفد سے مصالحت کو بہتر سمجھا۔

سنہ ۱۹۳۹ء کے اوائل میں دنیا کو پھر ایک بار جنگ کی تباہیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ ہٹلر اور

... جنگی اسکیموں میں مصر کی جغرافیائی اہمیت کا برطانیہ کو خوب اندازہ تھا۔ ایشیاء اور افریقہ
فوجی کیمپ قائم کرنے، روس کو رسد پہنچانے اور فوجوں کی تیز نقل و حرکت کے لئے نہر سوئز اور مصر کے
ہوائی اڈوں پر کنٹرول ناگزیر تھا ... کے کبھی حاصل نہیں ہو سکتا تھا، چنانچہ برطانیہ
نحاس پاشا کے مطالبوں کو منظور کر لیا جو حسب ذیل تھے۔

(۱) برطانیہ مصر کی مکمل آزادی کو تسلیم کرے۔

(۲) سارے ملک میں پھیلی ہوئی برطانوی فوجوں کو صرف نہر سوئز کے علاقے میں محدود کیا جائے
جن کی تعداد دس ہزار سپاہی اور چار سو ہوا باز وں سے زیادہ نہ ہو۔

(۳) لیگ آف نیشنز میں مصر کی نمائندگی کا وعدہ کیا جائے۔

(۴) یورپی باشندوں کو جو قانونی، سماجی اور مالی مراعات (CAPITULATIONS)
حاصل ہیں وہ ختم کی جائیں۔

(۵) اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی مصری حکومت پر چھوڑ دی جائے۔

(۶) سوڈان میں مصریوں کو داخل ہونے اور ملازمت و تجارت کرنے کے حقوق بحال کئے
جائیں جو ۱۹۲۴ئہ میں سوڈان کے گورنر جنرل لی لیسٹک کے قتل کی سزا میں سلب کر لئے
گئے۔

(۷) جنگ کے بعد جلد از جلد مصر سے برطانوی فوجیں ہٹائی جائیں۔

یہ معاہدہ مصر کی مکمل آزادی کی طرف دوسرا یقینی قدم تھا جس کا سہرا نحاس پاشا کے سر رہا
اور عوام میں وفد پارٹی کی مقبولیت اور بڑھ گئی۔ یہ امر شاہ فاروق کے لئے ناگوار تھا۔ چنانچہ
نحاس پاشا کو برطرف کر دیا گیا ــــ دربار اور وفد کے درمیان اس سیاسی رسہ کشی نے ملک کی سیاست
کو پیچیدہ بنا دیا۔ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں وفد کی قدر گھٹ رہی تھی، اور فاشسٹ اثرات
بڑھ رہے تھے، ایک بڑے طبقہ میں اخوان المسلمون کے اثرات پھیل رہے تھے اور کچھ کمیونزم کی طرف
بڑھ رہے تھے، گویا سیاسی یکجہتی جو سعد زغلول کے وقت قومی تحریک کے لئے مشعل راہ تھی اب مفقود

ہو چکی تھی، ادھر جرمنی اور اس کے ساتھیوں کی بڑھتی ہوئی فتوحات کے پیش نظر مصر میں بدامنی اور مخالفت برطانیہ کے لئے مضر تھی، چنانچہ اس نے فوج کشی کی دھمکی دے کر فاروق کو مجبور کیا کہ نحاس پاشا کو دوبارہ وزیر اعظم مقرر کیا جائے، چونکہ نحاس پاشا اس وقت اصولی طور پر برطانیہ سے مصر کا تعاون منظور کر چکے تھے اور عوام میں ان کی مقبولیت باقی تھی اور پوری عرب دنیا کو متحدہ کرنے میں بڑی حد تک مدد دے سکتے تھے، اس لئے برطانیہ کی کوشش اور مصر کی دلچسپی کے باعث عرب لیگ کے نام سے ۱۹۴۵ء میں ایک انجمن قائم کی گئی، جس میں مصر کو ایک ممتاز حیثیت حاصل تھی اس کی وجہ سے تمام مغربی ایشیا میں مصر کے وقار کی دھاک بیٹھ گئی۔ لیکن ملک کی داخلی سیاست میں انتشار ہنوز باقی تھا، وفد اور بادشاہ کے درمیان طاقت آزمائی اب بھی جاری تھی، بادشاہ ہر دم اسی فکر میں رہتا کہ وفد کی ساکھ کو کسی طرح عوام کی نظروں سے گرا دیا جائے۔ چنانچہ ۱۹۴۴ء میں جب جنگ اختتام پر تھی اور برطانیہ کو اپنی فتح کا یقین ہو چکا تھا اور اسی کے ساتھ مصر کی سیاست میں دلچسپی بھی کم ہو گئی تھی، شاہ فاروق نے وفد پارٹی پر بدعنوانیوں کا الزام لگا کر نحاس پاشا کو برطرف کر دیا اور ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بن بیٹھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی سیاست نے ایک نیا موڑ لیا۔ کمیونسٹ روس اور مغربی یورپ کے ممالک میں نظریاتی اختلافات کی بنا پر کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اہل مغرب کے خیال میں روس جو کل تک ان کے دوش بدوش جرمنی و جاپان کے خلاف لڑ رہا تھا، آج خود آزادی اور جمہوریت کے لئے جرمنی سے زیادہ خطرناک ثابت ہو رہا تھا، ادھر روس "آزاد دنیا" کو سامراجیت اور سرمایہ پرستی کا الزام لگا کر دنیا کو معاشی آزادی اور مساوات کی امید دلا رہا تھا۔ چنانچہ اسی تنازعہ کی بنا پر دنیا دو گروہوں میں بٹ گئی اور ہر دو طاقتیں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگیں۔ گویا "سرد جنگ" شروع ہو گئی۔

سرد جنگ کے اس ماحول میں مصر ایک بار پھر اپنے مخصوص جغرافیائی محل وقوع اور عرب دنیا کے لیڈر ہونے کی حیثیت سے امریکہ اور یورپ کے لئے بہت اہم ہو گیا۔ چنانچہ اس صورت حال میں

جبکہ روس ایشیاء اور افریقہ میں اپنے سیاسی رجحانات پھیلانے کی تگ و دو میں تھا، ایران کے بعض علاقوں سے اپنی فوجیں بھی ہٹانے کو تیار نہیں تھا، ترکی، یونان اور شام میں کمیونسٹ تحریکوں کو ہوا دے رہا تھا انگریزوں نے نہ صرف یہ کہ نہر سویز کو خالی کرنے کے ... فوجیں بھیج کر اپنی دفاعی طاقت کو کئی گنا بڑھالی، اور سوڈان کی آزادی کا مسئلہ بھی التوا میں ڈال دیا۔

برطانیہ کا یہ اقدام مصریوں کی غیرت اور آزادی کو ایک چیلنج تھا، چنانچہ ... اور فسادات ہونے لگے۔

ابتداء میں یہ غم و غصہ محض انگریزوں کے خلاف تھا، لیکن بعد میں جب ... اروق کی بدعنوانیوں بدکرداریوں اور جنگ فلسطین میں جنگی سامان میں غبن اور بے ایمانیوں کا راز کھلا تو وہ اس سے بدظن ہوگئے، پھر جب مشتعل عوام کو قابو میں کرنے کے لئے فاروق نے فوج کے اندرونی معاملات اور انتظامات میں مداخلت کرنا چاہی تو فوج بھی مخالف ہوگئی۔

سال ۱۹۵۱ء کے اختتام تک بدامنی ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی، انگریزوں کے خلاف غصے نے انتقام کی شکل اختیار کرلی اور ان کی جان و عزت خطرے میں پڑ گئی۔ اخوان، وفد اور کمیونسٹ سب اپنے اختلافات بھول کر قومی غیرت اور ناموس کی خاطر متحد ہوگئے اور انگریزوں کے فوجی کیمپوں پر گوریلا حملے شروع کر دیئے، جسے پسپا کرنے کے لئے جنرل آرسکن کے ٹینک سواروں نے اسماعیلیہ میں مصری فوج کے ایک کیمپ پر حملہ کرکے سینکڑوں مصریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس حادثے کی خبر نے سارے مصر کو چراغ پا کر دیا۔ ارسکن کی اس بربریت کا بدلہ قاہرہ کی گلیوں اور بازاروں میں یورپی باشندوں سے لیا جانے لگا۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوگیا۔ سرکاری عمارتیں، اور دکانیں، کلب، ہوٹل اور سینما آگ کے شعلوں میں ڈھیر ہوگئے۔ ہر طرف لاشوں کے تعفن اور خاکستر عمارتوں کے دھوئیں سے فضا بوجھل ہوگئی۔

ابتداء میں ان فسادات کو وفد اور دربار دونوں نے ایک دوسرے کی دشمنی میں نظرانداز کیا، دونوں اس بدامنی و انتشار کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے رہے۔ وفد نے یہ بھی سوچا تھا کہ ان

فسادات سے انگریزوں پر نہر کے انخلاء کے لئے دباؤ پڑے گا، لیکن اب یہ آگ اتنی بڑھ چکی تھی کہ دونوں کے قابو سے باہر تھی۔ چنانچہ کرنل ناصر کی قیادت میں فوج نے امن قائم کرنے کی ذمہ داری سنبھالی اور ملک کو بدمعاملہ و بدکردار بادشاہ اور خودغرض، نکمے سیاست دانوں کے چنگل سے نجات دلانے کا بیڑا اٹھایا۔

۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کا شاندار انقلاب مصر میں ایک نئے دور کا آغاز ثابت ہوا۔ کرنل عرابی اور سعد زغلول کی عظیم قربانیوں اور آزادی کے خواب کی تعبیر تھا۔ انقلاب کے بانیوں نے فاروق اور اس کے آباد اجداد کے مظالم سے دبے ہوئے عوام اور سیاسی کش مکش سے تھکے ہوئے ملک کو پرسکون اور خوش حال زندگی کی امید دلائی اور جمہوری طرز حکومت کا پیغام سنایا جس میں آزادئ فکر و خیال کے ساتھ زمینداری نظام میں اصلاحات، دولت کی مساوی تقسیم اور سوڈان و نہر کے قضیے کے تصفیہ کا یقین دلایا۔

ابتداء میں کرنل ناصر نے پس پشت رہ کر ایک بزرگ شخصیت جنرل نجیب کو انقلاب کی رہنمائی سونپی اور علی ماہر کو وزیر اعظم مقرر کیا۔ لیکن کچھ ہی عرصہ بعد انقلاب کے تقاضوں وعدوں کی تکمیل پر انقلابی کمیٹی اور جنرل نجیب میں اختلافات پیدا ہو گئے۔ جنرل نجیب فوراً ہی ایک پارلیمانی حکومت کی تشکیل چاہتے تھے، لیکن "انقلاب کمیٹی" کی رائے میں عوام ابھی ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھے، ملک میں وفد و اخوان کے علاوہ کوئی اور منظم سیاسی جماعت نہیں تھی، ایسے حالات میں پارلیمنٹ قائم کرنے کا مطلب تھا کہ حکومت ان میں سے کسی کی ہو، جبکہ ان میں ایک پارٹی عوام کی نظر میں اپنا وقار کھو چکی تھی اور دوسری کے نظریات بدلتے ہوئے وقت اور سماج کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ اس کے علاوہ پارلیمنٹ قائم ہونے کی صورت میں پرانا جاگیردار طبقہ پھر سے برسر اقتدار آجاتا اور ترقی و اصلاحات کے تمام منصوبے خاک میں مل جاتے اور نہ مصر کی سرزمین سے یورپی فوجیں ہٹائی جا سکتیں تھیں اور نہ سوڈان کی آزادی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا۔ اس لئے انقلاب کے ۱۹ مفقود کو تکمیل کر

کرنل ناصر نے جنرل نجیب اور علی ناصر کو ان کے عہدوں سے سبکدوش کر کے حکومت کی زمام کار سنبھال لی۔

مصر آج جو کچھ ہے وہ صدر ناصر کی انتھک اور بے لوث کاوشوں کا ثمرہ ہے، جولائی ۱۹۵۲ء سے اب تک کئی بار مصر موت وحیات کی کش مکش سے دوچار ہوا ہے، مگر ہر بار صدر ناصر نے دانش مندی اور حوصلہ مندی کا ثبوت دیا اور دشواریوں اور مخالفتوں کے باوجود انقلاب کی روح کو تازہ رکھا، اور ترقی وخوش حالی کے ساتھ مصری عوام کی عزت اور وقار کو اور بلند کیا۔

آج مغربی ایشیا کی سیاست میں مصر کو جو نمایاں حیثیت حاصل ہے وہ صدر ناصر اور ان کے پُرخلوص ساتھیوں کی قربانیوں کا انعام ہے۔ مصر پہلے بھی اپنی جغرافیائی، تجارتی اور تہذیبی مرکزیت کی بنا پر دنیا کی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتا تھا اور آج بھی رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت مغربی ایشیا میں اپنے سیاسی، تجارتی اور دفاعی مفاد کے لئے مصر کی دوستی کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔

رسالہ نقیب مرحوم

جناب دیریندر پرشاد سکسینہ بدایونی

[illegible] پہلا شمارہ فروری ۱۹۱۹ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا تھا [illegible] کے سرورق پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" مولانا وحید احمد اس کے [illegible] ایڈیٹر تھے۔ آپ اس زمانے میں ادبی حلقوں میں ڈبلو احمد کے نام سے مشہور [illegible] [illegible] علی مرحوم کی نگرانی اور سرپرستی میں نکالا گیا تھا اور اس کے قلمی معاونین میں سلطان حیدر جوش، عظمت اللہ خاں، قمرالدین، چودھری محمد علی ردولوی، آصف علی، ڈاکٹر سید محمود، [illegible] بدایونی جیسے مشاق اور مشہور ادیب شامل تھے۔ نقیب نکالنے کا خاص مقصد سنجیدہ ظرافت تھا جو ہندوستان میں صحیح معنی میں اس وقت نایاب تھی۔

نقیب نظامی پریس سے تین ماہ تک شائع ہوتا رہا، اس کے بعد وحید احمد صاحب نے خود رسالے کے نام پر نقیب پریس قائم کیا اور یہ رسالہ اس پریس سے شائع ہونے لگا۔ نقیب پریس کا دفتر پہلے صدر بازار بدایوں میں سید محمد صاحب عرف میکو میاں کے گودام میں رہا، اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں سول لائن بدایوں کی اس کوٹھی میں منتقل ہو گیا جو اس وقت علی مقصود صاحب سابق چیرمین میونسپل بورڈ کی ملکیت تھی مگر اب فروخت ہو چکی ہے رسالہ کے ساتھ پریس بھی [illegible] کوٹھی میں اٹھ گیا۔ ۱۹۲۱ء میں پریس اور دفتر دونوں شیخوپورے میں منتقل کئے گئے اور جنوری ۱۹۲۲ء میں نقیب بند ہو گیا۔

فروری ۱۹۱۹ء سے جنوری ۱۹۲۲ء تک نقیب کے صرف چھتیس شمارے شائع ہوئے، درمیان میں ایک رسالہ بند رہا۔ مکمل فائل وحید احمد صاحب کے پاس موجود تھا لیکن ان کے بھائی سلطان حیدر جوش ان سے مطالعہ کے لئے لے گئے، مگر اپنی زندگی میں واپس نہ کر سکے، اب معلوم

نہیں کہ اس مکمل فائل کا کیا حشر ہوا۔ نقیب پریس سے کلیات اکبر" حصہ سوئم، ابن مسلم، سلیمان جوش، دیوان فانی بدایونی، مجلے، مصنفہ عظمت اللہ خاں، اسرار بیگم کی سازش مصنفہ ماز دار ... رفیع احمد قدوائی تھے اور اس وقت [illegible] شائع ہوئیں۔ نقیب" کے فروری ۱۹۱۹ء کے شمارے [illegible] سوچیاسی، کے عنوان سے وحید احمد صاحب [illegible]

"نقیب" محض ایک ماہواری رسالہ ہے اور رسالے نہایت [illegible] ہیں، لاکھوں وجود میں آئے، ہزاروں فنا ہوگئے۔ سینکڑوں باقی ہیں اور [illegible] میں آئیں گے [illegible] ہیں اور اگر باعث مایوسی ہوں تو نظام دنیا بدل جائے [illegible] راہ دشوار گزار [illegible] اسی قدر جوش بڑھ جاتا ہے۔ ناکامیاں ناامیدی پیدا کرنے کے لئے سبق آموز ثابت ہوتی ہیں"۔

"نقیب" حرکت شوقیہ کا نتیجہ ہے اور تجارتی اصول پر نکالا گیا ہے۔ تجارتی اصول کے یہ معنی ہیں کہ رسالہ خود اپنا کفیل ہوکر اپنی ہستی کو قائم رکھ سکے۔ مصارف کے بعد واقعی جو قیمت ہونا چاہیئے وہی اس کا سالانہ چندہ ہے، مالی منفعت قطعی مقصود نہیں، زیادتی اشاعت سے وہ خود پروان چڑھے گا۔ اشاعت سے یہ مراد ہے کہ یہ ایک ذات واحد کا شوق ہے اور وہی ذات [illegible] کہ یہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو اس کا بار اپنے سر لیتی ہے۔ ہر کوشش میں خیال خود نمائی سمجھ لینا دستور زمانہ ہے مگر تعمیل شوق میں نام و نمود کا خیال پیدا [illegible] ہو سکتا، اظہار نام و نمائش کسی طرح بھی مقاصد میں شامل نہیں لیکن اگر کامیابی نے تمغۂ شہرت دیا تو یقینی قابل فخر ہوگا اس سے انکار کرنا تصنع و خود نمائی کی دلیل ہے۔

اجرا کا خیال اس وقت دماغ میں آتا ہے جبکہ دنیا تذبذب میں ہے یکسوئی مفقود ہے اور تمام دشواریاں مجتمع ہوکر حائل راہ ہوگئی ہیں۔ کاغذ کی گرانی اور چاندی کی ارزانی تاریخ عالم میں یادگار رہے گی۔ روپیہ روپیہ کے نوٹ اس بات کا ثبوت ہیں کہ کاغذ چاندی کے بھاؤ ہے چنانچہ

شک کرنے کی قطعی گنجائش نہیں کہ "نقیب" چاندی کے ورقوں پر شائع کیا جاتا ہے"

نقیب زیور طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر اس وقت حاضر ہوتا ہے جبکہ اطمینان کی امید ہے تزلزل دور ہوجانے کا خیال ہے اور خوشی و خرمی ہر دل میں جھلک رہی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو نقیب "مژدہ بہار لاتا ہے اور اسم بامسمیٰ ہے"

رسالہ نقیب میں سیاست حاضرہ پر ظریفانہ انداز میں مضامین لکھے جاتے تھے۔ سوشل ادبی اور تاریخی مضامین اور نظمیں وحید احمد صاحب خاص نقیب کے لئے اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں سے لکھواتے تھے

نقیب "نئی سیاست وطنی کا علم بردار تھا جو اب انگریزی حکومت کے ساتھ انگریزی تہذیب سے بھی بیزار ہو چلی تھی۔ نقیب میں اس وقت کی سیاست کے متعلق کافی مضامین ملتے ہیں وحید احمد صاحب نے اپنے رسالے کے ذریعہ قومی تحریک کو کافی تقویت پہنچائی۔ اس زمانے میں جبکہ انگریز کی مخالفت کرتے ہوئے ہمت والے لوگ بھی گھبراتے تھے۔ آپ نے نقیب کا ایک خاص نمبر جنوری سنہ ۱۹۲۰ء میں "علی برادر نمبر" نکالا۔ اس نمبر کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وحید احمد صاحب کی رگ رگ میں قومی درد تھا اس خاص نمبر میں قاضی عبدالغفار، مولانا محمد علی، سلطان حیدر جوش، میر محفوظ علی اور خود وحید احمد صاحب کے مضامین شامل ہیں۔ نقیب میں کلام اکبر پر ایک نظر" کے عنوان سے مولوی قمرالدین مصنف بزم اکبر کے مضامین کا ایک سلسلہ لگاتار پانچ سات شماروں میں شائع ہوا۔ قمرالدین صاحب کو اکبر کی ذات اور کلام دونوں سے عقیدت ہے اور یہ مضامین اس عقیدت کے مظہر ہیں۔ عظمت اللہ خاں نے "روغن قاز" کے عنوان سے نہایت ہی دلچسپ اور لطیف پیرایہ میں مضامین لکھے ہیں جو جدت اسلوب، معنی آفرینی اور خوش فکر ظرافت کے نمونے ہیں۔

شعرا کو دیکھیے تو شفق رضوی، آزاد سبحانی، کشن پرشاد، کیفی چڑیاکوٹی، فانی بدایونی، حسرت موہانی، اقبال، اکبر الہ آبادی، امیر بدایونی، عزیز لکھنوی، ثاقب بدایونی، تولا بدایونی، مولانا محمد علی

اور آصف علی جیسے ممتاز ادیبوں کے نام نظر آئیں گے۔ مولانا آزاد سبحانی اور آصف علی کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا صرف پرانے رسالوں میں ان مشاہیر و مجاہدین کی نظموں اور غزلوں کی زیارت ہو جاتی ہے۔ آزاد [illegible] کے ممتاز غزل گو تھے اور آصف علی کی نظموں میں بڑی پختگی، شگفتگی اور روانی ہے۔ آصف علی مرحوم کی قومی اور وطنی شاعری پر الگ مقالہ لکھنے کا خیال ہے اس لئے صرف مولانا آزاد سبحانی کے نمونۂ کلام پر اکتفا کرتا ہوں۔

ہے زباں والوں میں چرچا کہ کوئی دل نہ رہا	اہلِ دل کہتے ہیں باقی کوئی بے دل نہ رہا
اٹھ گیا خلق سے اب لطفِ محبت افسوس	آپ کی تیغِ محبت کا وہ گھائل نہ رہا
سن کے یہ طعن کہ ہے قحط کرم کا بولے	دینے والے تو بہت ہیں کوئی سائل نہ رہا
رسمِ ظاہر پہ ہیں اصل تعلق موقوف	تجھ کو بھولا رہا لیکن کبھی غافل نہ رہا
حشر انگیز ہیں ہر سمت زبانی دعوے	صفحۂ ارض پہ شاید کوئی عاقل نہ رہا
لگ گئی [illegible] تعزیر پہ مہر آخر کار	کیا زمانے میں کوئی مفتیٔ کامل [illegible]
معرکے سخت پڑے ہیں سروتن کے کتنے	شکر شرمندہ ہیں خنجر قاتل [illegible]
آبرو رہ گئی آ[illegible] تماشائی تھی	زیرِ تیغ آپ کا سر باختہ بسمل نہ رہا
مجمعِ [illegible] تھا کبھی سامانِ نشاط	دلِ پژمردہ اب ان قصوں پہ مائل نہ رہا
مٹ گیا مامنِ تسکین میری امیدوں کا	کہہ دو موجوں سے نہ ابھریں کہ وہ ساحل نہ رہا

[illegible] میں آزاد ہوں سچ مچ کہ کوئی قید نہیں
پردۂ وہم بھی اب بیچ میں حائل نہ رہا

اے سینۂ خالی، دل بینا نہیں ملتا	اس گھر کا جو سرمایہ کل تھا نہیں ملتا
خورشید تو ہر ذرہ میں ہے محوِ تماشا	اے وائے کوئی دیکھنے والا نہیں ملتا
صحرا میں کنول کھل کے یہ کرتا ہے اشارہ	گھر بیٹھنے والوں کو تماشا نہیں ملتا
بندوں کو خدا، تیرے نہ ملنے کا ہے شکوہ	اور تجھ کو شکایت کوئی بندہ نہیں ملتا

سچ ہوگی شکایت تری پر یہ تو بتا دے　　　قطرہ نہیں ملتا ہے کہ دریا نہیں ملتا

رسالہ نقیب" کے بارے میں چند ممتاز ادیبوں کی رائیں ملاحظہ ہوں:

مولانا احسن مرحوم زمانہ جون ۲۲ ۱۹ء میں رقم طراز ہیں:

بدایوں کا یہ ادبی چاند اب کی مرتبہ شیخو پور ضلع بدایوں کے افق پر نور سے طلوع ہوا ہے وہی شان حسن، وہی ادب نوازی، وہی جلوہ نمائی، وہی سنجیدہ ظرافت، وہی سحر طرازی جو اس کی شعاعوں میں پہلے تھی اب بھی ہے۔ شائقین ادب اگر متانت میں ظرافت اور ظرافت میں متانت کا جلوہ دیکھنا چاہتے ہیں تو رسالہ نقیب کا مطالعہ کریں"۔

پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم اڈیٹر صبح امید" فرماتے ہیں:

نقیب نامی ایک رسالہ بدایوں سے نکلتا ہے۔ اس میں ۴۸ صفحات ہوتے ہیں۔ اس کے ایڈیٹر مولانا وحید احمد ہیں۔ ادبی مضامین اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مقالے نہایت خوب ہوتے ہیں"۔

مولانا یعقوب بخش راغب بدایونی مرحوم نے رسالہ نقیب" پر ایک مقالہ لکھا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

"کل صبح میں مطالعہ کے کمرے میں بیٹھا تھا کہ ناگہاں نقیب پہنچا۔ مجھے مبحث کذب الحواس سے کسی قدر دلچسپی ہے اس کا واقعی صحیح اندازہ کچھ وہی دماغ کر سکتے ہیں جو مانٹیگو، کے استعفا کو سویلینیوں کا اعلان شاہی مانتے ہیں، لیکن غیر واقعی صحت کے ساتھ بلا خوف و دید کہہ سکتا ہوں کہ میں ایک نظر نقیب کو دیکھ کر کچھ اور سمجھا اور کیا سمجھا۔ نقیب ہے مگر پرانا لیکن نہ اس طرح جیسا کہ متقدمین پرانی روح حکومت کو نئے قالب اصلاحات میں دیکھ کر آزادی ہند کا جسم و جان ملتے ہیں اور نہ تجدد امثال کے قائل۔ سکرٹری صاحب ریفارم لیگ کی طرح کہ وعدوں کو اب بھی وعدہ جانتے ہیں۔ نگاہوں پر یہ عالم ایسا ہی

ازلی وابدی تھا جیسی اہل ہند کی نااہلی۔ لیکن مطبوعہ نقیب پریس شیخوپور آر کے آربد ایول دیکھتے ہی جہالت علم کے تمام پردے اٹھ گئے اور اب وہ صاف آنکھوں کے سامنے تھا جو آج سے بہت ایک سال کچھ دن [illegible] سول لائن یعنی سرکاری رقبہ آبادی سے ایسا [illegible] حالات کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ جانے والے بالفاظ دیگر اس کا قالب جو بیں [illegible] عجب اتفاقیہ خیریت سے گھر پلٹے تو کاندھے کے درد کی شکایت کے ساتھ واپس آجانے کا شکر ایسی بلند آہنگی سے کرتے تھے جیسے کوئی [illegible] دی کا وعظ سن کر آتا ہے اور حادثہ جانکاہ دہراتا ہے۔

(نقیب مئی ۱۹۲۲ء)

تعلیمی مسائل

بین الاقوامی مفاہمت

نیویارک یونی ورسٹی کی طرف سے بین الاقوامی مفاہمت کو فروغ دینے کی غرض سے امسال ایک سمینار کا انتظام کیا گیا ہے۔ اس سمینار کے تحت ۷ جنوری ۱۹۶۳ء کو دہلی میں ایک پنج روزہ کانفرنس منعقد ہوئی۔ اسی سلسلہ میں ایک چار روزہ کانفرنس ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء کو بمبئی میں ہوئی تھی اور بنارس مدراس میں بھی جنوری کے مہینے میں ہی یک روزہ کانفرنس کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی ان کانفرنسوں کے علاوہ نیویارک میں بھی سمینار کے آغاز و اختتام پر ایک ایک جلسہ پروگرام میں شامل ہے۔ اس طرح ہندوستان اور امریکہ کے تعلیمی کارکنوں کے مابین تبادلۂ خیال کے مواقع فراہم کئے گئے ہیں تاکہ امریکہ کے مدرسوں اور کالجوں میں ہندوستان کے بارے میں طالب علموں کو صحیح حالات سے اچھی طرح باخبر رکھا جا سکے۔ دہلی کی کانفرنس کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ امریکہ کے بارے میں ہندوستانی طالب علموں کی واقفیت کے دائرے کو مناسب طور پر وسیع کرنے کے لئے ہندوستانی اساتذہ کو امداد پہنچانے کے طور طریقوں پر غور و خوض کیا جائے۔ اس سمینار کا خاص مقصد یہ ہے کہ ہندوستان اور امریکہ کے شہریوں میں انسان دوستی کے جذبات کو ترقی دی جائے اور اس سلسلے میں معلم کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے۔ خیال ہے کہ اس طرح دو مختلف المزاج ممالک کے ربط باہمی سے بین الاقوامی مفاہمت کے جذبے کو بڑی تقویت پہنچے گی۔ اس موقع پر یہ بھی کوشش کی جا رہی ہے کہ مدرسوں میں تعلیم پانے والے بچوں کے لئے ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جس کی بدولت خلوص، عدل اور مساوات دل میں گھر کرے اور اُن کا ذہن، رنگ و نسل، اور قوم و مذہب کے محدود تصورات سے پاک رہے یہ ایک نہایت ہی مقدس اور اہم مقصد ہے۔ آج جبکہ ہر جگہ تنگ دلی اور تنگ نظری کا بازار گرم ہے اور آدمی کا خود آدمی شکار ہو رہا ہے، تمام ممالک میں رہنمایانِ تعلیم اپنی اپنی جگہ نہایت سنجیدگی کے

اسی سوچ میں ہیں کہ کیوں کر اس دنیائے رنگ و بو کو تباہی و بربادی سے بچایا جا سکتا ہے۔ ان حالات میں نیو یارک یونیورسٹی کی یہ مبارک کوشش ایک فالِ نیک ہے اور اس طرح وقت کے ایک اہم تقاضے کی تعمیل ہو جاتی ہے۔

مفکرینِ عالم اس صورتِ حال سے اچھی طرح باخبر ہیں کہ ذرا چوک ہوئی تو انسان خود اپنے ہی ہاتھوں انسانیت چاک کر ڈالے گا۔ لہٰذا موجودہ زمانے میں بہت سے بیدار ذہنوں نے "انسانیتِ عام کے مرکز" کا خواب دیکھا ہے اور تعلیم کا ایک اہم مقصد عالمی سماج کی تیاری قرار دیا ہے۔ اس ناقابلِ اعتبار دنیا میں اگر کوئی بات قابلِ اعتبار ہے تو یہی کہ اگر موجودہ نسل کو پروان چڑھنے کا موقع ملا اور اسے مدرسے میں انسانی ہمدردی اور رواداری کی تعلیم نہ دی جا سکی تو پھر ایک عالمی نظام کی کوئی توقع باقی نہیں رہے گی بلکہ وجودِ عالم ہی معرضِ خطر میں پڑ کر رہ جائے گا۔ ہم بلاشبہ تعلیم میں آزادی کے علم بردار ہیں لیکن یہ آزادی فضول ہے اگر اسے مناسب اور معقول طریقے سے سمجھ داری کے ساتھ نہ برتا جا سکے۔ ہم استاد کو کسی طور پر پابند نہیں کرنا چاہتے تاہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ "ہر ملک ملکِ ماست" کے عظیم تصور سے حقیقی طور پر متاثر ضرور ہو۔ بعض کے نزدیک اس عالمی نظریے کی تعلیم بھی ایک سیاسی مسلک کی اشاعت سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی اور وہ اس بات کو تعلیمی غیر جانب داری کے خلاف خیال کرتے ہیں لیکن یہ احساس درست نہیں ہے۔ یہاں ہم امنِ عالم کا پیغام سناتے ہیں۔ ہمیں سمجھنا چاہیے کہ اگر شانتی کی فضا ہم نہ قائم کر سکے تو پھر غالباً ہماری داستان کو دُہرانے والا بھی کوئی نہ رہ پائے گا۔ لہٰذا بین الاقوامی مفاہمت کو ایک مضمون کی حیثیت سے پڑھانے کا سوال نہیں ہے بلکہ بین الاقوامی مفاہمت کے لئے پڑھانے کا معاملہ ہے۔ اس منزل تک ہم اس وقت پہنچ سکیں گے، جب مدرسے کی سماجی زندگی میں شہریت کا قومی احساس موجود ہو گا اس لئے ہمارا پہلا قدم ماحول کی واقفیت ہی ہونا چاہیے۔ سب سے پہلے مدرسہ اپنی فضا کو خوشگوار بنائے۔ وہ اپنے سماج کی صالح روایات کا سچا آئینہ دار ہو۔ وہاں پر قومی اقدار کی آب یاری ہوتی ہو اور وہاں دلیں

کی یگانگت یکجہتی کے نغمے گو بجتے ہوں ۔ ان مدرسوں میں ہی معصوم ذہن، تربیت پاتے ہیں جو مستقبل کے امین ہیں۔ تاہم اس منزل پر عالمی معلومات بہم پہنچانے کی نہ ضرورت ہے اور نہ شہریت و قومیت اور وطنیت و بین الاقوامیت جیسے تصورات کو صحیح طور پر سمجھایا جا سکتا ہے ۔ اس وقت انھیں آپس میں میل جول کے مواقع فراہم کرنے ہیں اور ماحول کے ذریعے ان میں ذمہ داری اور پیش قدمی کی صلاحیت پیدا کرنی ہے اور اتحاد و یگانگت کے جذبات ابھارنے ہیں، یہ بیداری سطحی تعلیم سے ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اگر مدرسہ، سماج کی ضروریات اور توقعات سے قطعی بیگانہ رہا، محض نصاب کے الفاظ پر کاربند رہا اور روح کی پروانہ کی تو سچی تعلیم کا منصب پورا نہ ہو سکے گا۔ ہمیں کسی طور پر بھی واجبی قسم کی نام نہاد نظری تعلیم سے مطمئن نہیں ہونا ہے بلکہ بچوں کی تعلیم میں ان مشاغل کو شامل کرنا ہے جن کی بدولت تجسّس کی خواہش جاگتی ہے اور ایجاد و انکشاف کا ذوق شوق بڑھتا ہے۔ بنیادی تعلیم میں ربط کا اصول اس لحاظ سے ایک خاص اہمیت اور افادیت کا مالک ہے۔ اگلی منزل پر ثانوی مدارس کے اندر سماجی معلومات اور ماحول کی واقفیت کو دنیا اور اس کی رنگینیوں سے روشناس کرانے کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے۔ اب باضابطہ طور پر شہریت اور انسانیت کی تعلیم دینے کا موقع ہے۔ اس روح کو مختلف انجمنوں تنظیموں کے ذریعے پھونکا جاتا ہے۔ آج کی دنیا میں سائنس کا بول بالا ہے۔ لیکن ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ کیوں کر انسان کی روشنی طبع، خود اس کے لئے عذاب کا باعث ہو رہی ہے۔ ہماری تعلیم میں اس وقت ثانوی منزل پر سائنس کی طرف خاص توجہ دی جا رہی ہے۔ یہ بہر طور مناسب ہے لیکن سائنس کی تعلیم کو جہاں ایک طرف زندگی سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ محض کتابی ہو کر نہ رہ جائے وہاں اسے بے راہ روی سے بچانا ہے۔ پہلی بات کا تعلق تدریس کے طریقوں سے ہے اور دوسری صورت مذہبی روایات سے تعلق رکھتی ہے۔

انسانی زندگی میں مذہب کی حیثیت سے ہم سب واقف ہیں لیکن یہ عجب سانحہ ہے کہ مذہبی لوگ ہی مذہب کو محدود بناتے ہیں اور اس کا نام لے کر انسانی معاشرے میں زہر پھیلاتے ہیں۔ اس وقت

ہے کہ صحیح طور پر برتنے اور سمجھانے کی اشد ضرورت ہے۔ سچا مذہب دراصل انسان دوستی کا ضامن ہوا کرتا ہے کوئی بھی مذہب ہو بالآخر اس کی آواز جبر و تشدد اور بے انصافی کے خلاف ہی اٹھتی ہے۔ اس کے اصول انسان کا احترام سکھلاتے ہیں اور ربط باہمی کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس دور میں جبکہ مشینوں کی ہل چل میں دلوں کی آواز دب کر رہ گئی ہے اور روح انسانی مضمحل ہوتی چلی جا رہی ہے، ہم پر اس معاملے میں خصوصیت کے ساتھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ ہمیشہ سے اس سرزمین پر مذہبی عقائد کی سچی نمائندگی ہوتی رہی ہے۔ یہاں کے بزرگان دین اور اولیائے کرام ہمیشہ دلوں کو ملانے کا کام کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے خدمت خلق کو عبادت سمجھ کر کیا ہے اور ان کا مسلک صلح کل اور انسان دوستی ہی رہا ہے۔ اس وقت دیس بھر میں سوامی وویکانند کی صد سالہ سالگرہ کی تقریبات منائی جا رہی ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ یہ سلسلہ تمام سال جاری رہے گا۔ ہمارے اس دینی رہنما کا پیغام بھی یہی تھا کہ خالق تک رسائی کا ذریعہ خدمت خلق ہے اور وہ بھی مشرق و مغرب کی مفاہمت کے خواہاں تھے ٹیگور اور اقبال بھی انسانیت کا راگ گاتے رہے ہیں اور گاندھی جی نے بھی دنیا کو بھائی چارے کی تعلیم دی ہے۔ ہمیں اپنے ان معلمین اخلاق کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ ان کے ارشادات میں سچی مذہبیت ہے اور ایسی ہی تعلیم سے بین الاقوامی مفاہمت کی داغ بیل پڑتی ہے۔

تعلیم صرف معلومات فراہم کرنے کا ایک ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس سے انسانی شخصیت کی تربیت کی جاتی ہے۔ یہ کام چند سبق پڑھا دینے سے پورا نہیں ہو جاتا بلکہ مسلسل رہنمائی کرنی پڑتی ہے۔ لیکن مدرسہ اسی وقت پورے طور پر کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ سماج بھی اس کا ساتھ دے۔ مسائل دراصل سیاسی اور معاشی ہوتے ہیں تاہم اگر مدرسے کے اندر اچھے ساتھی اور اچھے پڑوسی بننے کی تعلیم نہ ہوئی تو اچھے شہری کیسے پیدا ہو سکیں گے۔ اگر اچھے شہری ہی نہ بنے تو سچے وطن پرست کہاں سے آئیں گے اور اگر سچے وطن پرست نہ ہوئے تو پھر عالمی شہری کہاں! لہٰذا بین الاقوامی مفاہمت کی طرف منزل بہ منزل بڑھنے کا سوال ہے۔ دراصل بات یہی ہے کہ بین الاقوامی مفاہمت کی بنیاد شہریت کی اچھی تعلیم اور مذہب کی سچی رہنمائی پر ہی قائم ہو سکتی ہے۔

(معلم)

تعارف و تبصرہ

تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنا ضروری ہے

قاموس القرآن یعنی قرآنی ڈکشنری مرتبہ: مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۷۹۸ صفحات، قیمت مجلد نو روپے، غیر مجلد آٹھ روپے

طبع ثانی: ۱۹۶۲ء پتہ: مکتبہ علمیہ۔ قاضی منزل۔ میرٹھ (یو۔پی)

مولانا قاضی زین العابدین صاحب علمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ نے متعدد علمی اور مذہبی کتابیں لکھی ہیں بلکہ بیان اللسان اور قاموس القرآن کے نام سے عربی سے اردو میں لغت کی دو کتابیں بھی مرتب کی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب قاموس القرآن میں تمام قرآنی الفاظ کا اردو ترجمہ دیا گیا ہے اور حسب ضرورت تشریح و توضیح بھی کر دی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب تفسیر کا کام بھی دیتی ہے۔ مثلاً حسن کی ساڑھے تین صفحے میں وضاحت کی گئی ہے اور مشہور مفسرین کی تحقیقات درج کردی گئی ہیں عربی لغات میں کسی لفظ کے معنی دیکھنے کے لئے اس کا مادہ جاننا ضروری ہے، اس کی وجہ سے اردو داں طبقہ کے لئے بڑی دقت پیش آتی ہے۔ اس لغت کی خوبی یہ ہے کہ ہر لفظ بجنسہٖ درج کیا گیا ہے اس لئے ہر شخص بغیر کسی دقت کے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

نیا خواب (پندرہ روزہ)

پچھلے سال ستمبر میں نیا خواب کے نام سے رام پور سے ایک نیا اخبار جاری ہوا۔ اگرچہ زیادہ تر رام سے متعلق نوٹ اور مضامین ہوتے ہیں، مگر رام پور کے ادیبوں اور شا

عارف کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے نیز اسی قسم کے بعض دوسرے مضامین اپنی افادیت، دلچسپی اور معیار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور اس قابل ہوتے ہیں کہ انھیں پڑھا جائے اور محفوظ رکھا جائے۔ اس نے اپنی اس مختصر عمر میں علی گڑھ نمبر بھی نکالا ہے جو پڑھنے کے لائق ہے۔ اس اخبار کے مفید ہونے کے لئے اتنی ضمانت کافی ہے کہ اس کی پشت پر اردو کے جانے پہچانے اہل قلم عابد رضا بیدار ہیں۔

سالانہ چندہ صرف تین روپے ہے اور پرانی تحصیل، رام پور (یو پی) سے منگوایا جا سکتا ہے۔

جدید سائنس

از: اے، کے، دیوکر۔ ریاض آفندی

سائز ۲۰×۳۰/۱۶، حجم ۸۰ صفحات، قیمت سوا روپے،

ملنے کا پتہ: مشتاق بک ڈپو ۱۲/۵ مسجد اسٹریٹ۔ بمبئی ۳

زیر تبصرہ کتاب ساتویں جماعت کے لئے لکھی گئی ہے اور سائنس کے مختلف مسائل کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان بڑی حد تک آسان ہے۔ لیکن ابھی اور آسان کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سائنسی مسائل کو سہل زبان میں بیان کرنا بہت مشکل ہے مگر پھر بھی "لعاب دہن" "رطوبت معدی" اور "لحمی اجزاء" جیسے الفاظ ساتویں جماعت کے طالب علموں کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہیں۔

جامعہ کے اگلے دو شمارے

مولانا آزاد کی پانچویں برسی

۲۲ فروری ۱۹۶۳ء کو مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی وفات کے پانچ برس پورے ہو جائیں گے۔ ہم نے مشہور اصحابِ قلم کو مرحوم کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھنے کی دعوت دی ہے، اگر ہماری دعوت کو سب نے قبول کر لیا تو جامعہ کا اگلا شمارہ صرف مولانا آزاد کے لئے مخصوص ہوگا۔

۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا جائزہ

اپریل کا جامعہ جائزہ نمبر ہوگا، جس میں ۱۹۶۲ء کے اردو ادب کا تفصیل سے جائزہ لیا جائے گا اور ۱۹۶۲ء کی جملہ مطبوعات کی مضمون وار فہرست شائع کی جائے گی۔

ماء اللحم
HAMDARD DAWAKHANA
ہمدرد کا ماءُ اللحم
بھوک کو بڑھاتا ہے اور دورانِ خون کی اصلاح
کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے سارے اعصاب
میں تحریک اور توانائی پیدا ہوتی ہے اور یہ جسم کے اندر
ایک نئی طاقت، نیا جوش اور ولولہ پیدا کرتا ہے
ہمدرد

جامعہ اُردُو مَراکز

جناب منظور عبدالرحمٰن

جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے جشن چہل سالہ (منعقدہ نومبر ۱۹۶۰ء) کے موقع پر طے کیا تھا کہ دہلی میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لئے تجربہ کے طور پر "اردو مراکز" قائم کئے جائیں تا کہ جامعہ نہ صرف اپنے تعلیمی اور تہذیبی مقاصد کے حصول کے لئے بلکہ ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کو باقی رکھنے اور مستحکم کرنے کی خاطر ٹھوس قدم اٹھا سکے۔

اُردو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی طرح محض ایک زبان ہی نہیں ہے بلکہ ایک تہذیب ہے۔ اس نے اب تک ملک کے تہذیبی اتحاد کی نمائندگی کی ہے اور مشترکہ تہذیب کے حسن کو سنوارا ہے۔ اس کی تشکیل اور تعمیر میں ہندو، مسلمان، سکھ غرضیکہ سبھی برابر کے شریک رہے ہیں۔ دراصل اردو نے عوامی زندگی کی ہر کروٹ کا ساتھ دیا ہے اور اس کے قافلے کے ساتھ آگے بڑھتی رہی ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد حالات نے کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ زبان کا مسئلہ بھی تنگ نظری کا شکار ہو گیا جس کا لامحالہ اثر اُردو اور اُردو بولنے والوں پر بھی پڑا۔ ان لوگوں کا اُردو سے تعلق رفتہ رفتہ کم زور ہوتا جا رہا ہے اور نئی نسل تو اردو سے بالکل بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ آج کل کی فضا میں اردو کے بہی خواہوں کے لئے اردو سے رابطہ قائم رکھنا دشوار سا ہو گیا ہے۔

اس لئے مذکورہ مقاصد اور مسائل کے پیش نظر اردو مراکز کے منصوبہ کا آغاز یکم مئی ۱۹۶۱ء کو جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب شیخ الجامعہ کی سرپرستی اور نگرانی میں ہوا جبکہ سب سے پہلا اُردو مرکز

دہلی کے شہری علاقہ باڑہ ہندو راؤ میں قائم ہوا۔ بعدازیں یکے بعد دیگرے تین مرکز کالکاجی، اندرا نگر اور مالویہ نگر کی پنجابی بستیوں میں ۱۹ مئی ۱۹۶۱ء، یکم جولائی ۱۹۶۱ء اور ۱۸ جولائی ۱۹۶۱ء کو بالترتیب قائم ہوئے۔ اس طرح فی الحال کل چار اردو مراکز، اردو کی ترویج و اشاعت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ مرکزوں کے ممبران سے کسی قسم کا بھی معاوضہ وصول نہیں کیا جا رہا ہے۔

ان نئی بستیوں کی آبادی اردو سے روشناس ہے لیکن یہاں نہ کوئی کتب خانہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسی دکان جہاں اردو کی معیاری کتابیں دستیاب ہو سکیں۔ ایسی صورت میں اردو کے بہی خواہوں کی علمی تشنگی بڑھتی رہی اور آبادی کا اردو سے تعلق بتدریج کمزور ہوتا رہا۔ چاروں مرکزوں کے قیام کا متعلقہ بستیوں اور علاقے کے باشندوں نے خیر مقدم کیا اور اردو کے بہی خواہوں نے مرکزوں کے ساتھ اپنے تعاون اور اشتراک کا پورا ثبوت دیا۔ اردو مراکز کے قیام نے لوگوں کی توجہ معیاری ادب کی جانب مبذول کرائی اور ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کیا۔ مرکزوں کے ممبروں میں کتب بینی کا شوق برابر بڑھتا رہا۔

اردو مراکز کی چار سرگرمیاں ہیں :-

۱۔ دارالمطالعہ ۲۔ کتب خانہ

۳۔ اردو تعلیم ۴۔ ادبی محفل۔

دارالمطالعہ :

اردو مراکز حسبِ ذیل رسائل کے خریدار ہیں :

۱۔ جامعہ نئی دہلی ۲۔ آج کل دہلی ۳۔ سرتیا نئی دہلی ۴۔ شمع نئی دہلی ۵۔ بیسویں صدی دہلی ۶۔ کتاب نما نئی دہلی ۷۔ ہماری زبان علی گڑھ ۸۔ نقوش لاہور ۹۔ نقش ادبی ڈائجسٹ کراچی ۱۰۔ ماہِ نو کراچی ۱۱۔ ادبِ لطیف لاہور ۱۲۔ نیا دور کراچی ۱۳۔ تعمیر سری نگر ۱۴۔ سویرا لاہور

مرکزوں کے ممبران کتابوں کی طرح رسالے بھی گھر پر پڑھنا پسند کرتے ہیں اس لئے رسالے بھی

ممبران کے نام جاری کئے جاتے ہیں۔ یہ تمام رسالے بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

کتب خانہ :

آج کل اردو جاننے والوں کے حلقے میں جتنا ناول پڑھنے کا شوق ہے اتنا افسانے، ڈرامے، ادب و تنقید اور شعر و شاعری کا نہیں۔ اس لئے عام ممبران کے شوق کا احترام کرتے ہوئے ہر ماہ بیشتر ناولوں کا اضافہ کیا جاتا ہے لیکن افسانے، ڈرامے، نظم و غزل کے علاوہ خصوصاً ادب و تنقید اور معلوماتی کتابوں کے اضافے پر بھی خاص توجہ مبذول کی جاتی ہے تاکہ ممبران کو اپنے ذوق کی کتابیں فراہم کی جا سکیں اور ساتھ ہی ساتھ کتب بینی کے شوق اور ذوقِ مطالعہ کی نشو و نما بھی ہو سکے۔ اب ضرورت اس کی ہے کہ ممبران ناول کے علاوہ اردو کے دوسرے اصناف کا بھی مطالعہ کریں۔

اب تک چاروں مرکزوں کے لئے ۱۳۲۱ کتابیں خریدی جا چکی ہیں جو بیشتر ناولوں اور افسانوں پر اور بقیہ کتب ڈرامہ، ادب و تنقید، نظم و غزل، معلومات اور تعلیم بالغان وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ ۲۴۷ اصحاب مرکزوں کے ممبر بن چکے ہیں جو ان سینکڑوں کتابوں سے مستفید ہو رہے ہیں۔

اردو مراکز، اردو کے اساتذہ، مشاہیر ادب، نامور ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں کے علاوہ غیر ملکی بلند پایہ ادبا کی تخلیقات سے اپنے قارئین کو متعارف کرا چکے ہیں۔

قارئین کی اپنی پڑھی ہوئی کتابوں کے بارے میں رائے لینے کے لئے ایک سوال نامہ مرتب کیا گیا ہے جو ستمبر ۱۹۶۲ء سے ہر ایک کتاب کے ہمراہ دیا جا رہا ہے۔ سوال نامہ میں ناول و افسانہ سے متعلق پلاٹ، کردار، زبان اور مرکزی خیال یا مقصد کے بارے میں، ادب و تنقید سے متعلق زبان اور نقطۂ نظر کے بارے میں اور نظم و غزل سے متعلق زبان، ندرت خیال اور ہیئت و موضوع کے بارے میں تحریری طور پر رائے دریافت کی جاتی ہے جس کی وجہ سے قارئین کے تنقیدی شعور اور رائے کا علم ہوتا ہے۔ گذشتہ ایک ماہ کے وصول شدہ سوال ناموں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ عام ممبران جس رفتار سے کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں، اتنے شد و مد سے تحریری صورت میں اظہار خیال نہیں کر پاتے۔ پڑھے

اور لکھنے کے معیار میں بہت فرق ہے۔ ابھی صرف ایک مہینے سے ممبروں کو سوال نامے دئے جا رہے ہیں اس لئے ابھی کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ سوال نامہ کو ممبروں میں مقبول کرنے کے لئے مسلسل ترغیب کی ضرورت ہے تاکہ ہر ایک ممبر کتاب کے مطالعہ کے بعد اپنی رائے لکھنا نہ بھولے۔
اُردو تعلیم

ہماری سرگرمیوں کا یہ مقابلتاً کمزور پہلو ہے کیونکہ اس کمزوری میں ملک کی موجودہ صورت حال اور لسانی تنگ نظری کا بڑا دخل ہے۔ تاہم ہر ایک مرکز اردو تعلیم کو مقبول کرنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہے۔ ممبروں کو ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنے بچوں اور عزیزوں کو مرکز میں اردو کی تعلیم دلوائیں۔ اس سلسلہ میں علاقائی گشت پر بھی عمل کیا جاتا ہے۔ مدرسوں اور کالجوں کی طویل تعطیلات گرما کے دوران میں زیادہ سے زیادہ طالب علموں کو اردو پڑھنا لکھنا سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مراکز اپنی کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ ان دنوں اردو سیکھنے والوں کی تعداد میں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں خاصا اضافہ ہو جاتا ہے لیکن مدرسوں اور کالجوں کے کھلنے پر تعداد پھر خاصی کم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ والدین اپنے بچوں پر مدرسہ کی تعلیم کے علاوہ اردو تعلیم کا مزید بوجھ ڈالنا مناسب نہیں سمجھتے کیونکہ ان کے خیال میں بچوں کے مستقبل کو سنوارنے میں اردو کا دخل نہیں ہوگا۔

مرکزوں میں جناب حیات اللہ صاحب انصاری کے قاعدہ (دس دن میں اُردو) کی بنیاد پر اردو کی ابتدائی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ہر ایک مرکز میں تعلیم و ترقی (جامعہ ملیہ) کی تعلیم بالغان سے متعلق کتابوں کا سیٹ فراہم کیا گیا ہے جو عام فہم موضوعات پر دلچسپ پیرایہ میں لکھی گئی ہیں۔ قاعدہ ختم کرتے والے ان کتابوں کو پڑھنا تو شروع کر دیتے ہیں لیکن انھیں پڑھنے میں شروع شروع میں خاصی دشواری ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ گریڈ کے لحاظ سے سلسلہ وار نہیں لکھی گئی ہیں۔

مرکزوں کی طرف سے قاعدے بھی فروخت کئے جاتے ہیں تاکہ گھر پر پڑھنے والوں کو بھی

بعض اشخاص قاعدہ خرید کر اپنے کسی عزیز سے گھر ہی پر اردو پڑھنا لکھنا سیکھتے ہیں۔
مرکز باڑہ ہندو راؤ میں اردو تعلیم مقابلتاً زیادہ مقبول ہے۔ یہاں پر دوسرے مرکز وں کے مقابلہ میں اردو سیکھنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ رہی ہے کیونکہ اس علاقے کی بیشتر آبادی چھوٹے دکانداروں، گھریلو صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں اور تجارت پیشہ افراد پر مشتمل ہے۔ علاوہ ازیں مسلمانوں، مقامی ہندوؤں اور پنجابی شرنارتھیوں کی کہیں کہیں ملی جلی لیکن زیادہ تر الگ الگ بستیاں اور علاقے بھی ہیں۔ مسلمانوں کی باڑہ ہندوراؤ کے علاقے میں خاصی آبادی ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے نوجوان خاص شوق اور جذبے کے تحت اردو سیکھنے مرکز آتے ہیں۔ یہاں پر اردو سیکھنے والوں میں تقریباً تمام اَن پڑھ ہوتے ہیں لیکن دوسرے مرکز وں میں اردو سیکھنے والے اَن پڑھ نہیں ہوتے بلکہ وہ دوسری زبانوں سے بھی واقف ہوتے ہیں۔
جامعہ کی طرف سے اردو تعلیم کی مقبولیت اور اسے اہمیت دینے کے لئے تقسیم اسناد کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ سند صرف ان ہی لوگوں میں یا قاعدہ تقسیم کی جائے گی جنھوں نے صرف مرکز میں اردو پڑھنا سیکھا ہے۔

ادبی محفل:

مرکز وں کی جانب سے ادبی محفلیں بھی منعقد کی جاتی ہیں جن میں افسانہ نگار اپنے افسانے سے اور شاعر اپنے کلام سے حاضرین کو محظوظ کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ممتاز ادیبوں کی ادبی موضوعات پر تقریریں ہوتی ہیں اور بعض مقبول ناولوں پر مقالے بھی پڑھے جاتے ہیں۔ دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کو مرکز سے وابستہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ ممبران کا ان سے براہِ راست رابطہ قائم ہو جائے لیکن اس راہ میں خاصی دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ مراکز سے متعلقہ بستیوں اور علاقوں میں مقیم نوجوان ادیبوں اور شاعروں کو موقع دیا جا رہا ہے کہ وہ اپنی تخلیقات ادبی محفلوں میں پیش کریں۔ ادبی محفلوں سے اردو مرکز وں کی مقبولیت میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ادبی سرگرمیوں کے ذریعہ ہم اردو کے بہی خواہوں، ادیبوں اور شاعروں کو ایک مرکز پر جمع کر سکیں گے۔

دراصل ادبی محفلوں کا باقاعدگی سے سلسلہ جاری رکھنے میں اردو مراکز کو دہلی کے ادیبوں اور شاعروں کے تعاون اور اشتراک کی شدید ضرورت ہے۔

اردو مراکز جز وقتی طور پر چل رہے ہیں۔ روزانہ شام کو تین گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔ اسی دوران میں دار المطالعہ اور اردو تعلیم کی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں۔ ممبران سے کسی قسم کا کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا ہے لیکن اب ممبروں کی جانب سے یہ پیش کش کی جا رہی ہے کہ ان سے مرکز چندہ وصول کرے تاکہ مرکزوں کا مالی بوجھ کچھ ہلکا ہو سکے اور سرگرمیوں کی رفتار تیز ہو سکے۔ ممبران کا ایسا رویہ مرکزوں کے ساتھ ان کے تعاون اور اشتراک کا بین ثبوت ہے۔

اردو مراکز کا دائرہ اثر وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ نواحی بستیوں اور علاقوں کے لوگ مرکزوں کے ممبر بنتے جا رہے ہیں۔ سینکڑوں گھروں تک اردو کی معیاری کتابوں کی رسائی اور اردو کے اساتذہ مشاہیر ادب اور ادیبوں اور شاعروں کا تعارف خود اپنی جگہ مرکزوں کا ایک اہم اور دور رس تعمیری کام ہے۔ ادبی ذوق اور کتب بینی کے شوق میں اضافہ ہو رہا ہے جس کا اندازہ اجرائے کتب، سرگرم اور متحرک ممبروں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ اب یہ ممبران ایسی دکانوں کی طرف رخ نہیں کرتے جو ہیجان انگیز جاسوسی اور گھٹیا رومانی و جنسی ناولوں کو کرایہ پر پڑھنے کے لئے دیتی ہیں۔ جب یہ سننے میں آتا ہے کہ ان دکانوں کا ایسا کاروبار ٹھپ ہوتا جا رہا ہے تو بڑی ہمت افزائی ہوتی ہے اور امید افزا صورت حال کا اندازہ ہوتا ہے۔ اردو کے بہی خواہ روز بروز مرکزوں سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔

اردو مراکز نے اپنے ممبروں کو ادبی مطالعہ کا محبوب مشغلہ فراہم کیا اور اکثر ممبروں کی مرکزوں میں یومیہ حاضری ان کا ایک معمول سا بن گئی ہے۔ وہ دوران تعطیلات مطالعہ پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ ہر ایک مرکز میں ایسے ممبروں کی تعداد بڑھ رہی ہے جو پہلے ایک کتاب جاری کرواتے تھے اور اب ایک سے زائد۔

مرکزوں کے قیام سے ممبروں میں تہذیبی اتحاد مضبوط ہوا ہے اور فی الحال چھوٹے پیمانہ پر متعلقہ بستی یا علاقہ میں صحت مند ماحول پیدا ہونے کے امکانات روشن ہو گئے ہیں۔

مرکزوں کی خاموش تعمیری سرگرمیوں نے نہ صرف اردو کے بہی خواہوں کو بلکہ غیر ہمدردوں کو بھی

متاثر کیا ہے ۔ بعد میں یہ لوگ مرکز کے ممبر بن گئے ۔

مرکزوں کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ متعلقہ علاقوں اور بستیوں میں جامعہ ملیہ بھی مقبول ہوئی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ لوگ جامعہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے مرکز میں آتے ہیں ۔ جامعہ کے طلبائے قدیم نے بھی مرکزوں کے ساتھ پوری طرح تعاون اور اشتراک کیا ہے جسے کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ جامعہ کا اردو مراکز کے ذریعہ متعلقہ بستیوں اور علاقوں کے باشندوں سے رابطہ پیدا ہو گیا ہے ۔

" اردو مراکز " کا منصوبہ دہلی میں اپنی طرز کا بالکل ہی نیا منصوبہ ہے جس کی ابتدا " پرسکون دھیمے پن " سے ہوئی اور پھر خاموش تعمیری سرگرمیوں کے ذریعے اس کا دائرہ اثر وسیع ہوتا رہا ۔ یہ ایک صبر طلب کام ہے اور مدت چاہتا ہے ۔ اگر وسیع النظری، مستقل مزاجی، ہمت اور بلند حوصلوں کے تحت اردو مراکز تہذیبی اتحاد پیدا کرنے اور تنگ نظری دور کرنے کی خاموش جدوجہد کرتے رہے تو یقیناً یہ اپنے اپنے علاقوں کے اردو کے بہی خواہوں اور اردو بولنے والوں کو تہذیبی طور پر متحد کر سکیں گے جس سے قومی یکجہتی کو تقویت ملے گی ۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی ـــ مطبوعہ: یونین پریس دہلی ـــ ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

February 1963

Regd. No. D - 768

The Monthly JAMIA

P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر

جلد نمبر ۴۸	بابت ماہ مارچ ۱۹۶۳ء	شمارہ ۳

فہرست مضامین

فی پرچے کی قیمت : ایک روپیہ — سالانہ چندہ : چھ روپے

مولانا ابوالکلام آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر
جامعہ کا یہ حقیر نمبر پیش کیا جاتا ہے
کچھ مرحوم کی خدمات کے اعتراف میں
اور کچھ اس لئے کہ ہم مولانا کی یاد کو تازہ رکھنے
کے لئے اس موقع پر اپنی ذمہ داریوں پر غور
کریں۔

(ادارہ)

ہندوستانی قومیت اور مسلمان

مولانا آزاد کی پانچویں برسی کے موقع پر چند خیالات

پروفیسر آل احمد سرور

مولانا آزاد کے انتقال کو پانچ سال ہو گئے۔ ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی اسے کوئی پُر نہ کر سکا۔ ایک حد تک مولانا حفظ الرحمن نے ہندوستانی مسلمانوں کو قومیت کی شاہراہ پر آگے بڑھایا، مگر وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اب یہ عالم ہے

اللہ رے سناٹا آواز نہیں آتی

آزادی کے پندرہ سال کے بعد بھی قومی زندگی میں ہندوستانی مسلمانوں کی نہ وہ اہمیت ہے جس کے وہ مستحق ہیں، نہ ان کے یہاں وہ جذبہ ہے جو مشکلات پر قابو پاتا ہے اور مردانہ وار منزل کی طرف بڑھتا جاتا ہے عام طور پر وہ اپنے آپ کو مظلوم کہتے ہیں۔ جمہوریت کا تصور، غیر مذہبی ریاست کا وجود، سوشلزم کی منزل، اقلیتوں کے ساتھ انصاف کے وعدے، نہ ان کے دل کو گرماتے ہیں نہ ان کے دماغ کو تسکین پہنچاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کی باتیں خاموشی سے سن لیتے ہیں جو انھیں ہندوستانی قومیت کے شاندار نصب العین اور ہماری قومی حکومت کے نیک ارادوں کی داستان سناتے ہیں۔ مگر ان پر کوئی گہرا اثر نہیں ہوتا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری قسمت میں ایک ایسی تاریک رات آئی ہے جس کی کوئی سحر نہیں۔ وہ اپنے مذہب کے سچے پیرو تو نہیں کہے جا سکتے ہاں اس سے محبت ضرور کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر کوئی انھیں پکارتا ہے تو وہ آنکھیں بند کر کے دوڑتے ہیں۔ مذہب پر ان کے خیال میں کوئی آنچ آتی ہے تو احتجاج کرتے ہیں، مذہب کا کوئی نام لے تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس کی تہہ میں کوئی سیاسی

مصلحت پوشیدہ ہے یا نہیں۔ وہ اس کی بھی پروا نہیں کرتے کہ کوئی ان کے جذبات سے کھیل رہا ہے۔ اگر کوئی جماعت انھیں اپنا آلۂ کار بنانا چاہتی ہے تو اس کے لئے بڑی آسانی ہے وہ [illegible] دے کہ اسلام خطرے میں ہے، اس کے بعد جو چاہے سو کرا لے۔

غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نزدیک مذہب تو ایک ایسی زندہ حقیقت ہے جس کے ساتھ مل کر ہی انھیں دین اور دنیا مل سکتے ہیں، مگر قومیت کو وہ ایک ایسا سودا سمجھتے ہیں جس میں ان کے لئے نقصان ہی نقصان ہے اور اکثریت کے لئے نفع ہی نفع۔ پھر انھیں یہ بھی خیال ہو چکا ہے کہ اسلام اور قومیت ایک دوسرے کے منافی ہیں۔ قومیت سے مسلمان جتنا ہی ہم آہنگ ہوگا اتنا ہی وہ اسلام سے دور ہوتا جائے گا۔ پہلے اُسے ہر معاملے میں اکثریت کی غلامی قبول کرنا پڑے گی پھر اُسے رفتہ رفتہ ایک خاموش تہذیب کے اثر سے اپنی تہذیبی خصوصیات سے ہاتھ دھونے پڑیں گے، اس کے بعد نوبت یہ آئے گی کہ عقائد بھی کچھ سے کچھ ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہ یہ خطرہ کیوں مول لے۔

اقبال نے پہلی جنگ عظیم سے پہلے قومیت کے متعلق کہا تھا:

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اس کے بعد سے گنگا میں کتنا پانی بہہ گیا۔ دو عالم گیر لڑائیاں ہوئیں۔ اسلامی ممالک میں قومیت کی تحریک نے زور پکڑا۔ ہندوستان اور پاکستان آزاد ہوئے۔ ایشیا اور افریقہ کا نقشہ بدل گیا۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی مگر کچھ لوگوں کو چھوڑ کر جن کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے مجموعی طور پر ہندوستان کے مسلمان قومیت اسلام کے نظریئے سے ہی چمٹے رہے۔ انھوں نے ہندوستانی قومیت کو آتش نمرود نہ سمجھا اگر اس میں کود پڑتے نہیں، ورنہ یہی آگ اسی طرح ان کے لئے گلزار ہو جاتی جس طرح حضرت ابراہیم کے لئے ہو گئی تھی۔ مولانا آزاد نے "ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے" کے آخری صفحے پر صاف صاف کہا تھا:

" تاریخ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پہلی چند دہائیوں کے بعد یا زیادہ سے زیادہ پہلی صدی کے

بعد اسلام، صرف اسلام کی بنیاد پر تمام مسلم ممالک کو متحد کرنے میں کامیاب نہیں ہو [illegible]
مگر آج بھی بیشتر ہندوستانی مسلمان جو کسی [illegible] اسلامی بلاک کی تجویز سے [illegible] ہیں [illegible] بڑی توقعی
ہوتی ہے۔ آج بھی ان کے دل میں ہندوستان کے لئے وہ جذبہ نہیں ہے جو اسلامی ممالک [illegible]
[illegible]، آج بھی وہ اپنے ہم وطنوں سے جو کسی دوسرے مذہب کے پیرو ہیں ذہنی طور پر اتنے
قریب [illegible] جتنے دوسرے ملکوں کے مسلمانوں سے ہیں۔ آج بھی وہ قومیت کے فروغ کو مذہب
[illegible] سمجھتے ہیں۔ وہ آج بھی پہلے مراعات اور سہولتیں ڈھونڈھتے ہیں اور بعد میں
[illegible] کی بات کرتے ہیں۔ آج بھی حقوق تو یاد ہیں فرائض سے غفلت ہے۔ اس لئے مولانا
[illegible] برسی کے موقع پر یہ ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا
قومی فریضہ یاد دلائیں اور انھیں بتائیں کہ قومیت اور اسلام میں کوئی تضاد نہیں ہے اور
ایک سے وفا دوسرے سے بے وفائی کے مترادف نہیں کہی جا سکتی۔
[illegible] سلسلے میں سب سے پہلے خود مولانا کے رام گڑھ کے خطبے کا ایک اقتباس دینا ضروری ہے
جس سے نہ صرف مولانا کا بلکہ قوم پرست مسلمانوں کا بھی نقطۂ نظر واضح ہو جاتا ہے۔ اقتباس
طویل ہے مگر مجبوری یہ ہے کہ اس میں سے کوئی جز حذف نہیں کیا جا سکتا۔
میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس
کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ
بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب
میری دولت کا سرمایہ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بہ حیثیت مسلمان ہونے کے میں
مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس
میں کوئی مداخلت کرے لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں
جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے ان سے نہیں روکتی، وہ
اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں

میں ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (فیکٹر) ہوں۔ میں اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

مولانا کے نزدیک قومیت اور اسلام میں سے کسی کو چھوڑنا ضروری نہیں۔ نہ ان میں سے ایک کے بڑے اور ایک کے چھوٹے ہونے کا سوال ہے۔ یہ دونوں علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں اور ان کے آپس میں ٹکراؤ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقبال کا یہ خیال نہ تھا۔ آخر عمر میں ان سے اور مولانا حسین احمد سے اس پر بحث بھی ہوئی تھی۔ اقبال کی طرح بہت سے ہندوستانی مسلمان یہ پہلے بھی سمجھتے تھے اور آج بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام زندگی کے ہر شعبے کا احاطہ کرتا ہے اور کسی دوسری شے سے وفاداری گوارا نہیں کرتا خواہ وہ قومیت ہی کیوں نہ ہو۔ اس سلسلے میں اسلام اور قومیت دونوں کا ایک خاص تصور ذہن میں آتا ہے۔ اگر اسلام کے آئیڈیل تصور اور قومیت کے آئیڈیل تصور کا موازنہ ہو تو بھی بات نتیجہ خیز ہو سکتی ہے مگر عام طور پر اسلام کا آئیڈیل تصور اور قومیت کا عملی روپ دیکھا جاتا ہے اگر دونوں کے عملی روپ کی بات ہو تو بھی گفتگو دلچسپ ہو سکتی ہے اور شاید نتیجہ خیز بھی ہو۔

قومیت ہندوستان کے لئے نئی چیز ہے۔ مغربی ملکوں کا تجربہ ہمارے لئے مفید ہو یا نہ ہو، مگر خود اسلامی ممالک کا کوئی بھی معروضی مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ ان میں قومیت آج سب سے بڑی طاقت ہے۔ عرب ممالک میں صدر ناصر کی مقبولیت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے یمن میں انقلاب اور عراق میں نئی کروٹ ناصرازم کی بڑھتی ہوئی طاقت کا پتہ دیتے ہیں۔ اگرچہ ایک دنیا کا تخیل دانش وروں اور ادیبوں کے دلوں کو گرمانے لگا ہے، اگر عملی طور پر "قومیت" آج دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ مذہب سے بڑی ہے۔ مذہب کے مقابلے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ کیونکہ مذہب میں عقاید۔ عبادات اور معاملات سبھی پہلو آتے ہیں۔ ان تینوں میں اسلام کی تعلیم کے مطابق عمل ہونا چاہیے مگر معاملات صرف اپنے گروہ کے لوگوں سے نہیں

دوسروں سے بھی ہوتے ہیں۔ اس لئے معاملات کے سلسلے میں دوسروں سے رشتے کا سوال بھی
آتا ہے اور اس لئے [illegible] اور ایسے معاملات ہیں جن سے آج کی پیچیدہ زندگی میں
واسطہ پڑتا ہے، قومیت کی طاقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ کہا [illegible]
کی ایک کنجی ہوتی ہے اور یہ کنجی بدلتی رہتی ہے۔ یہ بھی اس کنجی کے علاوہ ہوتی ہے
جس کے [illegible] انسان اور اس کے خدا کے درمیان راستے کھلتے ہیں۔ اس دور کے ذہن کی کنجی
قومیت ہے اور جب ہم قومیت کی بات کرتے ہیں تو اس سے کسی طرح اسلام کی اہمیت کو گھٹانا
[illegible] اسلام بہر حال ہمیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے ممتاز کرتا ہے اور علیحدہ
کرتا ہے۔ قومیت ہمیں ان سے ملاتی ہے۔ مذہبی مسائل کے علاوہ، روزمرہ زندگی میں ہمارا سابقہ
دوسروں سے زیادہ پڑتا ہے۔ اس لئے یہ رشتہ جو ہمیں اس ملک کے دوسرے [illegible]
سے ملاتا ہے، اتنا اہم۔ جاندار اور معنی خیز ہے کہ ہم اس کی اہمیت سے انکار کر کے اپنا نقصان
کریں گے۔ دنیا یہ دیکھتی ہے کہ اس کا کاروبار کیسا چل رہا ہے، وہ اپنے کاروبار میں ہر مذہب
کے پیرو کو شریک کر لیتی ہے بشرطیکہ کاروبار پر برا اثر نہ پڑے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں نے عام طور پر اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس
نہیں کیا۔ وہ جب قومیت کی طرف بڑھتے بھی ہیں تو ان کا اسلام کا تصور ان کے سامنے دیوار بن کر
کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں یہ واضح کرنا ہے کہ حقیقی اسلام قومیت کے فروغ میں کوئی خطرہ
نہیں سمجھتا، بلکہ قومیت کا فروغ علاوہ دوسرے مذاہب کے ہندوستان میں اسلام کے فروغ
کے لئے بھی راہیں کھول سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا ہے کہ ابھی قومیت کا تجربہ ہمارے
ملک میں نیا ہے۔ ابھی اس میں وہ پختگی نہیں آئی کہ ہم اس کے سارے محاسن کو دیکھ سکیں۔ ابھی
اس کے فروغ کے راستے میں تاریخی وجوہات کی بنا پر کچھ سنگ گراں حائل رہے ہیں اور ان میں سے
کچھ دوسروں نے پیدا کئے ہیں تو کچھ کے پیدا کرنے میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ یہ پتھر وقت کے تقاضے
کے مطابق رفتہ رفتہ راہ سے ہٹنے والے ہیں۔ ہم ان دونوں پہلوؤں کا یکے با دیگرے جائزہ لیں گے۔

ہندوستان کا مسلمان مجموعی طور سے اسلام سے محبت کرتا ہے، مگر اس کا اسلام حقیقی اسلام
[illegible] پیر پرستی کی لعنت میں بڑی حد تک گرفتار ہے۔ اس کے یہاں فرقہ بندی
بھی ہے اور ذاتیں بھی۔ وہ جاگیردارانہ نظام سے بری طرح چمٹا ہوا ہے۔ اس کا قدیم نظام تعلیم
تقلیدی ہے، یہ کولہو کے بیل بناتا ہے، عرصۂ کارزار میں چلنا نہیں سکھاتا۔ اس میں آدھی آبادی
یعنی عورت کچھ عرصے پہلے تک سماج کا فعال حصہ نہیں بلکہ سماج پر بوجھ رہی ہے۔ اس کے یہاں
دولت کی مساوی تقسیم نہیں ہے اس نے جدید علوم کی طرف سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان
میں پرانی حکومت کا نشہ ہے، یہ محنت سے جی چراتا ہے۔ یہ ہر اندرونی یا بیرونی طاقت کا آلۂ کار
بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ ان کا کچھ فائدہ ہوتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اس عمومی جائزے میں سرسید کے
وقت سے جو تبدیلی ہوئی ہے اس کا احساس بظاہر نظر نہیں آتا، مگر یہاں بات مجموعی طور
پر کہی گئی ہے۔ سرسید ہوں یا ابوالکلام، ان کا احترام تو برابر کیا گیا ہے مگر ان کے خیالات پر عمل
کم ہی ہوا ہے۔

کیا ہندوستان کے مسلمان نے حقیقی اسلام کی کوئی بڑی خدمت کی ہے! کیا پاکستان بنانا
اسلام کی واقعی خدمت تھی؟ اور کیا یہ بات غلط ہے کہ پاکستان کا وجود ہندوستانی مسلمانوں
کی کاوش سے زیادہ مغربی استعمار پرستوں کی ایک سیاسی مصلحت کا مرہونِ منت

ہمارا خیال یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست میں بالائی طبقے کے مسلمانوں کے
طبقاتی مفاد کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، غریب اسلام کا صرف نام لیا گیا ہے، اس لئے کہ یہ
مفاد اس نام کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ نظام حیدرآباد سے ہندوستانی مسلمانوں کو کتنی ہمدردی
تھی اور اس ہمدردی کی کیا قیمت دینی پڑی، اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

اسلام ہر مسلمان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ توحید و رسالت پر یقین محکم رکھے۔ وہ قرآن
کی روشنی میں اپنی زندگی کو منظم کرے اور اس زندگی کو انسانیت کے لئے باعث خیر و برکت

ہے۔ اسلام میں فرقوں کی گنجائش نہیں، مگر ہمارے یہاں بہتر فرقے موجود ہیں جو اپنے علاوہ دوسرے کو کافر سمجھتے ہیں۔ اسلام نے وراثت، نکاح، طلاق کے لئے کچھ قوانین بنائے ہیں۔ ہمارے یہاں ان قوانین سے زیادہ رسم کی پیروی ہے۔ اسلام کی روح جمہوری ہے۔ ہم نے دولت اور خاندان کا لحاظ زیادہ رکھا ہے۔ اسلام نے علم کے لئے کوئی دروازہ بند نہیں کیا، ابھی کتنے دن ہوئے کہ ہمارے علما انگریزی تعلیم کو بے دینی کے مترادف سمجھتے تھے۔ اب بھی کچھ لوگ ہندی اور سنسکرت سے اس لئے بچتے ہیں کہ اس طرح وہ اپنے مذہب سے دور ہو جائیں گے۔ ہم نے ہندوستانی علوم کی طرف سے اپنے ذہن کا دریچہ بند رکھا ہے۔

اس لئے اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ ایک مدت سے ہندوستانی مسلمان اسلام کی خدمت کم کرتا رہا ہے۔ اپنے اقتدار کو باقی رکھنے کی جدوجہد میں زیادہ مصروف رہا ہے۔ تاریخ کا نقشہ بدلنے پر جمہوری عناصر کے تقویت پانے پر غلام ملکوں کے آزاد ہونے پر دنیا کے بڑے حصے کا ملک پر اثر انداز ہونا قدرتی تھا۔ اس ماضی کی یاد جس کے شاندار کارنامے دنیا سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں، اکثریت کو کیوں نہ آتی، وہ فلسفہ، وہ ادب، وہ تہذیب، کیوں نہ ابھرتے جن کو مغربی سامراج نے اپنے مصالح کی بنا پر دبا رکھا تھا۔ اس سے یہ شکایت تو بجا ہوتی کہ وہ صرف قدیم ہندوستان کو کیوں یاد کرتا ہے، درمیانی دور کے ہندوستان کو بھی کیوں اپنی یاد میں شامل نہیں کرتا، لیکن اس کے سارے جذبات کو محض اکثریت کا نشہ قرار دینا کہاں کی دانشمندی تھی۔ کچھ عرصہ ہوا پروفیسر ہمایوں کبیر نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ایک کانووکیشن میں خطبہ پڑھتے ہوئے یونیورسٹی کے مسلمان طلبا کو مشورہ دیا کہ وہ ہندوستان کے مشاہیر کو اپنائیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہ تھا کہ وہ ہندو مذہب کے بزرگوں پر ایمان لے آئیں بلکہ سیدھا سادا مطلب یہ تھا کہ اشوک، کالی داس، وکرماجیت، کرشن جی، رام چندر جی کا بھی اقرار کریں۔ مگر عام طور پر پروفیسر کبیر کے ارشادات کو ایک ہندو پرست وزیر کے بھاشن سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی جو جس کا کھاتا ہے اسی کا گاتا ہے۔

ہندوستان کے مسلمانوں کی تنگ نظری اس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ انھوں نے ہر جدید تحریک کو اپنے لئے ایک خطرہ سمجھا یا یاروں نے اپنے مفاد کی خاطر ان کو یہ سمجھادیا۔ جمہوریت سے وہ بیزار، قومیت ان کے نزدیک ایک فریب، سوشلزم یا کمیونزم لامذہبیت کا دوسرا نام، دا اپنا کا فلسفہ گو سفندی کا نیا روپ۔ جن اللہ کے بندوں نے نئی تحریکوں کی کچھ تعریف کی وہ فوراً ٹاٹ باہر کردئے گئے۔ برسوں مولانا آزاد کے متعلق یہ پروپیگنڈا ہوتا رہا کہ کانگرس نے انھیں چند سکوں کے عوض خرید لیا ہے۔ مولانا کا جرم یہ تھا کہ وہ کانگرس کی حمایت کرتے تھے جو قومی تحریک کی سربراہ تھی۔ گاندھی جی کے متعلق اقبال کے شعر پر سر دھننے والے اب بھی موجود ہیں۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

حالانکہ جن لوگوں کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور ذہنوں پر جالا نہیں ہے وہ جانتے ہیں کہ رشی کے فاقوں نے نہ صرف برہمن کا طلسم توڑ دیا بلکہ ہندو حکومت کے خواب کو بھی ہمیشہ کے لئے ختم کردیا۔

ہندوستان کا مسلمان اب تک معلق ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا اسلام سے رشتہ مضبوط ہے حالانکہ صدیوں کے رسم و رواج کی وجہ سے مذہب کے ایک ظاہری روپ کی پرستش تو اس کے پاس رہ گئی ہے، مذہب کی روح نہیں رہی۔ اس نے قومیت سے من حیث القوم ابھی تک اپنا رشتہ مضبوط نہیں کیا۔ یعنی قومیت اس کے ذہن، اس کے عقیدے، اس کی شخصیت کا ایک جزو لاینفک نہیں ہے۔ قومیت کا جذبہ اسے گرماتا نہیں!

قومیت صرف جغرافیے کی مرہون منت نہیں۔ اس میں تاریخ، تہذیب، اقتصادی مفاد کی وحدت بھی ضروری ہے اور سب سے زیادہ یگانگت کے احساس کی۔ قومیں مذہب سے نہیں بنتیں، وطن اور اس کی مشترک تاریخ و تہذیب سے بنتی ہیں۔ عرب عیسائی اور عرب یہودی، باوجود اس کے کہ عرب مسلمانوں سے مختلف مذہب رکھتے ہیں، مگر ان کے ساتھ ایک عرب قوم کے

جز ہیں۔ ہندوستان کے ہندو، مسلمان، پارسی، عیسائی، سکھ مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے ہوئے ہندوستانی قوم کے افراد ہیں۔ مذہب قوم کے راستے میں حائل نہیں ہوتا، نہ قوم افراد [illegible] سے کوئی علاقہ رکھتی ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کش مکش [illegible] سے مظاہر ملتے ہیں مگر اس سے کم مظاہر ان کے تعاون کے نہیں ہیں۔ یہ کش مکش اسلام اور دوسرے مذاہب کی نہیں ہے، بلکہ ان افراد کی سیاسی اقتدار کے لئے لڑائی ہے جو مختلف مذاہب رکھتے تھے۔ پھر ان میں تعاون اور اشتراک کے بھی ان گنت نمونے ملتے ہیں۔ یہاں پھر مولانا کے مشہور خطبے کا ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:-

"ہندوستان کے لئے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں مختلف تہذیبوں اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی اور پھر ایک کے بعد ایک کا سلسلہ جاری رہا اور اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی اور اس کی فیاض گود نے سب کی جگہ نکالی۔ انھیں قافلوں میں آخری قافلہ ہم پیروان اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا اور ہمیشہ کے لئے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ بہتے رہے لیکن پھر جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا جس دن یہ واقعہ ظہور میں آیا اس دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے پرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کر دیا۔"

"تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعہ پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعویٰ رکھتا ہے جیسا دعویٰ ہندو مذہب کا ہے۔"

[illegible] ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامان سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت

رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ الگ تھیں۔ مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم ورواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں چل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔

ہماری اس ہزاروں برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے، وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قدرت کی مہر اس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیئے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیئے۔"

کہا جا سکتا ہے کہ اس "ناقابلِ تقسیم" ہندوستانی قوم کے ۱۹۴۷ء میں دو ٹکڑے ہوگئے اور اس لئے یہ سارا استدلال غلط ثابت ہوگیا۔ حالانکہ اس عمل جراحی کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اقلیت اور پاکستان میں ہندوؤں کی اقلیت اب ہندوستانی اور پاکستانی قوم ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مفاد ہندوستان کے ساتھ اور پاکستان کے ہندوؤں کا پاکستان کے ساتھ ہے۔ تقسیم یقیناً غلط تھی، مگر اب تو وہ ہوگئی، اب اُسے بُرا کہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اب دونوں ملکوں کو پرانے جھگڑوں کو بھلا کر آزاد اور خودمختار دوستوں کی طرح رہنا چاہیئے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کے ہندوؤں کو اب پاکستان کے ہندوؤں سے کوئی سروکار نہیں اور اس طرح پاکستان کے مسلمانوں کو اب ہندوستان کے مسلمانوں سے

کوئی سروکار نہیں۔ دونوں کے راستے الگ الگ ہیں۔ اور اب بھی کچھ لوگ ایسا نہیں سمجھتے تو یہ ان کی بھول ہے جیسے جیسے وقت گزرتا جائے یہ حقیقت بھی اور زیادہ واضح ہوتی جائیگی

ہندوستان میں قومیت کا تصور نیا ہے۔ مذہب، ذات پات، علاقے سے وفاداریاں پرانی ہیں۔ قومیت کا تصور ابھی دلوں میں جاگزیں نہیں ہوا ہے۔ صرف اوپر سے مان لیا گیا ہے یہاں اقرار باللسان ہے تصدیق بالقلب کی منزل تک ابھی بات نہیں پہنچی۔ اس لئے پرانے رشتے اب بھی اپنا زور دکھلاتے ہیں اور ذرا سی سختی یا دباؤ پر ابھر آتے ہیں۔ پھر انگریز کے زمانے میں لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول پر جس طرح ہندوؤں اور مسلمانوں کو برسوں سبق دئے گئے وہ بھلائے نہیں جا سکتے۔ سیاست والوں کی بہت بڑی تعداد اس ماحول میں پلی ہے۔ حکومت کے کارکن خلا میں پیدا نہیں ہوئے۔ اس ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اور ان میں سے بڑی تعداد کو اس بنا پر ملازمتیں ملی تھیں۔ اقلیت کے ذہن سے مراعات اور محفوظ نشستوں کی یاد محو نہیں ہوئی ہے، پرانی تاریخ کو جس طرح پیش کیا گیا تھا، اس کے اثرات بھی باقی ہیں۔ تقسیم کے بعد ہولناک فسادات نے دونوں طرف اتنا زہر پھیلا یا تھا کہ وہ جاتے جاتے جائے گا۔ ان باتوں کی وجہ سے آزادی کے بعد قومیت کے تصور کو وہ فضا نہ ملی جو ملنی چاہیئے تھی۔ اگرچہ ان حالات میں اکثریت کی ذمے داری زیادہ ہوتی ہے، مگر صرف یہ کہنے سے کام نہیں چلتا کہ جب تک اقلیت کو انصاف نہ ملے گا اس وقت تک وہ قومیت کے تجربے میں حصہ نہ لے گی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا قومیت کے تجربے کو کامیاب بنانے کے سلسلے میں جو فرض ہے وہ صرف اس وجہ سے ڈھل نہیں جاتا کہ ہندوستان کی اکثریت یا حکومت بہت سی باتیں جمہوریت کے خلاف کرتی ہے۔ خواب اور حقیقت نصب العین اور عمل میں خلیج ہمیشہ ہوتی ہے مگر جتنی ہی کوئی قوم پختہ ہوتی ہے اتنی ہی یہ خلیج کم ہوتی ہے۔ ابھی قومیت ہمارے یہاں راسخ نہیں ہوئی ہے۔ ہاں یہ بات اہم ہے کہ چین کے ہماری سرحد پر در آنے سے ملک میں یک جہتی کی فضا خود بخود قائم ہوئی ہے۔

شر سے کبھی کبھی خیر بھی برآمد ہوتا ہے۔

اس لئے یہ کہنا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل قومیت کے فروغ کی وجہ روشن نہیں ہو سکتا، ایک فریب ہے اس وقت ہندوستانی مسلمانوں میں ایک عجیب بددلی اور مایوسی ہے۔ ہماری سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ ہے کہ یہ بددلی اور مایوسی ایک نفسیاتی مرض کی وجہ سے ہے۔ اکثریت کے قصور کم نہیں، مگر اکثریت کو الزام دے کر کچھ کرنے کی ضرورت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ کچھ کرنے میں محنت پڑتی ہے، ذہن وقت کو اس کام میں لگانا پڑتا ہے۔ بددلی اور مایوسی میں بظاہر ہمارا کچھ نہیں جاتا۔ سب قصور دوسروں کا ٹھہرتا ہے۔ لوگ ہمیں موقع ہی نہیں دیتے۔ ہر جگہ ہمارے ساتھ برا برتا جاتا ہے ہر دروازہ ہمارے لئے بند ہے۔ یہ غیر مذہبی ریاست محض ڈھونگ ہے یہاں ابوالکلام آزاد کی حیثیت محض جمہوریت کے (شو بوائے) کی تھی۔ یہ الفاظ ۱۹۴۵ء میں دہلی میں ایک مسلم لیگی مسلمان نے کہے تھے۔ اب ذاکر حسین نائب صدر ہوئے تو اس خیال کے ایک بزرگ نے کہا کہ ہندو ان سے نہ معلوم کیا کام لینے والے ہیں۔ اس مریض ذہنیت کا کیا علاج ہے۔ نفسیات میں مظلومیت کے تخیل کی اصطلاح عام ہے۔ اس مرض کے شکار اب بھی بہت سے لوگ ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ آزادی کے بعد جو ہندو مسلم فسادات ہوئے ہیں ان سے ہم آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں مسلمانوں کی طرف سے پہل سمجھ میں آنے والی چیز نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ کسی غیر ذمہ دار آدمی نے کوئی نازیبا حرکت کی ہو اللہ یہ غیر ذمے دار آدمی اتفاق سے مسلمان ہو۔ غیر ذمہ دار آدمی ہر مذہبی گروہ میں مل جائیں گے اور ایک سیدھے سادے حساب کے مطابق اکثریت میں برے لوگوں اور اچھے لوگوں کی تعداد، ہمیشہ اقلیت کے برے اور اچھے لوگوں سے زیادہ ہوگی، اس لئے ان فسادات کی ذمہ داری سے اکثریت سبکدوش نہیں ہو سکتی۔ مگر اقلیت اگر ان سے یہ اثر لیتی ہے کہ اور بھی اپنے خول میں سکڑ جاتی ہے، اور بھی قومی زندگی سے ہٹ جاتی ہے، اور بھی اپنی

...ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی تعمیر میں لگ ... خود کو ...
ایک احساسِ مظلومیت اور عدمِ تحفظ ...
ان کی بد ملیوں اور امکانات کو نظر انداز کر دیں تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہوگی ۔ اگر
اکثریت ... ، اقلیت سے بار بار وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ غلط ہے ۔
... وفاداری کا سرٹیفکٹ کسی سیاسی پارٹی یا کسی افسر سے حاصل کرنا نہیں ہے ، ہاں اپنے
ذہن کو ٹٹولنا ہے اور دیکھنا ہے کہ ہمارے دل کے کسی گوشے میں ہندوستانی قوم کی کوئی تصویر
ہے یا نہیں ، ہندوستان کی یہ تصویر دھرتی کی محبت اور گھر کی محبت اور پڑوسیوں کی محبت کر
... ۔ یہ ایک سیاسی مفاد ، ایک مشترک نظامِ زندگی ، ایک مشترک تہذیب اور
ایک مشترک نصب العین سے محبت ہے ۔ یہ زندگی ، تہذیب اور نصب العین ... بنیادی زندگی
کے لئے ہے ، روحانی غذا ہمیں اسلام سے ہی مل سکتی ہے اور ملے گی ۔ اسلام اتنا وسیع ، جامع
اور ہمہ گیر دائرہ رکھتا ہے کہ اس میں عرب کے مسلمانوں ، انڈونیشیا کے مسلمانوں ، ہندوستان
کے مسلمانوں ، سب کے لئے اپنی اپنی قومیت کا جزو لاینفک ہوتے ہوئے ذہنی آسودگی اور ...
خوش حالی کا امکان ہے ۔ عرب ، انڈونیشیا اور پاکستان میں مسلمان اکثریت میں ہیں ۔ ان کے لئے
سوال یہ ہے کہ وہ اسلام کے راستے پر چلتے ہوئے کس طرح موجودہ دور کی بھول بھلیاں سے
نکل سکتے ہیں ، کس طرح حال کے پیچ و خم کو ہموار کر سکتے ہیں ، کس طرح اپنی اور انسانیت کی
خدمت کر سکتے ہیں ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے دوسرا سوال ہے اور یہ سوال پہلے
سے کم اہم نہیں یہاں اکثریت غیر مسلم ہے مگر مسلمانوں کی تعداد پانچ کروڑ کے لگ بھگ ہوگی ۔
مسلمانوں کی اتنی بڑی آبادی جس کے پیچھے ایسی شاندار تاریخ ہے جس کا ہماری مشترک تہذیب
اور قومی زندگی میں ایسا نمایاں حصہ رہا ہے جو کشمیر سے کیرالا تک اور کلکتے سے کچھ تک پھیلی
ہوئی ہے ، یہاں بھی ایک رول رکھتی ہے ۔ ولفریڈ کینٹ ویل اسمتھ جس نے اسلام کا نہایت
ہمدردی سے مطالعہ کیا ہے اور جو اسلام کے غیر فانی کارنامے کا قائل ہے ۔ اپنی کتاب جدید تاریخ میں اسلام

ہندوستان کے باب میں لکھتا ہے :-

"ہندوستان میں اسلام دوسروں سے رشتے قائم کرنے کی ضرورت کو ایک نقطے پر مرکوز کرتا ہے ... ضرورت کی ایک علامت ہے۔

دوسروں کی طرح اسلام کو اس منزل پر اپنی تخلیقی صلاحیت کا ثبوت دینا چاہیئے اور غالباً یہ سبق وہ ہندوستان میں سیکھے گا" (صفحہ ۲۹۱)

... کے نزدیک ہندوستان کی غیر مذہبی ریاست میں اسلام کا جو مقام ہوگا اس کے مطابق اسلام اور ہندوستان دونوں کی تاریخ لکھی جائے گی۔ اسی مضمون میں وہ دوسری جگہ لکھتا ہے :-

ہاں ہندوستان اور اسلام دونوں کی تاریخیں ایک حد تک اس جماعت کے (ہندوستانی مسلمانوں) اپنے موجودہ مسائل کے حل میں کامیاب ہونے یا ناکام رہنے پر اور آج کے چیلنج کا مقابلہ کرنے میں اس کی صلاحیت اور سوجھ بوجھ پر تشکیل پائیں گی۔

گویا ہندوستان کے مسلمانوں کے رویئے پر ایک حد تک ہندوستان اور اسلام دونوں کے مستقبل کا فیصلہ ہوگا۔ ہندوستانی مسلمان اگر ہندوستان کی قومی جمہوریت کو کامیاب بنانے میں تن من دھن کی بازی لگاتے ہیں تو ایک طرف وہ اپنے لئے ایک مرکز، ایک محور پاتے ہیں۔ ہندوستانی قوم سے گہری ذہنی اور جذباتی وابستگی انھیں اپنے آپ کو پانے کا موقع دے گی اور قوم ان کی وجہ سے قدیم ہند کے تخیل سے آزاد ہوکر، ہندوستان کی پوری تاریخ اور اس کی مشترک تہذیب سے لو لگانے میں فخر سمجھے گی۔ یہ کام ایک حد تک تو زمانہ کرائے گا، اور ہمارا بیدار طبقہ اس کے لئے کوشش بھی کر رہا ہے، مگر پھر پوری قوم کے یہاں قدیم وجدید کی ایسی شدید کشمکش نہ رہے گی جو اس کی ترقی کی رفتار پر برا اثر ڈال سکے۔ پھر اسلام کے عالم گیر مشن کے لئے بھی یہ ایک تجربہ ہوگا۔ دنیا کا نقشہ اب کچھ اس طرح کا بن رہا ہے کہ ایک ملک میں مختلف مذاہب کے ماننے والے قابل لحاظ تعداد میں ملتے ہیں۔ ایسے بہت سے ملک ہیں جہاں مسلمان اقلیت میں ہوتے ہوئے اتنی بڑی تعداد میں ہیں کہ ان کے رول سے پوری قوم کی رفتار پر اثر پڑتا ہے۔ ایسے ملکوں میں ہندوستان کی ایک

خاص اہمیت ہے۔ اس لئے ہندوستانی قوم اگر اپنے جمہوری نظام، قومی بنیاد، غیر مذہبی ریاست
کے تصور کو زندگی کے ہر شعبے میں جاری وساری دیکھنا چاہتی ہے تو اس کا یہ فرض ہوگا کہ وہ ہندوستانی
مسلمانوں کو مرفّہ اور مطمئن رکھے اور ان کے روحانی سرمائے کو جو اسلام کے نام سے دنیا کے سامنے
ہے، اپنائے اور اس سے حسب توفیق مدد لے۔ یہ مدد شراب بندی کے قوانین اور ہندو کوڈ بل کے
سلسلے میں اب بھی لی جارہی ہے اور ابھی اس سلسلے میں بہت سے امکانات ہیں۔
سیاسی اعتبار سے ہندوستان دو بڑے گروہوں کے درمیان "ناطرفداری کی پالیسی" پر عمل پیرا
ہے۔ امریکہ کا سرمایہ دارانہ نظام اپنی بہت سی خوبیوں کے باوجود ہندوستان میں ہمیشہ نہیں نافذ
کیا جا سکتا۔ اسی طرح کمیونزم کی فطری اپیل کے باوجود یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کمیونزم اختیار
نہیں کرے گا۔ ہاں ہماری قومی جمہوریت نے سوشلزم کو اپنی منزل قرار دیا ہے اور اقبال تک یہ
کہہ چکے ہیں کہ "اسلام بھی ایک قسم کا سوشلزم ہے"۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستانی قومیت
کے جمہوری تصورات، غیر مذہبی حکومت اور سوشلزم کی منزل میں ایک مسلمان کے لئے نہ صرف
ذہنی تسکین کا بلکہ حوصلے اور ولولے کا سامان بھی موجود ہے۔ مسلمان اگر ایسی جماعتوں کا ساتھ دیتے
ہیں جن کی پالیسی ان مقاصد کے سلسلے میں واضح ہے تو وہ اس طرح ملک کی بھی خدمت کرتے
ہیں اور اپنی بھی۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے :-

۱۔ اسلام اور قومیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہندوستانی مسلمان اسلام کے سچے پیرو ہوتے
ہوئے ہندوستانی قومیت کے علم بردار رہ سکتے ہیں۔ اس راہ میں جو رکاوٹیں ہیں وہ حسن
تدبیر سے دور کی جا سکتی ہیں۔ رکاوٹوں کی ذمہ داری میں سب شریک ہیں۔

۲۔ قومیت کا تصور جیسے جیسے فروغ پاتا جائے گا اور جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہوتا جائے گا۔ اسی نسبت سے اکثریت میں مذہب کی بنیاد پر سیاست کو متعین کرنے کا
جذبہ کمزور ہوگا اور اگر اقلیت مذہبی بنیاد پر سیاست نہیں چلائے گی تو یہ عمل اور جلد ہوگا۔

۴۔ ہر گروہ کو علاوہ ایک روحانی مرکز کے ایک دیبوی مرکز کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایسا مرکز قومیت فراہم کر سکتی ہے۔ اس کا مذہب اس دینوی مرکز کے راستے میں حایل نہیں ہوتا۔

۵۔ ہندوستانی مسلمانوں کے دینوی، سیاسی اور کاروباری مفادات دوسرے مذہب کے ایسے ہی لوگوں کے ساتھ ہیں۔ ایک مسلمان کلرک کا مفاد ایک ہندو کلرک کے ساتھ، ایک مسلمان اُستاد کا ہندو استاد کے ساتھ، ایک مسلمان سرمایہ دار کا ہندو سرمایہ دار کے ساتھ ہے۔ نظام حیدرآباد نواب رام پور یا لمبئی کے مسلمان سیٹھوں کے ساتھ نہیں۔

۶۔ جس طرح ہندو مہاسبھا، رام راجیہ پریشد اور جن سنگھ کی مذہبی بنیاد پر سیاست غلط ہے، اسی طرح مسلم لیگ یا جماعت اسلامی کی سیاست بھی غلط ہے بلکہ اقلیت میں مذہب کی بنیاد پر سیاسی جدوجہد، اکثریت میں غلط جذبات کو اور اشتعال دے سکتی ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی خدمت کے لئے غیر مذہبی سیاست نے راستہ کھول دیا ہے۔ اسے ایسی حقیقت بنانا چاہیے کہ ہر منزل پر اس پر عمل ہو۔ مسلمان ایسا کر سکتے ہیں اور اس طرح اسلام کے لئے دوسروں میں میلان پیدا کر سکتے ہیں۔

۷۔ اقلیت کو اپنا جمہوری حق ضرور مانگنا چاہیے اگر قومی زندگی میں بھرپور شرکت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ پہلے حق ملے تب مدد ہو۔ فرائض کے ادا کرنے میں سودے بازی نہیں چلتی۔

۸۔ مولانا آزاد نے سب سے بڑی خدمت یہی کی کہ اپنی تفسیر قرآن کے ذریعہ اسلام کی حقیقی تعلیم پر روشنی ڈالی اور اپنی زندگی کے ذریعہ سے یہ ثابت کیا کہ قومی زندگی میں دل و جان سے شرکت ہی اقلیتوں کے لئے صحیح راہ عمل ہے۔ ان کی یاد کافی نہیں، ان کے نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔

۹۔ وفاداری ریاست (اسٹیٹ) سے ہوتی ہے حکومت سے نہیں، قوم سے ہوتی ہے کسی سیاسی

[illegible]ستانی مسلمانوں کا تعلق خواہ کسی سیاسی پارٹی سے ہو انہیں ہر حال میں ریاست سے اپنا [illegible]مضبوط رکھنا چاہیئے۔ رشتے کا تعلق ذہن اور دل سے ہے، اسے کسی دکھاوے کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ رشتہ موجود ہے تو اچھی بات ہے۔ اور اگر نہیں ہے تو اسے پیدا کرنا چاہیئے مصلحت کی طرف سے نہیں اصولی طور پر۔ اقبال نے درست کہا ہے ؎

"پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ"

۱۱- اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کو قومی زندگی سے ہم آہنگ کرنے کے لئے بہت بڑی تحریک کی ضرورت ہے۔ اگر ایسے کام میں دیر کی گئی تو نقصان ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں سرسید کی مثال مفید ہو سکتی ہے جس طرح سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سے ایک ذہنی انقلاب برپا کیا اور ہندوستان کے مسلمانوں کو جذباتیت اور مشرقیت کے محدود تصور سے نکال کر عقلیت اور آفاقیت کی طرف لائے، اس طرح آج ایک اور تہذیب الاخلاق کی ضرورت ہے جو ہندوستانی مسلمانوں کو ایک طرف قومیت سے ہم آہنگ کرے، دوسری طرف عالمی افکار کو جذب کر کے، ان کو اس قابل بنائے کہ وہ موجودہ دور میں اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

۱۲- اس کام کے لئے ایسے مسلمان ہی آگے آسکتے ہیں جن کا حکومت سے تعلق نہ ہو۔ ان کے لئے قدیم و جدید دونوں علوم سے واقف ہونا ضروری ہے۔ آج وہی لوگ ہندوستانی مسلمانوں کی قیادت کر سکتے ہیں جو ایک طرف اسلام کی تعلیم سے اور اس کی تاریخ سے اچھی طرح واقف ہوں، دوسرے جو ہندوستان کی تاریخ کا اور اس کے ادبی سرمائے کی اہمیت کا احساس رکھتے ہوں اور تیسرے جن کا ذہن جدید علوم کی روح تک پہنچے اور ان سے اپنے طور پر کسب فیض کرنے کے قابل ہو۔

۱- ہمارے یہاں ہر تحریک سے بہت جلد نتائج کی توقع ہوتی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کو سیاست سبز باغ دکھاتی ہے اور اس کے سامنے نتائج کی تصویر اس طرح آتی ہے جس طرح مشین میں اکنی ڈالی اور ٹکٹ نکل آیا۔ قومی زندگی میں صالح رجحانات کی تعمیر بڑا خلوص، پیہم ریاض اور ناقابلِ شکست حوصلہ چاہتی ہے۔ اس لئے اس لائحہ عمل کو فوری سیاست کے خطوط پر نہیں ذہنی اور تہذیبی سطح پر چلانا چاہیئے۔ اس کے نتائج خواہ دیر میں نکلیں مگر وہ دیرپا ہوں گے۔ بقول ثاقب لکھنوی ؎

مکاں منعم کا سونے سے یہ خونِ دل سے بنتا ہے
خس و خاشاک کا گھر بھی بڑی مشکل سے بنتا ہے

مولانا آزاد کی شخصیت کی چند جھلکیاں

مولانا غلام رسول مہر

مولانا آزاد مرحوم و مغفور کی وفات کو پانچ سال پورے ہو گئے، چھٹا شروع ہوا ہے جس طرح دن ہفتے اور ہفتے سال بنے، اسی طرح سال قرن اور قرن صدیاں بنتے جائیں گے۔ مولانا کے وجود گرامی کی بدولت جو مسندِ ارشاد و ہدایت جنّت نگاہ اور فردوسِ قلب و روح تھی، وہ دوبارہ خدا جانے کب ویسی ہی ضیا باریوں اور جلوہ کاریوں سے مطلع انوار کی صورت اختیار کر سکے گی۔ ڈھلنے کے انداز بدل گئے۔ وہ سانچے ہی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئے، جن میں دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتیں اور فکر و عمل کی نادرِ روزگار استعدادیں تربیت پا کر ابو الکلام آزاد بن سکتی تھیں۔ دین و سیاست، علم و تحقیق، فلسفہ و حکمت، ادب و شعر، دعوت و ارشاد، غرض کونسا دائرہ تھا، جس میں مولانا کے فضائل و کمالات سب سے جداگانہ انداز میں بصیرت افروز اور حقائق آزمونہ ہوئے؟ محاسن و مکارمِ عمل کا کون سا میدان ہے، جس میں انھوں نے متواتر چھیالیس برس تک علم برداری کی عظمت و شان کے ساتھ جہاد کی دعوتیں نہ دیں؟ کیا کہا جا سکتا ہے کہ کتنی مختلف النوع زندگیاں ایک وجود میں سمٹ آئی تھیں؟ کون انکار کر سکتا ہے کہ ان کا جو بھی پہلو سامنے آجاتا تھا، وہ یگانگی و یکتائی میں سراسر حیرت افزا نہ ہوتا تھا؟ ایسی شخصیت کے متعلق کچھ لکھنے کے لئے جو صلاحیتیں درکار ہیں، وہ کہاں سے لائی جائیں اور اپنے ما فی الضمیر کو مناسب سلیقے سے کیونکر معرضِ تحریر تک پہنچائیں۔

پھر زمانے کی خیرہ ذوقی و سطحیت دوستی کچھ کم حوصلہ فرسا نہیں کہ اس اعجوبۂ دہر وجود مبارک و مسعود کے چند نمایاں اوصاف کا سرسری ذکر بھی کرتے وقت دس مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔

سے شروع کی جائے اور کونسا پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے کہ جو کچھ کہنا مقصود ہے کہا جا سکے۔ وہی مرزا غالب والا معاملہ ہے۔

نرخ فروشم در تموز دگلبہ دوراز چار سو ست
سے دود سرمایہ از کف تا خریدارے رسد

نپولین کی اطالوی مہم

فرانس کی پہلی جمہوریت کے ڈائرکٹروں نے نپولین کو اطالوی مہم کا سالارِ اعظم بنایا تھا تو ایک ڈائرکٹر کی زبان سے بے اختیار نکل گیا: "جنرل! آپ کی عمر بہت کم ہے"۔ نپولین نے برجستہ جواب دیا: "ایک سال میں یا تو میں بوڑھا ہو جاؤں گا یا مر جاؤں گا"۔ یعنی یا تو ایک سال میں ایسے کارناموں کے انبار لگا دوں گا، جو ہمیشہ درخشاں رہیں گے اور انھیں مشہور سن رسیدہ جرنیل بھی باعثِ فخر سمجھیں گے یا کسی میدانِ کارزار میں گولی میری زندگی کا خاتمہ کر دے گی۔

اس وقت نپولین ستائیس سال کا تھا اور واقعی ایک سال کی مدت میں وہ اپنے کارناموں کی بدولت سکندر، ہنی بال اور سیزر جیسے یگانہ سالاروں کی صف میں پہنچ گیا تھا اور فنِ حرب میں ایک یک قلم نئے دور کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

انجمن حمایت اسلام میں تقریریں

مولانا نے پہلی مرتبہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں تقریر فرمائی تھی تو وہ عمر کی سولھویں منزل میں تھے اور اس زمانے میں انجمن کے سٹیج پر ممتاز اصحابِ علم و فضل کو بھی بہ مشکل بار ملتا تھا۔ یہ تقریر اتنی مسلسل، مربوط، مدلل اور عام تقریروں سے بہ ہر لحاظ اتنی مختلف تھی کہ مولانا ثناء اللہ مرحوم و مغفور نے فرمایا: "ہم تو تھے پسنجر ٹرین، ہمارے بعد کلکتہ میل آرہی ہے"۔ اس زمانے میں کلکتہ میل کو رفتار کی تیزی اور ہنگامہ خیزی کے باعث تمام ٹرینوں پر بدرجہا فوقیت حاصل تھی۔ مولانا آزادؔ کے وطن کی نسبت سے "کلکتہ میل" کے ساتھ تشبیہ میں جو لطف تھا، وہ تشریح سے بے نیاز ہے۔

واقعہ تھا۔ آئندہ سال مولاناؒ دوسری مرتبہ انجمن کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے۔ یہ اجلاس [illegible] اپریل ۱۹۰۵ء کو منعقد ہوا۔ ۲۲ اپریل کو انھوں نے تقریر فرمائی۔ اس کا موضوع تھا: اسلام [illegible] آئندہ میں؟۔ اس وقت مولاناؒ سترھویں سال میں تھے۔ یہ تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ صدر اجلاس نے حاضرین کو خوش خبری سنائی، آزاد صاحب کل پھر تقریر فرمائیں گے۔ چنانچہ ۲۳ اپریل کو مولاناؒ نے دوبارہ تقریر کی۔ انجمن کی روداد مظہر ہے کہ تقریر پر صدر اجلاس نے:

"لکچرار کی خوش بیانی نہیں، جادو بیانی کی داد دی اور ان کی درازئ عمر کے لئے دعا کی۔"

مولاناؒ کے بڑے بھائی بھی اس سفر میں ساتھ تھے۔ انھوں نے بھی تقریر نیز ایک نظم سنائی انجمن کی روئداد میں ان کا تعارف یوں کرایا گیا ہے: "آزاد صاحب کے بڑے بھائی مولوی غلام یسین صاحب آہ۔"

شہرت سے بے پروائی

سترہ سال کی عمر میں مولاناؒ کی سحر بیانی کے کرشمے آپ نے ملاحظہ فرمائے۔ اب شہرت و اشاعت سے بے نیازی کی شان دیکھیے۔ انجمن کی روئداد میں ایک جگہ مرقوم ہے:

"افسوس ہے کہ باوجود متعدد تقاضوں کے آزاد صاحب نے لکچر قلمبند کر کے نہیں دیا اور اس لئے شامل روئداد نہیں ہو سکا۔"

دوسری جگہ لکھا ہے:

"چونکہ یہ تقریر قلم بند ہو کر نہیں ملی، اس واسطے درج نہیں کی جاتی۔"

مگر مولاناؒ کے بھائی ابو النصر غلام یسین آہ کی تقریر اور نظم دونوں اس روئداد میں شامل ہیں۔ گویا عمر کے ابتدائی مرحلے میں بھی مولاناؒ کی طبیعت کو صرف ضروری کاموں سے دل بستگی تھی۔ یہ خواہش نہ تھی کہ ان کا نام چھپے اور ان کی تقریریں روئدادوں میں چھپیں، حالانکہ اس عمر میں اکثر نوجوانوں کی دلی آرزو یہی ہوتی ہے کہ ان کی کہی ہوئی ہر بات انتہائی اہتمام سے اشاعت

تے۔ مولاناؒ کے دوسرے اوصاف وخصائص کی طرح شہرت وناموری سے بے نیازی بھی قدرت کی ایک خاص بخشش تھی اور جن لوگوں کو مولاناؒ کی زندگی کے حالات سے واقفیت ہے، وہی اس بے نیازی کی حقیقی حیثیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔

مولانا کا عقیدہ

جو کچھ انھوں نے کہا یا لکھا یا کیا، اس کی حفاظت کے اہتمام سے بے پروائی میرے نزدیک ان کے اس عقیدے کا نتیجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات ہستی کے قیام واصلاح کے لئے بقائے انفع" کا قانون ٹھہرا دیا ہے۔ یہاں وہی چیز باقی رہ سکتی ہے، جس میں نفع ہو۔ جس میں نفع نہیں وہ ٹھہر نہیں سکتی اور نابود ہو جائے گی۔ یہی حقیقت "حق" اور "باطل" کی ہے۔ "حق" وہ ہے جو نافع ہو۔ ٹکنا ثابت ہونا اور باقی رہنا اس کا قدرتی خاصہ۔ باطل وہ ہے جو نافع نہیں، اس لئے اس کا قدرتی خاصہ ہی یہ ہوا کہ مٹ جائے اور محو ہو جائے۔ قرآن نے "اصلح" نہیں "انفع" کی اصطلاح استعمال کی، کیونکہ "صالح" وہی ہے جو نافع ہو۔ کارخانۂ ہستی کی فطرت میں بناوٹ اور تکمیل ہے اور تکمیل تبھی ہو سکتی ہے کہ صرف نافع اشیاء باقی رکھی جائیں، غیر نافع چھانٹ دی جائیں۔

انھیں یقین تھا کہ اگر ان کے دل ودماغ کے نتائج نافع ہیں تو بہر حال محفوظ رہیں گے، اگرچہ ان کی حفاظت کے لئے کوئی خاص اہتمام وہ خود نہ کر سکیں۔ اگر نافع نہیں تو حفاظت وپاسبانی کے سینکڑوں سہارے مہیا کر دینے کے باوجود وہ چھانٹ دیئے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہر علمی، ادبی، ثقافتی یا دینی ادارے کی حفاظت وترقی کے لئے ہر ممکن انتظام فرمادیا مگر اپنے افادات کی حفاظت کے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ تاہم بقائے انفع کے قانون کی کارفرمائی دیکھئے کہ وہ افادات محفوظ ہوتے رہے، ہو رہے ہیں اور ہوتے جائیں گے، کیونکہ وہ نافع ہیں اور ان کا نفع وقتی نہیں، دوامی ہے۔

"الہلال" اور صحافت

انجمن حمایت اسلام کی جس تقریر کا ذکر میں نے پہلے کیا، اس سے تقریباً سات سال بعد

مولانا نے "الہلال" جاری کیا جس کی کوئی مثال تاریخ صحافت اردو میں نہ پہلے موجود تھی اور نہ اس کے بعد آج تک منظر عام پر آسکی، حالانکہ پہلے "الہلال" کے عہد پر آج باون سال پورے ہو گئے ہیں [illegible] "الہلال" کی بندش پر بھی چھتیس سال گزر چکے ہیں۔ مولانا نے تنہا اس کے اجراء کی ذمہ داری قبول کی تھی اور وہ یقیناً علم و فضل کا نادر گنجینہ تھے، مگر ارباب ثروت میں شمار نہیں ہوتے تھے جو صرف صحیفہ نگاری کے شوق میں اپنا سرمایہ لٹا دینے پر آمادہ ہو گئے ہوں۔ اس وقت ان کی عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال کی تھی اور اخبار نویسی کی کل مدت کتنی ہوئی؟

۱۔ "الہلال" (دور اوّل) دو سال چار مہینے

۲۔ "البلاغ" (ایک سال کے وقفے کے بعد، صرف پونے پانچ مہینے

۳۔ "الہلال" (دورِ ثانی") چھ مہینے

کل زیادہ سے زیادہ سواتین سال۔

وسعتِ نظر اور اصابت رائے

اگر اس مختصر سی مدت کے کارناموں پر سرسری نظر بھی ڈالی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو جائے۔ اس میں بتانا ہوگا کہ چوبیس سال کے اس نوجوان نے اچانک نمودار ہو کر علم و عمل اور فکر و نظر کے دوائر میں کیسے بنیادی انقلاب پیدا کر دیئے؟ ہر گوشے پر کتنے گہرے اثرات ڈالے کون سا معاملہ تھا جو مولانا کے سامنے آیا اور اس پر ایسی سیر حاصل، دل نشین اور یقین افروز بحث نہ کی گئی کہ اس بارے میں دوبارہ کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی رہ جاتی۔ پھر ہر رائے پختہ، صائب محکم، اس قدر سوچی سمجھی ہوئی اور اس درجہ تلی کہ دوسرے کے لئے معقول اختلاف کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فردِ فرید نے پیش آنے والی ہر منزل کا پہلے ہی سے پورا جائزہ لے رکھا ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں کام کیوں کر انجام پانا چاہیئے فلاں مرحلہ کس سروسامان کے ساتھ طے کرنا چاہیئے؟ فلاں گھاٹی سے گزرنے کی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں؟ اگر میں یہ کہوں کہ مولانا نے ہر مسافت کے موڑ شمار کر لیتے تھے، ہر راستے کے

تمرین رکھتے تھے اور ہر دشت پیمائی کے خارزاروں کا حساب لگا لیا تھا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا اسے حقیقت کا ایک دھندلا سا خاکہ تصور کرنا چاہیئے۔

مختلف پہلو

پھر بعض اور پہلو بطورِ خاص در خورِ تصریح ہیں۔ مثلاً

۱۔ مولانا کی ہر توضیح، ہر تبیین اور ہر تصریح مستفسر یا معترض کی محض دماغی خلشیں ہی دور نہ کر دیتی تھی، بلکہ دل و روح کے لئے بھی انتہائی تسکین و طمانیت کا پیغام ہوتی تھی۔ یہ دولت انھیں انبیائے کرام کے طریقِ دعوت و خطاب کے تتبع سے ملی۔ ان کی تحریریں محض علمی اعتبار ہی سے یگانہ نہیں ہوتی تھیں، بلکہ عدرجہ یقین افروز بھی تھیں اور ان سے ایمان میں تازگی و شگفتگی آتی تھی۔

۲۔ وہ اپنے عقائد میں چٹان کی طرح ثابت و مستقیم تھے، مگر مقامِ دعوت میں کبھی کسی اسلامی فرقے سے انتساب قبول نہ کیا اور حق جس فرقے کی جس بات میں نظر آیا، اسے بے تکلف پیش کیا۔

۳۔ وہ ہر معاملے میں نیک کو بد سے اور حق کو باطل سے الگ کر لیتے تھے۔ اسی طرح اصول و فروع میں امتیاز قائم رکھتے تھے۔ اچھائی اور سچائی کو ان کے یہاں بہر حال تقدم حاصل تھا اور اس کی تائید و حمایت میں کبھی انھوں نے تامل نہ کیا، اگرچہ وہ ان کے سخت مخالفوں ہی میں ہوتی تھی۔ یہ خصوصیت ان سے پہلے بہت کم دیکھنے میں آئی۔

۴۔ ان سے پیشتر یہ دستور تھا کہ جب کسی پر ابتلاء کا دور آتا تو عموماً رنج و افسوس شروع ہو جاتا مگر مولانا نے ابتلاؤں کا خیر مقدم اس شانِ محبوبیت سے کیا کہ لوگوں کے دل سے ہر قسم کا ہراس کلیتہً زائل ہو گیا، بلکہ لوگ ابتلاؤں کی طرف مجاہدانہ پیش قدمی کرنے لگے، کیونکہ یہ سفرِ جہادِ آزادی کی ناگزیر منزلیں تھیں۔ مولانا کا یہی نقطۂ نگاہ تھا

جس نے بالآخر حکومت کو تدابیر تشدد میں ایک حد تک متوقف کر دیا، کیونکہ وہ بے سود ثابت ہو رہی تھیں۔ خواجہ حالیؔ کا یہ شعر تو سب پڑھتے تھے، مگر اسے روحِ عزم [illegible] بنا دینے کا کام صرف مولانا آزادؔ کے ہاتھوں پورا ہوا:

تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

• "الہلال و البلاغ" کے متعلق متعدد غلط فہمیاں، مختلف اصحاب تحریرات میں نظر آئیں، لیکن اس موضوع پر رشتۂ بیان کھل جائے تو کوئی دوسرا معاملہ پیش کرنے کی نوبت ہی نہ آئے گی، لہٰذا میں اس بحث کو کسی دوسری فرصت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔

خلافت کانفرنس

اواخر مارچ ۱۹۱۶ء میں مولانا کے لئے بنگال سے اخراج کا حکم صادر ہوا۔ اس وقت تک بعض دوسرے صوبوں میں بھی ان کا داخلہ ممنوع قرار پا چکا تھا۔ بہار کے سوا وہ کسی صوبے میں جا نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ کلکتہ سے رانچی چلے گئے۔ اس وقت تک امید تھی، کہ وہ رانچی سے مضمون بھیجتے رہیں گے اور "البلاغ" جاری رہے گا، مگر چند روز بعد رانچی میں انھیں نظر بند کر دیا گیا اور دعوت و تذکیر کے جاری رکھنے کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۹ء کو وہ نظربندی سے رہا ہوئے۔ چند روز رانچی میں بھی ٹھہرے رہے تاکہ اپنے کاغذات اور کتابیں سمیٹ سکیں۔ اور یہی ان کا سب سے قیمتی سامان تھا۔ اوائل جنوری ۱۹۲۰ء میں کلکتہ پہنچے۔ ۲۸، ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو کلکتہ میں خلافت کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ ہوا اور خود مولاناؔ کو اس کانفرنس کا صدر چن لیا گیا۔ دو ماہ سے بھی کم مدت میں گوناگوں مصروفیتوں کے باوصف انھوں نے خطبۂ صدارت مرتب کیا، جو دو سو صفحات پر مشتمل تھا۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کی شرعی حیثیت انتہائی تفصیل سے مدلل و دلنشیں انداز میں واضح کی گئی۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے سامنے تفصیل سے لائحۂ عمل پیش کر دیا گیا یہیں سے

اس شہرۂ آفاق تحریک کی بنیاد پڑی، جس نے یہاں "ترک موالات" اور "لاتعاون" کا نام پایا۔ واضح رہے کہ کانگریس نے لاتعاون کی قرارداد اگست ۱۹۲۰ء میں منظور کی تھی اور مولاناؒ اس کی تحریک چھ مہینے پیشتر فرما چکے تھے۔ اس وقت تک لوگوں کے کان بھی تعاون اور ترک موالات کے ناموں سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ اس زمانے میں مولاناؒ کی عمر زیادہ سے زیادہ تیس سال کی تھی۔

خطبے کی شانِ یگانگی

یہی خطبہ تھا، جو ترک موالات کی پوری تحریک میں مسلمانوں کے لئے روشنی کی قندیل بنا رہا۔ اسی سے خلافت اور جزیرۃ العرب کے تقدس کے لئے شرعی، عقلی اور سیاسی دلیلیں حاصل کی گئیں۔ اسی سے مسلمانوں کو ملّی قومی اور اجتماعی فرائض معلوم ہوئے۔ بعد ازاں طول و عرض ملک میں جتنے خطبے دئے گئے، جتنی تقریریں ہوئیں دعوت و ارشاد کی جتنی مسندیں آراستہ کی گئیں، اخباروں نے تحریک کی حمایت میں جو کچھ لکھا، ان سب کا سرچشمۂ معلومات مولاناؒ کا یہی خطبہ صدارت بنا رہا۔ میں بلند آہنگیوں کا نہ عادی ہوں اور نہ انھیں پسندیدہ سمجھتا ہوں۔ تاہم یہ خطبہ آج بھی مطبوعہ صورت میں موجود ہے۔ آپ زیرِ غور موضوع کے متعلق پیشتر اور بعد کے ذخیرۂ کتب یا انبار صحائف دعوت و ارشاد پر ایک غائر نظر ڈال لیں اور فرمائیں کہ آیا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز میسر آتی ہے؟ ہدایت و رہنمائی کے ماخذ نئے نہ تھے اور نہ ہو بھی نہیں سکتے تھے، کیونکہ مسلمانوں کے لئے کتاب و سنت سے باہر نورِ ہدایت کا وجود ہی نہیں۔ مولاناؒ نے خالصتہً کتاب و سنت کے نصوص سے سب کچھ پیش کیا، مگر وقت کے خاص ماحول، خاص تقاضوں اور خاص ضرورتوں کے پیش نظر جس کمالِ بلوغ نظر سے قوم و ملت کو کتاب و سنت کی روشنی دکھائی اور اس کے مطابق چلنے کی دعوت دی، اس کی کوئی مثال ذخیرۂ ماضی سے سامنے لانا مشکل ہے!

قومی زندگی کی پانچ چیزیں

مثالیں بے شمار ہیں، مگر میں یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ مشہور حدیث ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو پانچ باتوں کا حکم دیا، یعنی: جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد۔ یہ حدیث آپ نے بارہا سنی ہوگی، لیکن اس کی تشریح جس [illegible] انا نے خطبۂ صدارت میں فرمائی۔ اس کا خلاصہ ملاحظہ فرمایئے:

۱۔ "جماعت" سے مقصود افراد کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم ہو۔ پھر ایک ایک چیز کو کھول کر بیان کرتے ہیں۔ اتحاد سے مقصود ہے کہ افراد جماعت اعمالِ حیات میں منتشر نہ ہوں، ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ ائتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ ایک صحیح اور مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو۔ امتزاج میں کمیت سے زیادہ کیفیت پر زور دیا گیا ہے۔ نظم سے مقصود وہ ترتیبی و تنظیمی حالت ہے، جب جماعت کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم، اپنے اپنے دائروں میں محدود اور اپنے اپنے اعمال و فرائض انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

۲۔ دوسری چیز سمع ہے یعنی امام جو حکم دے اسے سننا اور اس سے تعلیم و ارشاد حاصل کرنا۔

۳۔ تیسری چیز اطاعت ہے، یعنی امام کی کامل درجہ اطاعت و فرمانبرداری کرنا اور اپنی تمام عملی قوتوں کو اس کے سپرد کر دینا۔ البتہ طاعت معروف میں ہے نہ کہ معصیت میں۔

۴۔ ہجرت کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ یہ دنیا کے اس عہد جہل و وحشت کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا، لیکن سوچیے کہ کیا دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی ہجرت کی حقیقت سے خالی ہیں؟ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی خاطر کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں انھیں چھوڑ دینا، آرام و راحت، مال و دولت، ملک و وطن، اہل و عیال سب اس

میں شامل ہیں۔

۵۔ جہاد کے معنی ہیں، دفع اعدا میں اپنی جان ومال سے کمال درجہ سعی ومحنت کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی گھر، کوئی وجود جہاد کے بغیر رہ سکتا ہے؟ جس چیز کو ہزاروں ناموں اور لفظوں سے بولا جاتا ہے، اس کو اسلام ایک جامع لفظ جہاد سے تعبیر کیا ہے

عالم گیر صداقتیں

اس تشریح کے بعد جس کا خلاصہ میں نے چند فقروں میں پیش کر دیا، فرماتے ہیں:

یہ کہنا ضروری نہیں کہ یہی پانچ چیزیں دنیا میں قوموں اور ملکوں کے قیام بقا کی اصلی بنیاد ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، جس کی ہستی ان پانچ چیزوں سے مرکب نہ ہو۔ سعی وعمل کا کوئی گوشہ ہو، کامیابی بغیر ان اصول خمسہ کے ممکن نہیں۔ تم مٹھی بھر گیہوں کے طالب ہو یا قطب شمالی کی تحقیق کے، مگر کوئی چیز بغیر جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ دنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے، غور کرو گے تو وہ سب انھیں پانچ سچائیوں کے ثمرات ونتائج نکلیں گے ...... جماعت، تعلیم، اطاعت، ہجرت اور جہاد دنیا کی وہ عالم گیر صداقتیں ہیں، جن کی حقیقت سے کسی فرد وبشر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ دنیا کی کوئی صالح جماعت ایسی نہیں جس نے ان سے الگ رہ کر کامیابی حاصل کی ہو۔ ہر عقل نے ان کا اقرار کیا ہے۔ ہر دل میں ان کا اعتقاد موجود ہے۔ ہر عامل جماعت شب وروز ان پر عمل کر رہی ہے۔ البتہ ناموں کے اختلاف نے ساری الجھن ڈال دی ہے۔ اسلام نے جن ناموں سے انھیں تعبیر کیا ہے، ان سے دنیا کو اختلاف ہے، لیکن اسلام جن حقیقتوں کو پیش کرتا ہے، ان سے دنیا اختلاف نہیں کر سکتی اگر کرے تو زندگی اور مراد سے محروم ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایک خاص شرف یہ عطا کیا تھا کہ دینی حقائق کو زمانۂ حال کی زبان میں اس طرح پیش کرتے تھے کہ وہ دل میں پیوست ہو جاتے تھے۔ دیکھیے منبروں سے یہ الفاظ برابر سنائے جاتے رہے، مگر کہنے والوں کا احساس بھی غالباً یہی تھا کہ یہ پرانی باتیں ہیں اور سننے والوں کے نزدیک بھی ان میں مذہبی تقدس کے سوا کچھ نہ تھا، مگر مولانا نے ان کی تشریح کی تو واضح ہو گیا کہ یہ تو ابدی حقائق اور عالم گیر صداقتیں ہیں۔ جن کے بغیر کوئی قوم، کوئی جماعت اور کوئی جمعیتہ بلکہ کوئی ہستی زندہ ہی نہیں رہ سکتی۔

خطاب بہ ملت

اس خطبے کے آخر میں کس درد و سوز سے ملت کو خطاب کیا ہے:

عزیزانِ ملت! اس طویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں جو میری زبان پر نئی ہو، یہ وہی افسانۂ کہن ہے، جو پچھلے دس سال سے برابر دہراتا رہا۔ اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمھارے حافظے میں فراموش نہیں ہو گئیں تو تم اس کی تصدیق کر سکتے ہو۔ تمھارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدا بلند کر رہا ہو اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے ...... تمھاری اطاعت جس قدر سہل اور تمھاری ارادت جتنی سستی ہے، اتنا ہی تمھارا انحراف آسان اور اسی نسبت سے تمھاری مخالفت بھی ارزاں ہے.... میری رایوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی نہ میرے سفر میں ہیت و لبار کا تذبذب پیش آیا۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں۔ انسانی تقلید اس کا سرچشمہ اور انسانوں اور قوتوں کا اتباع اس کا منبع ہے، لیکن ان عقاید میں کبھی تبدیلی

نہیں ہوسکتی، جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہوں۔ الحمدللہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا، وہ میرے معلومات تھے، آرا و مظنونات نہ تھے .....

تم بارش کے باوجود سے انکار تو نہیں کیا کرتے، مگر منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کرو، لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا خوگر ہوں اور صرف بادلوں کو دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو، فستذکرون، ما اقول لکم و اُفوّض امری الی اللہ، ان اللہ بصیر بالعباد۔

اعترافِ جرم

مولانا تقریباً پونے چار سال رانچی میں نظر بند رہنے کے بعد رہا ہوئے تھے، اس خطبۂ صدارت سے پونے دو سال بعد انھیں تحریکِ ترکِ موالات کے قائد و رہنما کی حیثیت میں گرفتار کر لیا گیا دفعہ ۱۲۴، الف کے تحت مقدمہ چلا اور انھوں نے وہ بیان دیا، جو "قولِ فیصل" کے نام سے مشہور ہوا۔ داعیانِ حق و انصاف کے خلاف جتنے مقدمے آج تک چلے، ان میں سے سب کے بیان محفوظ نہیں۔ آخری دور کے بیانوں میں سے میرے نزدیک آئرلینڈ کے محبِ وطن رابرٹ ایمیٹ کا بیان بہ طورِ خاص قابلِ ذکر ہے، لیکن مولانا کا بیان بے شائبہ مبالغہ اس سے بھی بدرجہا بہتر تھا۔ استغاثے میں کہا گیا تھا کہ مولانا نے دو جگہ ایسی تقریریں فرمائیں، جو دفعہ ۱۲۴۔الف کی زد میں آتی ہیں۔ مولانا نے اپنے بیان میں استغاثے کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا۔ پھر فرمایا:

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے صرف انہی دو موقعوں پر نہیں بلکہ گذشتہ دو سال (۱۹۲۰ء ۱۹۲۱ء) کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ ۱۲۴۔الف کا جرم قرار دیا جائے گا میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا

اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گنا
ہ مجرم سمجھوں۔

یقیناً میں نے کہا ہے کہ موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے، لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا، کیوں مجھ سے توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔ میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ ناانصافی اور حق تلفی سے باز آجائے ..... جو چیز بری ہے، اسے یا تو درست ہو جانا چاہئے یا مٹ جانا چاہیئے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟

آج یہ الفاظ محض ایک روح افروز خواندگی ہیں لیکن اپنے تصور کو آج سے ۳۲ سال پیچھے دور میں لے جائیے، جب حکومتِ برطانیہ نے وسیع اور ہمہ گیر قومی تحریک کو دبانے کے لئے پورے زور سے تشدد شروع کر رکھا تھا اور زخمی شیر کی طرح غیظ و غضب کی تلملاہٹ اس کے ہر اقدام میں نمایاں تھی۔

ظلم کے دلائل

پھر ایک ایک پہلو واضح کیا کہ گورنمنٹ کیوں ظالم ہے مثلاً اس لئے کہ:

۱۔ شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے۔

۲۔ اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا، جو شخصی ہو یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو، وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے۔

۳۔ قومی اور مسلم بیوروکریسی بھی ظلم ہے۔

۴۔ بلاشبہ مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شاہنشاہی کے پُرشوکت افسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ، جو بسا اوقات پھٹے پُرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح ملبوس ہوتا تھا، انھوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی۔ تاہم تاریخ اسلام کا کوئی

عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا، جنھوں نے علانیہ حکام وقت کے استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو۔

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے بالکل ایسی ہی بات ہے جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے۔ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔

۶۔ قرآن سچے مسلمانوں کی پہچان یہ بتلاتا ہے: "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔"

۷۔ قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے: ایمان، عمل صالح، توصیہ حق، اور توصیہ صبر۔

درخشاں مثالیں

پھر فرمایا: اسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔الف نہیں اور تاریخ اسلام سے اس کی مثالیں پیش کیں۔ مثلاً:

الف:۔ خلیفہ ہشام بن عبد الملک نے طاؤس یمانیؒ کو بلایا تو انھوں نے ہشام کا نام لے کر سلام کیا۔ "امیر المومنین" نہ کہا۔ ہشام نے سبب پوچھا تو کہا: "قوم تیری حکومت سے راضی نہیں، اس لئے مجھے ان کا امیر کہنا جھوٹ ہے۔"

ب:۔ مالکؒ بن دینار بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کرتے تھے: "خدا نے ان ظالم بادشاہوں کو اپنے بندوں کا چرواہا بنایا تھا، مگر انھوں نے بکریوں کا گوشت کھا لیا، بالوں کا کپڑا بُن لیا اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں۔"

ج:۔ ہارون الرشید نے سفیانؒ ثوری کو اپنے ہاتھ سے اشتیاق ملاقات کا خط لکھا۔ انھوں نے خط لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "جس چیز کو ایک ظالم کے ہاتھ

نے بھیجا ہے، میں اسے چھونا نہیں چاہتا" خط کا مضمون سنا تو اس کی پشت پر جواب لکھوا دیا، جس کی ابتدا یہ تھی: "خدا کے مغرور بندے ہارون کے نام جس کا ذوق ایمان سلب ہو چکا ہے۔ اسے معلوم ہو کہ تونے قوم کا مال بلا کسی حق کے اپنی تخت نشینی کی خوشی میں لٹایا...... الخ

مجسٹریٹ سرکاری وکیل اور خفیہ پولیس

صاف صاف یہ اعتراف کر لیا کہ میری زندگی سرتاسر دفعہ ۱۲۴۔ الف ہے۔ آخر میں فرمایا کہ میں اپنے ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی چند باتیں کہنا چاہتا ہوں جو اس مقدمے میں میرے خلاف کام کرتے رہے۔ سی۔ آئی۔ ڈی کا کام شرارت اور جہالت دونوں سے مرکب ہوتا ہے، مگر میری جو تقریریں پیش کی گئیں، ان کے اغلاط و نقائص غالباً ناقابلیت کا نتیجہ ہیں۔ پبلک پروسیکوٹر بھی میرا ہم وطن بھائی ہے۔ اس کا ضمیر بارلائے میرے سامنے نہیں، صرف مزدوری ہے جو وہ اس کام کے لئے گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے۔ مجسٹریٹ سے میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں، جو زیادہ سے زیادہ سزا اس کے اختیار میں ہے، بلا تامل مجھے دے دے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میں اپنا بیان اٹلی کے قتیل صداقت گارڈ ینو برونو کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں:

> زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے بلا تامل دے دو، میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے وقت جتنی جنبش تمھارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر بھی اضطراب سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔

آخری فیصلہ

پھر فرمایا:

> مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور حیرت انگیز باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں شریک ہیں

ہمارے حصے میں مجرموں کا یہ کٹہرا آیا ہے، تمہارے حصے میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ، اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلے لکھتے جاؤ۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا، یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ والحمدللہ اولاً و آخراً۔

یہ فیصلہ نہ صرف لکھا گیا، بلکہ مولاناؒ کی زندگی ہی میں نافذ بھی ہو گیا اور جس حکومت کی ایک عدالت نے ۱۹۲۱ء میں مولانا کے لئے سزائے قید تجویز کی تھی، وہ حکومت ایک قرن سے افسانۂ ماضی بن چکی ہے اور اس کی پرچھائیں بھی کہیں نظر نہیں آتی۔

مولانا آزاد کے تعلیمی نظریے

عبداللہ ولی بخش قادری

مولانا ابوالکلام آزاد جنوری ۱۹۴۷ء میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے اور پھر تادم حیات اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ مولانا کی وفات فروری ۱۹۵۸ء کو ہوئی۔ اس طرح انھوں نے اپنی زندگی کے آخری گیارہ سال وطنِ عزیز کے تعلیمی نظام کی تشکیل و تنظیم کے مسائل کو حل کرنے میں صرف کئے۔ ان کی قیادت میں ہماری تعلیم پر سچا قومی رنگ چڑھنا شروع ہوا اور ایک آزاد ملک کے تقاضوں کے مطابق ذہنی و تہذیبی ترقی کی راہیں کھلیں۔ اس زمانے میں مولانا نے اپنے فرائضِ منصبی کے تحت تعلیمی مسائل پر سرکاری اور نیم سرکاری مجالس و مباحث میں بارہا اظہارِ خیال فرمایا۔ ان کے یہ تعلیمی خطبات نہ صرف اپنے زمانے کی حکومتِ ہند کی تعلیمی پالیسی کے آئینہ دار ہیں بلکہ مولانا کے ذاتی تاثرات و نظریات کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ ان میں مولانا کے تبحرِ علمی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے اور لہجے کی بلند آہنگی میں مولانا کی عظیم شخصیت کی عکاسی نظر آتی ہے۔ بسا اوقات مولانا نے ایک ہی خطبے کے دوران میں اپنے ذاتی تاثرات بھی بیان فرمائے ہیں اور حکومت کی نمائندگی بھی کردی ہے۔ مگر یہاں چشم بینا مولانا کی ذات اور وزیر تعلیم کی حیثیت کا فرق دیکھ سکتی ہے۔ یوں تو عموماً ذاتی اور منصبی حیثیت میں اتحادِ فکر کا ثبوت ملتا ہے لیکن کہیں کہیں دیانت دارانہ اختلاف رائے کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ اس لئے یہ گمان کہ مولانا حکومت ہند کی تعلیمی پالیسی کے محض ایک نقیب کی حیثیت رکھتے تھے، نہ صرف مولانا کی سیاسی حیثیت اور علمی وقار کے منافی ہے بلکہ ان کے تعلیمی خطبات سے ناواقفیت بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہماری آزادی[1] میں انھوں نے خود یہ یہ فرمایا ہے کہ "میں نے

---

[1] ہماری صفحہ ۳۵۲ مترجمہ پروفیسر محمد مجیب۔

تعلیم کے میدان میں جس پالیسی اور پروگرام پر عمل کیا وہ ایک الگ کتاب کا موضوع ہوگا۔ ان مسائل پر میرے خیالات یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کئے جا چکے ہیں۔" مولانا کا یہ اشارہ اپنی تقاریر کے اُس مجموعے کی طرف ہے جسے حکومت کے شعبہ اشاعت نے جنوری ۱۹۵۶ء میں شائع کیا اور جس میں ۱۹۴۷ء سے لے کر ۱۹۵۵ء تک کی منتخب تقاریر شامل ہیں۔ مولانا کے اس بیان کے بعد ان کی تعلیمی تقاریر کے محض فرمودات منصبی ہونے کا شبہ کسی طور باقی نہیں رہتا۔ دراصل تعلیمی معاملات میں مولانا کی بصیرت سے متعلق غلط فہمی ان لوگوں کو ہوا کرتی ہے جنھوں نے مولانا کو نہایت ہی محدود معنی میں ایک عالم دین یا سیاسی لیڈر تصور کر رکھا ہے اور جو سمجھتے ہیں کہ مولانا انگریزی زبان و ادب بلکہ پوری مغربی تہذیب سے یکسر نا آشنا تھے۔ اگرچہ مولانا حقیقی معنی میں ایک مفکر اور عالم تھے۔ ان کا دائرہ عمل نہایت وسیع تھا۔ خدا نے انھیں غیر معمولی طور پر ذہین اور بیش رس پیدا کیا تھا۔ وہ طباع بھی تھے اور علم کے شیدائی بھی۔ انھوں نے صرف عربی ادب ہی میں کامل دست گاہ حاصل نہیں کی تھی بلکہ جملہ علوم مشرقی سے شغف رکھتے تھے۔ انھیں انگریزی زبان و ادب سے بھی واقفیت تھی اور وہ مغربی تہذیب و فلسفے میں گہری نظر رکھتے تھے۔ مولانا نے بحر معنی کی شناوری کے ساتھ ساتھ بساطِ سیاست پر اوائل عمری ہی میں قدم رکھا اور وہ بھی ایک صحافی کی حیثیت سے۔ اور پھر ساری عمر کاروبار سیاست کے مرد میدان بنے رہے۔ اس لئے ان کی نظریں زمانے کے پیچ و خم سے خوب آگاہ تھیں۔ وہ مصالح ملکی بھی سمجھتے تھے اور تعلیم کا منصب بھی غالباً یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی کی نگاہ جوہر شناس نے انھیں آزاد ہندوستان کی تعلیمی کشتی کی ناخدائی کے لئے سب سے زیادہ موزوں ٹھہرایا۔

مولانا نے مسندِ وزارت پر جلوہ افروز ہونے سے قبل بھی جا بجا اپنی نگارشات میں اپنے تعلیمی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے موقع پرستی کے تحت قلم دانِ وزارت نہیں سنبھالا تھا بلکہ اپنے مزاج کی مناسبت و مطابقت کے لحاظ سے قومی خدمت کی یہ راہ اختیار کی تھی۔ انھیں آغاز کے وقت خالی الذہن نہیں کہا جا سکتا بلکہ وہ ذہنِ پختہ کار، دلِ حق نگر اور چشمِ بصیرت سب ہی کچھ اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو عقائد کا استحکام بھی حاصل تھا اور بالغ نظری کی کشادگی بھی۔ وہ ایک راسخ العقیدہ

انسان تھے اور ان کی زندگی میں حیرت انگیز طور پر اتحادِ فکر کی جلوہ نمائی نظر آتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۹ء میں تذکرہ[1] کے اندر انھوں نے لکھا تھا کہ "انسان کے لئے معیارِ شرف جوہرِ ذاتی اور خود حاصل کردہ علم و عمل ہے نہ کہ اسلاف کی روایاتِ پارینہ اور نسب فروشی کا غرورِ باطل۔ ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے سارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ یہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرفِ رفتہ کے محتاج ہوں۔" ان کا یہ عقیدہ تمام زندگی ان کے ساتھ رہا۔ غبارِ خاطر میں کئی خطوط کے اندر اُن کے اِن احساسات کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ مثلاً ۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ "انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقائد ہیں .... بسا اوقات موروثی عقائد کی گرفت اتنی سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گردوپیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں کرسکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن اس کی بناوٹ کے اندر نہیں اترے گی۔ بناوٹ کے اندر ہمیشہ نسل، خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات ہی کا ہاتھ کام کرتا رہے گا"۔۔۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ شک کا سب سے پہلا کانٹا جو خود بخود دل میں چبھا وہ اسی تقلید کے خلاف تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ کیوں۔ مگر بار بار یہی سوال سامنے اُبھرنے لگا تھا کہ عقائد کی بنیاد علم و نظر پر ہونی چاہیئے، تقلید اور توارث پر کیوں ہو"۔ ایسے بیانات میں نہ صرف نسل و ماحول کی حیثیت کا واضح تعین موجود ہے بلکہ اُن سے مولانا کے ترقی پسندانہ رجحانات کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی اس اجتہادِ فکر، اصابت رائے اور مستقل مزاجی پر اس لئے اور حیرت ہوتی ہے کہ مولانا خود ایک نہایت ہی مذہبی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور ان کا سارا بچپن خاندانی افتخار و امتیاز کے گہوارے میں گذرا تھا۔

مولانا نے اپنے زمانے کے عام دینی رہنماؤں کی طرح مذہب کو ایک جامد اور مافوق البشر امور تک ہی محدود و پابند نہیں کر رکھا تھا اور نہ وہ دورِ حاضر کی مغربی تہذیب سے مرعوب ہوکر سطحی عقلیت کے سیلاب میں بہہ نکلے تھے۔ وہ دین، فلسفے اور سائنس کے مقام کا بیک وقت

---

[1] تذکرہ، مرتبہ فضل الدین احمد مرزا۔ صفحہ ۲۵ شائع کردہ انارکلی کتاب گھر لاہور۔

دیک تھے۔ انھوں نے اپنے خط مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۴۲ء میں فلسفے، سائنس اور مذہب کے بارے میں بڑی صفائی سے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے کہ "یہ فلسفہ، بلاشبہ طبیعت میں ایک طرح کی رواقی بے پروائی پیدا کر دیتا ہے اور ہم زندگی کے حوادث و آلام کو عام سطح سے بلند ہو کر دیکھنے لگتے ہیں لیکن اس سے زندگی کے طبعی انفعالات کی گتھیاں سلجھ نہیں سکتیں۔ یا یہ بھی ایک طرح کی تسکین ضرور دے دیتا ہے لیکن اس کی تسکین سر تا سر سلبی تسکین ہوتی ہے، ایجابی تسکین سے اس کی جھولی ہمیشہ خالی رہی۔ یہ فقدان کا افسوس کم کر دے گا لیکن حاصل کی کوئی امید نہیں دلائے گا" لیکن سائنس بھی ان کے نزدیک کچھ زائد وقیع نظر نہیں آتی۔ اس خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں کہ "سائنس عالم محسوسات کی ثابت شدہ حقیقتوں سے ہمیں آشنا کرتا ہے اور مادی زندگی کی بے رحم جبریت کی خبر دیتا ہے۔ اس لئے عقیدے کی تسکین اس کے بازار میں بھی نہیں مل سکتی وہ یقین اور امید کے سارے پچھلے چراغ گل کر دے گا مگر کوئی نیا چراغ روشن نہیں کرے گا۔" اس کے بعد خود ہی سوال کرتے ہیں کہ "پھر اگر ہم زندگی کی ناگواریوں میں سہارے کے لئے نظر اٹھائیں تو کس طرف اٹھائیں؟" اور اپنے سوال کا خود ہی یوں جواب دیتے ہیں کہ "ہمیں مذہب کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ یہی دیوار ہے جس سے ایک دکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔" اس کے بعد وہ مذہب کے منصب کی یوں وضاحت کرتے ہیں کہ "فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ سائنس ثبوت دے گا مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا، لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے۔" غرض، مولانا مذہب کا ایک صحت مند تصور رکھتے تھے۔ انھوں نے اس مذکورہ بالا خط میں صاف صاف کہا ہے کہ "بلاشبہ مذہب کی وہ پرانی دنیا جس کی مافوق الفطرت کارفرمائیوں کا یقین ہمارے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، اب ہمارے لئے باقی نہیں رہی۔" وہ مذہب کی رواجی حیثیت کے قائل نہ تھے۔ اسی جگہ انھوں نے لکھا ہے کہ "عام حالات میں مذہب انسان

اس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔" انھوں نے ایسے مذہب کو "تقلیدی ایمان" کہا ہے جسے وہ سراسر جمود اور گمراہی کا سبب گردانتے تھے۔ وہ "حقیقی مذہب" کے قائل تھے جو "تحقیقی" ہوتا ہے "تقلیدی" نہیں ایسا مذہب ان کے نزدیک علم کے منافی نہیں ہوا کرتا بلکہ اس کی مطابقت کرتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "علم اور مذہب[1] کی جتنی نزاع ہے فی الحقیقت علم اور مذہب کی نہیں ہے۔ یہ مدعیان علم کی خامکاریوں اور مدعیان مذہب کی ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ ملتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر۔" مولانا، انسانی زندگی میں مذہب کو بہت بڑا منصب دیتے ہیں اور اس کی مثبت حیثیت کے قائل ہیں۔ ان کا فیصلہ ہے کہ "بہر حال[2] زندگی کی ناگواریوں میں مذہب کی تسکین صرف ایک سلبی تسکین ہی نہیں ہوتی بلکہ ایجابی تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ ہمیں اعمال کے اخلاقی اقدار کا یقین دلاتا ہے اور یہی یقین ہے جس کی روشنی کسی دوسری جگہ سے نہیں مل سکتی۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی ایک فریضہ ہے جسے انجام دینا چاہیئے۔ ایک بوجھ ہے جسے اٹھانا چاہیئے"۔ انھوں نے ۱۹۴۷ء میں اپنا عہدہ سنبھالنے کے بعد ۱۸ فروری کی پریس کانفرنس میں تعلیم اور قومی تشکیل کے سلسلے میں جن چند اہم اور بنیادی امور کی طرف توجہ دلائی تھی ان میں سے ایک مذہبی تعلیم کا مسئلہ بھی تھا۔ اس موقع پر بھی انھوں نے اسی بات پر زور دیا کہ مذہبی تعلیم کا مقصد "وسیع النظری، رواداری اور انسان دوستی ہونا چاہیئے۔ تقریباً ایک سال بعد ۱۳ جنوری ۱۹۴۸ء کو سنٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن کے حصول آزادی کے بعد منعقد ہونے والے پہلے اجلاس میں بھی انھوں نے اپنی صدارتی تقریر طلبہ کی مذہبی تعلیم سے متعلق کی اور ملک کے سامنے مذہب اور مذہبی تعلیم کے اسی ارفع و صالح تصور کو رکھا جو اب سے بہت پہلے ان کا مسلک قرار پا چکا تھا۔

---

[1]، [2] غبار خاطر، مکتبہ جدید لاہور۔ میری لائبریری ایڈیشن۔ صفحہ ۶۵۔

مولانا کا یہی دینی احساس تھا جس نے انھیں ایک مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ سچا محب وطن اور جاں نثار قوم بنایا اور ہمیشہ اُن کے ذہن کو ہر قسم کی تنگ نظری اور تعصب سے پاک رکھا۔ انھوں نے مذہب کی حقیقی روح کو پہچان لیا تھا اور چاہتے تھے کہ جملہ عزیزانِ وطن بالخصوص نونہالانِ وطن کے دلوں کو بھی اس حقیقت سے آشنا کرائیں تاکہ ان کی ذہنی فضا کسی طور مسموم نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ تھی کہ سچے دین کی پیروی میں پیدا ہونے والے "یقین و اعتقاد" کو وہ تعلیم کا ایک اساسی عنصر سمجھتے تھے۔ اور اسی بنا پر وہ تاریخی غیر جانبداری کے بھی پرجوش حامی تھے۔ انھوں نے ۲۸ دسمبر ۱۹۴۷ء کو انڈین ہسٹاریکل ریکارڈ کمیشن کے جلسے میں تاریخ کا مقصد ماضی کے حقائق کا انکشاف ہی بتایا تھا۔ اور تین سال بعد اسی کمیشن کی نشست کے موقع پر پھر اپنے نظریے کی وضاحت میں کہا تھا کہ "انگریزوں کے عہد میں لکھی ہوئی تاریخ قابل اعتبار نہیں سمجھی جا سکتی کیونکہ تاریخ داں خواہ غیر ملکی حکمراں طبقے کے حامی ہوں یا محبانِ وطن، دونوں جانبدار رہے ہیں۔ لہٰذا آزاد ہندوستان کے مورخ کا فرض ہے کہ اپنے فرائض سے کماحقہٗ عہدہ برآ ہونے کی سعی کرے۔" (ترجمہ) ان کی بے لوث دینداری نے انھیں اس حد تک زیور انسانیت سے آراستہ کر دیا تھا کہ انھوں نے وطنیت کے محدود تصور کے خلاف بھی آواز بلند کی۔ مولانا وطن پرستی کو نہ مذہب کا حریف مانتے تھے اور نہ انسان دوستی کا رقیب۔ انڈین ایجوکیشنل کانفرنس کے سامنے ۱۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو قومی تعلیم کا منصوبہ پیش کرتے ہوئے بھی انھوں نے یہ بات کہی تھی کہ علم کی دنیا میں تنگ و محدود حب الوطنی کا سوال نہیں اٹھتا اور نہ یہ بات کسی طور واجب ہے کہ وطن کی تاریخ و تہذیب کو ترچھی نگاہ سے دیکھا جائے اور قومی روایات و اقدار کا جائز احترام نہ پیدا کرایا جائے۔

مولانا کی اس کشادگیِ قلب و نظر کی بدولت ان کا تعلیمی تصور بھی عالم گیر انسانیت کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ وہ ایک ہم آہنگ سماج میں معقول و معتدل شخصیت کی تشکیل کو تعلیم کا منصب قرار دیتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس کرۂ ارض کے بسنے والوں کے جذبات بڑی حد تک یکسانیت

رکھتے ہیں اور فطرتِ انسانی کی حقیقت ایک ہی ہے۔ لہٰذا مقامی رنگ کی آمیزش اور ماحول کے امتیازات قبول کرتے ہوئے [illegible] فرزندِ آدم کی خلقت میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہر انسان، انسان ہی رہتا ہے۔ انھوں نے یہ [illegible] کو مشرق و مغرب میں انسان کا تصور اور فلسفہ تعلیم کے عنوان کے تحت یونسکو کی طرف سے ۱۳ دسمبر ۱۹۵۱ء کو منعقد ہونے والے سیمنار میں افتتاحی تقریر کے دوران میں صراحت سے بیان کیا ہے انھوں نے مضامین البلاغ میں ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ "اخلاق[1] بھی ایک قوت ہے جو انسان کے بطون و ارواح میں چھپی ہوئی ہے" یہاں پر وہ کسی خاص خطۂ زمین یا رنگ و نسل کے انسان کی تخصیص نہیں کرتے، انھیں انسانی فطرت کی بوقلمونی میں اس کے خمیر کی یک رنگی کا یقین کامل ہے اور وہ انسانوں میں کوئی تفریق نہیں کرنا چاہتے مولانا اپنے اس فلسفۂ حیات کے پیش نظر بین الاقوامی مفاہمت کے لازمی طور پر علمبردار ہیں وہ فنونِ لطیفہ کی تعلیمی اہمیت کے اس لئے اور زیادہ معترف تھے کہ ان کے نزدیک وہ مختلف ممالک کے مابین امن و آشتی کے پیغام بر کی حیثیت رکھتے ہیں انھوں نے ۵ مارچ ۱۹۵۲ء کو فنونِ لطیفہ کی ایک نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ فن برائے فن اور فن برائے زندگی، کی بحث قطعی فضول ہے۔ دراصل دونوں مقولوں کے بطن میں ایک ہی حقیقت مخفی ہے حقیقی فن افراد کی پسندیدگی اور ناپسندیدگی کا محتاج نہیں ہوا کرتا لیکن ایسی صورت میں وہ سب کے جذبات کی نمائندگی بھی کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ معیاری فن ہمیشہ حقیقی تعلیم کا موثر ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ جذبات کو سنوارتا ہے اور ادراک و تخیل کی تربیت کرتا ہے۔ سیاسی طور پر دنیا علیحدہ علیحدہ جماعتوں میں تقسیم ہو سکتی ہے لیکن فلسفہ، ادب اور فن کے معاملے میں انسانی برادری کی سالمیت برقرار ہی رہتی ہے۔ اس میدان میں ایک ذہن کی تخلیق ساری نوعِ انسانی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ فنونِ لطیفہ کی ان ہی صفات کی بنا پر مولانا کے نزدیک ایک سچے قومی نظامِ تعلیم میں فنونِ لطیفہ کا ایک خاص مقام ہے انھوں نے متعدد مواقع پر اپنے تعلیمی خطبات میں یہ بات دہرائی ہے، وہ کسی بھی ملک کی قومی تعلیم کو فنونِ لطیفہ کے بغیر مکمل ماننے کو تیار نہیں تھے۔ ۱۹ اگست ۱۹۴۹ء کو فنونِ لطیفہ کی کل ہند کانفرنس میں خطبۂ افتتاحیہ پڑھتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ ایک سماج کی صحت مندی اور اعتدال پسندی کا اظہار اس کے افراد میں ذوقِ لطیف کی ترویج سے ہوا کرتا ہے۔"

---

[1] مضامین البلاغ۔ شائع کردہ ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس دہلی۔ صفحہ ۱۱۶ ۔

شخصیت کی تعمیر میں مولانا مصوری، موسیقی، رقاصی، سنگ تراشی، ڈراما سب ہی فنون کو اہم خیال کرتے تھے۔
[illegible] نے تعلیم کے منصب کی وضاحت کرتے ہوئے اکثر فرمایا ہے کہ شخصیت کے سب ہی پہلوؤں کی تربیت [illegible] ہے تعلیم محض ذہنی قوا کی بیداری کا نام نہیں ہے بلکہ جذباتی آسودگی جسمانی ترقی، تہذیب شائستگی کا حصول، غرض، انسانی زندگی کے سب ہی رخ اس میں شامل ہیں۔ مولانا کی اپنی زندگی میں فنونِ لطیفہ محض نظری حیثیت نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ ان کے شیدائی بھی تھے۔ انھوں نے اپنی نوجوانی میں دو تین سال متواتر علمِ موسیقی کا مطالعہ کیا تھا اور باقاعدہ ریاض بھی کرتے رہے تھے۔ اگرچہ آئندہ زندگی کی ہنگامہ آرائیوں نے انھیں اس ذوق کو جاری رکھنے کی مہلت نہ دی لیکن موسیقی سے انھیں دلچسپی ہمیشہ رہی۔ ان کی طبیعت کا یہ رجحان ان کی نفاست پسندی، شاعرانہ فکر، اور صاف ستھرے مذاق سے بھی بہرطور ظاہر ہوتا ہے اس لئے یہ امر قطعی باعث تعجب نہیں ہے کہ مولانا نے وزیر تعلیم کی حیثیت سے سب سے پہلے جو چند آئین بنائے میں پیش قدمی کی، ان میں سے ایک بیرونی ممالک میں نوادرات کی بے دریغ برآمد پر قیود عائد کرنے سے متعلق بھی تھا۔ ان کے اس احترامِ فن وادب کی ایک اور شہادت ساہتیہ اکادمی، للت کلا اکادمی اور سنگیت ناٹک اکادمی کی صورت میں آج ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ ادارے دراصل مولانا کی فکر رسا کے برگ و بار کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری قومی تعلیم میں مولانا کی بالغ نظری کے علامتی مینارے کہے جا سکتے ہیں۔ مولانا نے ان اداروں کے قیام میں گہری دلچسپی ظاہر کی تھی اور انھوں نے بجا طور پر ان اداروں کے مقاصد میں سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی تھی کہ وہ عوام کے مذاق کو سنوارنے اور فنون و ادب کی توسیع و اشاعت کرنے کا ذریعہ بنیں۔

مولانا، تعلیم کو زندگی کی تیاری سے تعبیر کرتے تھے انھوں نے ۳ نومبر ۱۹۵۱ء کو ایک تقریر کے دوران میں زراعت کی تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے تعلیم کا منصب سماجی ضرورتوں کے پیش نظر افراد کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہی ٹھہرایا تھا۔ انھوں[5] نے اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ طلبہ کی قابلیت کی سطح کو بلند کیا جائے۔ مولانا نے تعلیم میں آزادی کے تصور کو سراہا۔ وہ ثانوی تعلیم میں

---

[5] تقریر ۱۸ اپریل ۱۹۵۳ء

کچھ اس طور پر تبدیلی چاہتے تھے کہ وہ خود تکمیلِ علم کی ایک منزل قرار پا جائے تاکہ بیشتر طلبہ اس منزل کو طے کرنے کے بعد زندگی میں داخل ہوسکیں۔ اسی غرض سے کثیر المقاصد ثانوی مدارس کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ آج ان کی یہ بات بڑے پُرزور طریقے سے دہرائی جارہی ہے اور حکومت کی کوشش ہے کہ کسی طور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں نااہلوں کے داخلے کی روک تھام کی جائے۔ مولانا کے نزدیک ہر فرد کو ایسی تعلیم حاصل کرنے کا حق ہے جو اس کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں مددگار ثابت ہوسکے اور مکمل زندگی گذارنے کا اہل بنائے ایسی تعلیم کو انھوں نے ہر شہری کا پیدائشی حق بتایا ہے۔

مولانا کے نظریۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم سے آزاد ہندوستان کا تعلیمی نظام پوری طرح متاثر ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے تدبر سے اسے ایک ایسا پس منظر عطا کر دیا جس میں سچی دین داری، عقائد کی پختگی، انسان دوستی، عدل و ضبط جیسی اقدارِ عالیہ کی پاسداری موجود ہے اور جو تعلیم کا صحت مندانہ نظریہ برتنے کی ترغیب دلاتا ہے۔ ان کے ذہنِ رسا کا یہ بھی کمال ہے کہ اس کی بدولت ہندوستان کی تہذیبی روایات کو دوبارہ زندگی حاصل ہوئی۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا کہ روایات[۲] کا استحکام ان کو حیات نو بخشنے ہی سے ممکن ہے۔ ان کے اپنے قول کی تائید خود ان کے عمل میں نظر آتی ہے۔ اس وقت تعلیمی ترقی کی جو راہیں نکل رہی ہیں ان میں سے تقریباً سب ہی کی داغ بیل مولانا کے عہد میں پڑ چکی تھی۔ وہ جنگ آزادی کے مردِ مجاہد تو تھے ہی لیکن انھوں نے آزاد وطن کے تعلیمی نظام کی تشکیل کے معمارِ اول کہلانے کا حق بھی ادا کر دیا۔

---

[۱]، [۲] نشری تقریر، ۳۰ ستمبر ۱۹۵۳ء [۳] تقریر ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء

مولانا آزاد کے چند خطوط

مرتبہ: جناب ابو سلمان الہندی

بنام مولانا ظفر علی خاں مرحوم

(پیدائش ۱۸۷۳ء وفات ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء)

مولانا ظفر علی خاں ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام سراج الدین احمد اور دادا کا نام کرم الٰہی خاں ابن محمد حسن خاں تھا۔ آپ کا خاندان کئی صدیوں سے دارا پور میں آباد تھا، پردادا نے سیال کوٹ کے سرکھا گاؤں میں سکونت اختیار کی، بعد میں وزیر آباد چلے آئے اور شہر سے کچھ فاصلے پر کریم آباد کی بنیاد رکھی۔ مولانا کے والد سراج الدین احمد محکمۂ ڈاک میں ملازم تھے۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اخبار "زمیندار" جاری کیا۔

مولانا ظفر علی خاں نے وزیر آباد مشن ہائی اسکول سے مڈل اور مہندر سنگھ کالج پٹیالہ سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا اور بی اے کی ڈگری علی گڑھ سے حاصل کی۔

حیدر آباد (دکن) میں ملازمت اختیار کی اور اسسٹنٹ ہوم سکریٹری اور لجیسلیٹو اسمبلی کے رجسٹرار کے بلند عہدوں پر مامور رہے۔ حیدر آباد میں ۱۲، ۱۳ سال قیام رہا۔ اس دوران میں کئی کتابوں کے ترجمے کئے مثلاً خیابان فارس، فسانہ لندن، سیر ظلمات اور معرکۂ مذہب و سائنس اول الذکر ترجمہ پر پنجاب یونیورسٹی کی جانب سے پانچ سو روپے اور مصنف (لارڈ کرزن) کی جانب سے طلائی دستہ کی ایک چھڑی انعام میں ملی۔

میر عثمان علی خاں کو انگریزوں کے خلاف اکسانے میں حیدر آباد چھوڑنا پڑا بمبئی پہنچے اور وہاں سے دکن ریویو جاری کیا۔

[illegible] ۱۹۰۹ء کو والد مولوی سراج الدین احمد کا انتقال ہوا اور ان کی وصیت کے مطابق "زمیندار"
[illegible] لیا اور دوستوں کے مشورہ سے کرم آباد کی بجائے لاہور سے جاری کیا۔

مولانا ظفر علی خاں اس دور کے عظیم صحافی، بلند پایہ شاعر اور بہت بڑے عوامی خطیب تھے
[illegible] کی اصل سیاسی زندگی ۱۹۱۰ء سے شروع ہوتی ہے، ملکی اور قومی زندگی کے بہت سے نشیب
و فراز سے گذرے۔ انھوں نے ہر بڑے سیاسی لیڈر سے رشتۂ اتحاد باندھا، ہر جماعت کی تعمیر
[illegible] لیا، ہر تحریک کا ساتھ دیا اور اس دور کے کتنے ہی ہنگاموں کی رہنمائی فرمائی۔ شاعرانہ
مزاج اور جذباتی طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے اشتراکِ فکر و عمل کی بنیاد ہمیشہ وقتی حالات
اور جذبات صادقہ رہے۔ ان کی حیثیت ایسے رہنما کی نہ تھی جو عوام کو اپنے پیچھے لے کر چلتا ہے
بلکہ ان کی حیثیت ایسے لیڈر کی تھی جو عوام کے خیالات و جذبات کے مطابق ان کی رہنمائی کرتا
ہے یہی وجہ ہے کہ جوں جوں حالات میں تبدیلی ہوتی گئی، ان کے اشتراک فکر و عمل کے انداز بدلتے
گئے۔ تحریک خلافت، کانگریس، احرار، اتحاد ملت، اور مسلم لیگ وغیرہ کے ساتھ ان کا ایسا
ہی تعلق رہا۔ حضرت مولانا آزاد نے ان کی طبیعت کی اس بوقلمونی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ
کیا ہے:

> "کوئی تحریک مہینوں کے بجائے ہفتوں میں اٹھانا چاہو تو ظفر علی خاں اور شوکت علی
> کو چھوڑ دو۔ وہ بسرعت تمام عمارت کھڑی کر دیں گے، لیکن عمارت تیار ہو جائے تو
> انھیں فوراً نکال لو، کیونکہ وہ بنانے کے بعد ڈھانے لگتے ہیں۔"

جب دن کا آفتاب نصف النہار پر تھا تو ایک ہنگامہ تھا، لیکن آخری دنوں میں ایک
گم شدہ ورق تھے۔ کبھی ان کے جلو میں لاکھوں آدمیوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہوتا تھا، لیکن
آخری سفر پیش آیا تو ایک درجن آدمی بھی کاندھا دینے والے موجود نہ تھے۔ بقول شورش کاشمیری
صاحب، ایک بیٹا دو پوتے، تین بھائی اور چار ملازم تھے جن کے ہاتھوں آخری رسومات
انجام پائیں۔

مولانا نے ۴۴ برس کی عمر پائی، جس میں سے تقریباً ۱۴ برس قید کی نذر ہو گئے۔ گویا عمر کا ۱/۳ حصہ جیل میں بسر ہوا۔

مولانا ظفر علی خاں کی زندگی میں مولانا آزاد سے اتحاد و اتفاق کے مختلف زاویے بنتے چلے گئے لیکن اس کے باوجود سیاسی زندگی کے بہت سے مسائل میں مثلاً تحریک خلافت، خلافت اور ترکی شاہ سعود اور مسئلہ حجاز، احرار کا قیام و انہدام وغیرہ بے شمار مسائل میں اصولی اور فکری اعتبار سے وہ حضرت مولانا آزاد سے سب سے زیادہ قریب نظر آتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں نے لیگ میں شمولیت اختیار کی اور کانگریس کی سخت مخالفت بھی کی لیکن حضرت مولانا ان کے ممدوح و محترم ہی رہے حضرت مولانا کے متعلق ان کے بلند ترین خیالات کا اندازہ ان کے ان اشعار سے بخوبی ہو سکتا ہے، جن میں انھوں نے حضرت مولانا کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ دیکھیے! کس خوبی کے ساتھ حضرت مولانا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں۔

جہاں اجتہاد میں سلف کی راہ گم ہوئی
ہے تجھ کو اس کی جستجو، تو پوچھ ابوالکلام سے

(۱)

(اگست ۲۵ء تک طائف، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے قبضہ میں آ چکا تھا اور شریف حسین کا پوری طرح استیصال کیا جا چکا تھا۔ انگریزوں نے جو شریف کے سیف و پشت پناہ تھے، سلطان کے خلاف نجدی اور وہابی ہونے کا اتنا شدید پروپیگنڈہ کیا تھا کہ تمام عالم اسلامی میں شدید بے چینی اور سلطان کے خلاف سخت بدگمانی پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان نے جب شریف کی فوجوں کو مار بھگایا اور حجاز میں اپنے قدم جمائے تو حجاز کے مستقبل بارے میں فیصلہ کرنے کے لئے ایک "موتمر اسلامی" کے انعقاد کی ضرورت و اہمیت کا خیال ظاہر کیا۔ ان حالات میں ۲۱، ۲۲ ستمبر ۲۵ء کو مرکزی جمعیۃ خلافۃ کی مجلس عاملہ کا پٹنہ

میں ایک جلسہ ہوا اور طے پایا کہ حالات کا صحیح جائزہ لینے اور موتمر کے انعقاد میں سلطان کو مدد دینے کیلئے ایک وفد حجاز بھیجا جائے۔اس وفد کے رئیس حضرت مولانا سید سلیمان ندوی منتخب ہوئے تھے اور اراکین، مولانا محمد عرفان، مولانا ظفر علی خاں، سید خورشید حسین، مولانا عبدالماجد بدایونی اور شعیب قریشی تھے۔ لیکن بعض ذاتی موانع کی بنا پر حضرت سید صاحب مرحوم، مولانا بدایونی اور سید خورشید حسین حجاز نہ جا سکے، باقی تین ارکان ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو جہانگیر ثانی جہاز کے ذریعے بمبئی سے حجاز روانہ ہوئے۔

حجاز پہنچنے کے بعد، وفد کے ارکان میں، اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ ایک طرف مولانا ظفر علی خاں تھے اور دوسری جانب مولانا محمد عرفان اور شعیب قریشی تھے دونوں فریق اپنی رائے اور عمل کی جمعیۃ خلافت کے فیصلہ اور حضرت مولانا کی مرتبہ یادداشت کے مطابق قرار دیتے تھے۔فریق ثانی نے جمعیۃ خلافت کو مولانا ظفر علی خاں کے اختلاف سے مطلع کیا۔جواب میں حضرت مولانا کا تار موصول ہوا۔تار انگریزی میں تھا۔مولانا ظفر علی خاں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔)

دہلی۔۲/جون ۱۹۲۶ء

ظفر علی خاں!

میں امید کرتا ہوں کہ آپ حجاز میں امور موتمر کے بارے میں کامل طور پر کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔اگر آپ کی ذاتی رائے بدل گئی ہے، تو شعیب اور عرفان کو وہاں چھوڑ کر تبادلہ خیالات کے لئے یہاں لوٹ آیئے۔تار سے جواب دیجئے۔

ابوالکلام

صدر جمعیۃ خلافۃ (ہند)

(۲)

(مولانا ظفر علی خاں کو جب اس شکایت کا علم ہوا کہ ان کے بارے میں جمعیۃ خلافۃ

کو کئی تار دیے گئے ہیں، تو انھیں خیال ہوا کہ مبادا ان کے متعلق لاعلمی کی بنا پر کوئی غلط رائے قائم کر لی جائے۔ اس لئے انھوں نے اپنے رویہ کے بارے میں جمعیۃ خلافت کو مطلع کیا کہ وہ اس کے فیصلہ کی حرفاً حرفاً تعمیل کر رہے ہیں، نیز ہدایات طلب کیں۔ جواب میں حضرت مولانا کا درج ذیل تار وصول ہوا لیکن مذکورہ یادداشت وفد کو نہیں مل سکی، حتیٰ کہ ۲۶ر جنوری ۱۹۲۶ء کو وفد واپسی کے لئے روانہ ہوگیا۔

(ترجمہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم کا ہے۔)

دہلی، ۹ر جنوری ۱۹۲۶ء

ظفر علی خاں!

ہمارے مقاصد وہی ہیں، جن کا سلطان اعلان کر چکے ہیں۔ آئندہ حج کے موقع پر انعقاد موتمر کے متعلق زور دو۔ مستقبل کا فیصلہ صرف موتمر ہی کر سکتی ہے۔ عربی یادداشت بھیج رہا ہوں موتمر کے متعلق گفت و شنید جاری کرو۔

ابوالکلام آزاد

صدر خلافۃ

بنام مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم

(حضرت سید صاحب کے نام حضرت مولانا کے کچھ خطوط معارف اعظم گڑھ میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان خطوط کو "مکاتیب ابوالکلام" مرتبہ ادبستان لاہور اور تبرکات آزاد مرتبہ مولانا غلام رسول مہر میں شامل کیا جا چکا ہے۔ لیکن ان کے علاوہ غیر مطبوعہ خطوط کا ایک کافی بڑا ذخیرہ، آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ پاکستان کے زیر اہتمام شائع ہو رہا ہے۔ اس میں سے ایک خط تبرکاً نقل کیا جاتا ہے۔ مکاتیب کے ساتھ حضرت سید صاحب کا تذکرہ بھی ہے۔)

صدیقی العزیز! خط پہنچا۔

اے وقت تو خوش کہ وقتِ ما خوش کردی!

آپ نے میرے دل کا بڑا بوجھ ہلکا کر دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اعظم گڑھ میں بھی جلسہ اور وعظ کی مصیبت آ کے گی۔ یہ معاملہ میرے لئے ایک قطعاً نا قابل علاج ہو گیا ہے۔ میری کوئی سعی، کوئی فصاحت و بلاغت، کوئی بحث اس بارے میں سودمند نہیں ہوتی ہیں اگر لوگوں سے کہوں کہ تقریر کرنا میرے لئے مہلک ہے اور آدھ گھنٹے کے بعد مر جاؤں گا، جب بھی لوگ بخوشی آمادہ ہو جائیں گے کہ کم از کم آدھ گھنٹہ تک یہ واس کرالیں، پھر ہجوم مصافحہ کی جگہ تجہیز و تکفین کا اہتمام کیوں نہ کرنا پڑے، کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ اصل مقصد جس طرح میری زندہ لاش سے حاصل ہو سکتا ہے مردہ لاش سے بھی حاصل کر لیا جا سکتا ہے۔ شاید بعض اعتبار سے دوسری حالت زیادہ نافع اور نتیجہ خیز بھی جاتی ہو۔

آپ پہلے شخص ہیں جس نے میرے ان احساسات کو سمجھنے سے انکار نہیں کیا۔ یقین کیجئے آپ کا خط پڑھ کر بے حد شکر گذار ہوا ہوں۔

میں خود چاہتا ہوں دارالمصنفین میں ٹھہروں اور بجز وہاں کے حلقہ کے اور کوئی دعوت التفات نہ دے۔ جب آپ نے اس طرف سے مطمئن کر دیا تو کوئی وجہ نہیں کہ میں مستعجل ہوں تین دن تو نہیں، دو دن ضرور وہاں صرف کر دوں گا۔

مولوی رشید الدین صاحب[1] کہتے ہیں کہ جمعہ سرائے میر میں بسر ہو۔ پس یہ پروگرام مجھے کہ پہلے سرائے میر اور پھر دارالمصنفین میں ایک دن پہنچا اور دوسرے دن روانہ ہو جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ دونوں جگہ کا درمیانی فاصلہ بہت ہی کم ہے۔

مولوی مسعود علی[2] صاحب کی مسرت میں میری مسرت کا انعکاس ہے۔ معلوم نہیں مولوی عبدالسلام صاحب[3] بھی وہاں تشریف رکھتے ہیں یا نہیں؟ ان سے ملنے کو بہت جی چاہتا ہے۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ ابوالکلام، ۲۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء

---

[1] مولانا حمید الدین فراہی کے چھوٹے بھائی۔ [2] دارالمصنفین کے ناظم اعلیٰ۔

[3] رفیق دارالمصنفین۔ الہلال میں مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر چکے ہیں۔

بنام مولانا احمد رضا خاں بریلوی

(مارچ ۱۹۲۱ء میں جمعیۃ العلماء ہند کا سالانہ جلسہ بریلی میں ہو رہا تھا! اس موقع پر جماعت "رضائے مصطفیٰ" کی جانب سے ایک کتابچہ شائع کیا گیا جس میں جمعیۃ العلماء اور جمعیۃ خلافت کے اس وقت کے مسلک پر شدید اعتراضات کئے گئے تھے۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے رفع اختلافات کی غرض سے مولانا احمد رضا خاں صاحبؒ کی خدمت میں یہ خط لکھا، جو پیش کیا جا رہا ہے۔ استقبالیہ کمیٹی نے حضرت مولانا کا یہ خط جو ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا تھا، درج ذیل نوٹ کے ساتھ ایک اشتہار کی صورت میں شائع کر دیا:

"بجواب تحریر جماعت "رضائے مصطفیٰ" "موصولہ امروزہ مندرجہ بالا خط آج ۱۳ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۴ مارچ ۱۹۲۱ء کی شام کو جناب مولوی احمد رضا خاں صاحب کی خدمت میں بھیج دیا گیا ہے، اب عام اطلاع کے لئے اس کی نقل شائع کی جاتی ہے۔"

حضرت مولانا کے اس چیلنج کو قبول کر لیا گیا اور سید سلیمان اشرف، مولوی حامد رضا خاں صاحب ابن مولانا احمد رضا خاں صاحب اور دیگر بریلوی مولوی شریک جلسہ ہوئے۔ مولانا سید سلیمان اشرفؒ نے بڑی زوردار تقریر کی اور سخت اعتراضات کئے، خیال ہوتا تھا کہ ان اعتراضات کا کوئی جواب نہ دیا جا سکے گا لیکن حضرت مولانا کھڑے ہوئے تو دلائل و براہین سے اعتراضات کا ایسا رد کیا کہ دل میں ادنیٰ خلش بھی باقی نہ رہی۔ حضرت مولانا کی ایک معرکۃ الآرا تقریر تھی جس نے سامعین کو مبہوت کر دیا۔ سید سلیمان اشرف نے اس جلسہ میں اپنے اطمینان کا اظہار اور جمعیۃ العلماء ہند کے مسلک کی صحت کا اعتراف کیا اور

ہر طرح امداد و تعاون کا یقین دلایا)۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بریلی، ۱۳ رجب المرجب ۱۳۳۹ھ

بخدمت جناب مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی دام مجدہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مسئلہ تحفظ و صیانت خلافت اسلامیہ، ترک موالات و اعانت اعدائے محاربین اسلام وغیرہ مسائل حاضرہ کی نسبت جناب کے اختلافات مشہور ہیں، چونکہ جمعیۃ العلماء کا جلسہ یہاں منعقد ہو رہا ہے اور یہی مسائل اس میں زیر نظر و بیان ہیں، اس لئے میں جناب کو توجہ دلاتا ہوں کہ رفع اختلافات اور مذاکرہ و نظر کا یہ مناسب و بہتر موقع پیدا ہو گیا ہے جناب جلسہ میں تشریف لائیں اور ان مسائل کی نسبت بطریق اصحاب علم و فن گفتگو فرمائیں۔ میں ہر طرح عرض و گذارش کے لئے آمادہ و مستعد ہوں۔

فقیر ابو الکلام احمد کان اللہ لہٗ

امام الہند ـــــ ایک جائزہ

جناب ریاض الرحمٰن شروانی

مولانا ابوالکلام آزادؒ پر موافق و مخالف نقطۂ نظر سے جتنا لکھا گیا ہے ان کے معاصرین میں سے بہت کم پر لکھا گیا ہوگا، خصوصاً ان کی وفات کے بعد سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، مولانا اتنی حیثیتوں کے جامع تھے کہ ان کی ہر حیثیت پر لکھنے کی بڑی گنجائش ہے پھر ان کی سیاسی زندگی جن موجہائے بلاخیز کے درمیان گزری انھوں نے ایک طرف انھیں اہل بصیرت کی نظر میں مخدوم و مقتدیٰ بنا دیا اور دوسری طرف بہت سے مخالف و معاند پیدا کر دئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مولانا کی عظمت ادھوری رہ جاتی۔ آپ کسی بھی صحیح معنی میں عظیم شخصیت کی طرف نظر اٹھا کر دیکھئے ہر جگہ آپ کو یہی نقشہ دکھائی دے گا عقیدت و مخالفت کی اس کش مکش میں ایک نقصان ضرور ہوتا ہے، شخصیت کا تجزیہ نامکمل رہ جاتا ہے اور تحقیق و تجسس کا حق ادا نہیں ہو پاتا ہے۔ مولانا آزادؒ پر جو کتابیں اور مضامین اس عرصے میں شائع ہوئے ہیں ان میں سے بھی اکثر میں اس کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ غالباً یہ بھی ہے کہ مولانا ابھی کل تک ہمارے درمیان موجود تھے اور انھوں نے ملک کی سیاسی زندگی میں جو رول ادا کیا تھا وہ تاریخ کا جز بننے سے زیادہ ابھی تک خود ہمارے اپنے تجربات [illegible] وقت گزرنے پر ذاتی پسند یا ناپسند کی جگہ [illegible] دارانہ اور تحقیقی نقطۂ نظر پیدا ہو سکے گا۔ اور اگر پوری طرح نہیں تو بڑی حد تک ضرور جذبات سے ہٹ کر لکھا جا سکے گا۔

مولانا کی ہمہ گیر شخصیت کا اعجاز یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی اور کارناموں پر ہندوستان

ہی میں کام نہیں ہو رہا ہے. پاکستان میں بھی ہو رہا ہے۔ اگر وہاں ان کے بارے میں کچھ ایسی تحریریں شائع ہوئی ہیں جو تعصب اور عناد سے بھرپور ہیں تو عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھنے والوں اور کام کرنے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ پھر چند لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے عقیدت و احترام کے ساتھ علمی اور تحقیقی نقطۂ نظر کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ ان میں سرفہرست مولانا غلام رسول مہر کا نام نامی ہے، جنھوں نے تاثراتی مضامین کے علاوہ نقش آزاد، تبرکاتِ آزاد اور باقیاتِ ترجمان القرآن کی صورت میں ٹھوس علمی کام کے نمونے پیش کئے ہیں۔

حال میں مولانا پر کراچی سے ایک نئی کتاب شائع ہوئی ہے جس کا نام "امام الہند تعمیر افکار" ہے اور اس کے مصنف ابو سلمان الہندی ہیں۔ اس کتاب کی ضخامت تقریباً ۴۰۰ صفحات اور قیمت ۶ روپے ہے۔ یہ ایک وسیع کام کا ابتدائی حصہ ہے جس میں مولانا کی ۱۹۱۲ء کی زندگی کا جائزہ لیا گیا ہے اور ساتھ ہی بعض اعزہ، اساتذہ اور متعلقین کے حالات شامل کر دئے گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ زندگی کا یہ دور شخصیت کی تعمیر میں بہت اہم ہوتا ہے اور اس عمر میں خیالات و افکار کی جو شکست و ریخت ہوتی ہے وہ اکثر آئندہ زندگی کا سانچہ ڈھال دیتی ہے جو بقول مولانا آزادؒ توڑا جا سکتا ہے، موڑا نہیں جا سکتا ہے۔

مولانا آزادؒ کی زندگی کے اس دور سے متعلق بعض ایسے مباحث کا بیان ناگزیر ہے کہ جن کے بارے میں کچھ کرم فرماؤں نے غلط فہمیاں پھیلانے کی کوشش کی ہے مثلاً مولانا کا نسب، آبائی وطن اور بیرونی سفر۔ قدرتی طور پر ابو سلمان صاحب نے بھی ان سب مسائل سے بحث کی ہے اور ان حقائق کو پوری دیانت اور محنت سے ایک دفعہ پھر اجاگر کر دیا ہے جنھیں مولانا کے مخالف توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں۔ مولانا کے نسب اور آبائی وطن کے تعین میں انھوں نے سب سے زیادہ مدد مولانا غلام رسول مہر کی بعض تحریروں سے لی ہے

اس بارے میں خود مولانا آزادؔ کے بیانات بھی بہت واضح اور دوٹوک ہیں اور غلط فہمی صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب نیت صاف نہ ہو۔ مولانا نے "انڈیا ونس فریڈم" کے شروع میں تحریر فرمایا ہے "میرے اجداد بابر کے زمانے میں ہرات سے ہندوستان آئے۔ پہلے انھوں نے آگرہ میں قیام کیا اور پھر دہلی منتقل ہو گئے۔" اس بیان سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ مولانا کا تعلق ہندوستان کے کسی نومسلم خاندان سے ہرگز نہیں تھا اور ان کا آبائی وطن دہلی تھا۔ ان کے اس بیان کو جب ہم ان خیالات سے ملا کر دیکھتے ہیں جو انھوں نے خاندانی شرف و امتیاز کے بارے میں "تذکرہ" میں ظاہر فرمائے ہیں تو غلط بیانی کا شائبہ بالکل ہی رفع ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جو کہتا ہے: "ہم کو ایسا ہونا چاہیئے کہ ہماری نسبت سے ہمارے خاندان کو لوگ پہچانیں، نہ کہ اپنی عزت کے لئے خاندان کے شرف رفتہ کے محتاج ہوں۔ ارباب ہمت نے ہمیشہ اپنی راہ خود نکالی ہے اور عظمت و رفعت کی تعمیر صرف اس سامان سے کی ہے جو خود ان کا بنایا ہوا تھا۔" یا "الحمد للہ اس کی طلب ہے، اور نہ اس پر اعتماد اور نہ نااہلوں کے اس فریب عزت اور سراب شرف کی ضرورت۔" وہ کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ خاندانی عظمت کے مصنوعی بت تراش کر ان کے ذریعہ شرف و امتیاز حاصل کرے اور پھر مولانا کو اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ان کے اپنے کارنامے کیا کم تھے جو وہ خود ساختہ بزرگوں کے کارناموں کی دکان سجا کر بیٹھتے اور ان کا کاروبار کرتے۔ یوں بھی جو شخص مولانا کو تھوڑا بہت جانتا ہے کہ ان جیسا خود شناس و خود دار انسان عظمت و رفعت کی بھیک بزرگوں سے مانگے گا اور وہ بھی اپنے نہیں، کسی اور کے۔ ان سب داخلی شہادتوں کے ساتھ سب سے بڑی خارجی شہادت یہ ہے کہ جو لوگ کہتے ہیں کہ "مولانا کے دادا کا نام عمر دین عرف عمرا جھیکڑی تھا، وہ کھیم کرن (تحصیل قصور ضلع لاہور) میں گائے بھینس کی کھالیں رنگنے کا کام کرتے تھے" یا "مولانا کے والد خیر دین (جو بعد میں صوفی پیر خیر الدین کے لقب سے مشہور ہوئے) دس، گیارہ سال کی عمر میں کھیم کرن سے بھاگ کر بمبئی چلے گئے تھے" یا "قصبہ قصور کے قریب موضع کھیم کرن میں جناب آزاد کی کھتری برادری کا سراغ" ملتا ہے وہ اپنے ان "انکشافات" کا کوئی ثبوت مہیا نہیں کر سکے ہیں اور بغیر ثبوت

اور دلیل کے جوابات بھی جانے اس کا اہلِ علم کے نزدیک کیا مقام ہوتا ہے یہ ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں۔ مولانا آزادؒ کے نسب اور آبائی وطن سے کھیم کرن یا قصور کا کیا تعلق تھا یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس بارے میں ابوسلمان صاحب نے مہر صاحب کی یہ عبارت نقل کی ہے:

"مولانا آزادؒ کے بیانات سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا منورالدین (جو مولانا آزادؒ کے والد کے نانا تھے) کے دادا ہرات میں تھے۔ والد احمد شاہ ابدالی کی جانب سے لاہور کے قاضی القضاۃ اور نائب السلطنت کے مشیر مقرر ہوئے۔ جب پنجاب پٹھانوں کے قبضے سے نکلنے لگا تو قلب یہ ہے کہ یہ بزرگ لاہور کی سکونت چھوڑ کر قصور یا کھیم کرن میں مقیم ہو گئے ہوں۔" مہر صاحب کے اس خیال کی تصدیق "آزاد کی کہانی" مؤلفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی اس عبارت سے ہو جاتی ہے جو ابوسلمان صاحب نے حاشیے میں نقل کی ہے: "وہ (مولانا منورالدین کے والد) برابر اس ذمہ دار عہدے کے فرائض لاہور میں ادا کرتے رہے مگر مستقل سکونت قصور میں اختیار کی۔" اب یہ بھی سن لیجئے کہ جو بزرگ کھیم کرن سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے وہ مولانا خیرالدین نہیں تھے بلکہ مولانا منورالدین تھے جنھیں شوقِ علم کھیم کرن سے "بھگا" کر دہلی لے گیا تھا اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے حلقۂ درس میں داخل کر دیا تھا۔ ابوسلمان صاحب نے یہ واقعہ "نقشِ آزاد" مرتبہ مولانا غلام رسول مہر اور "آزاد کی کہانی" مؤلفہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی دونوں کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ اس سے پہلے بھی بعض حضرات، خصوصاً مولانا محمد یونس خالدی، مولانا آزادؒ کے نسب اور آبائی وطن کے بارے میں تحقیق سے کام لے کر ہر طرح کے شکوک کا ازالہ کر چکے ہیں اور اب ابوسلمان صاحب نے خود مولانا آزاد کی تحریروں اور مہر صاحب اور ملیح آبادی صاحب کے حوالوں سے ایک دفعہ پھر دودھ اور پانی علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے لیکن برا ہو تعصب اور ہٹ دھرمی کا جو حقیقت پر برابر پردے ڈالے رہتی ہے اور اپنے شکار کو کسی طرح اس کا روئے تاباں نہیں دیکھنے دیتی ہے۔

ایک اور مسئلہ جسے لوگوں نے بلا وجہ الجھانے اور غلط رنگ میں پیش کرنے کی کوشش

ہے مولانا آزاد کا بیرونی سفر ہے۔ یہ مسئلہ "کاروانِ خیال" کی اشاعت کے بعد سے موضوع بحث بنا ہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء کے ایک خط میں مولانا نے اپنے "صدیق مکرم نواب صدر یار جنگ بہادر مرحوم کو لکھا تھا: "وقت کے تصادفات کا کرشمہ دیکھیے بعینہٖ یہی غزل آج سے ۳۲ برس پہلے ایک بزم انس میں سنی تھی اور کہاں سنی تھی، بغداد کی شب ماہ میں عین دجلہ کی لہروں پر..... میری عمر ۲۰، ۲۱ برس کی ہوگی۔" اس کے جواب میں نواب صاحب نے تحریر فرمایا: "آپ نے بغداد کا ذکر چھیڑا، مجھ کو وہ وقت یاد آگیا جب دو نوجوان ابوالکلام آزاد اور ابوالنعر آہ نمایاں ہوئے تھے..... اسی سلسلے میں یہ سنا کہ آپ بغداد چلے گئے۔ بغداد کی روئداد آپ نے اب سنائی۔" ان خطوط کی اشاعت کے بعد یہ بحث چھیڑ دی گئی کہ مولانا نے یہ سفر کیا بھی تھا یا نہیں۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص کہتا ہے کہ میں فلاں زمانے میں فلاں ملک کے سفر پر گیا تھا اور دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ نہیں، آپ نہیں گئے تھے! اس صورت میں ظاہر ہے کہ ثبوت کا بار منکرین پر ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں تماشا یہ ہے کہ ثبوت دینے کی تکلیف کوئی گوارا نہیں کرتا ہے بلکہ ہر شخص کا عمل "مستند ہے میرا فرمایا ہوا" پر معلوم ہوتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں مولانا کے سفر کے حق میں دلیلیں ملاحظہ فرمایئے۔ سب سے بڑی دلیل تو خود مولانا کا اپنا بیان ہے جسے غلط ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، پھر نواب صدر یار جنگ مرحوم کی وہ تصدیق ہے جو اوپر نقل ہوئی۔ علاوہ ازیں "تذکرہ" کے مرتب مرزا فضل الدین احمد نے "تذکرہ" کے مقدمے میں لکھا ہے: "خاکسار شاید ان معدودے چند لوگوں میں سے ہے جو ایڈیٹر "الہلال" سے "الہلال" کی اشاعت کے بعد نہیں بلکہ بیشتر سے واقفیت رکھنے کا فخر رکھتے ہیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات سنہ ۱۹۰۲ء میں ہوئی..... زمانے کے حالات و حوادث نے مجھے ہندوستان کے مختلف گوشوں اور پھر ہندوستان سے باہر پہنچا دیا۔ وہ کلکتہ سے بمبئی اور پھر حجاز و بغداد چلے گئے۔" اور سب سے آخر میں لیکن سب سے زیادہ یہ کہ مولانا کی وفات کے بعد ہمایوں کبیر صاحب نے جو یادگار جلد انگریزی میں شائع کی اس میں ایک مضمون

فرانسیسی مستشرق لوئی ماسینون کا بھی ہے۔ اس مضمون میں لوئی ماسینون نے لکھا ہے اور اب افسوس اور وفاداری کے ساتھ میرے ذہن میں ..... ہماری پہلی اور آخری ملاقاتوں کی یاد آرہی ہے (ہماری) پہلی ملاقات بغداد میں ٹھیک ۵۰ برس پہلے ۱۹۰۷ء (یا ۱۹۰۸ء میں ہوئی تھی۔ ہم مسجد مرجان میں اپنے عزیز اُستاد الحاج علی آلوسی کے شاگردوں کی حیثیت سے ملے تھے جو اب وہاں مدفون ہیں" یہ ایک ایسے عینی شاہد کی شہادت ہے جسے غالباً مضمون لکھتے وقت اس بحث کا اندازہ بھی نہیں تھا جو مولانا کے بیرونی سفر کے بارے میں ہندوستان اور پاکستان میں جاری تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ لوئی ماسینون کی اس شہادت کے بعد مولانا کے بیرونی سفر سے نیک نیتی کے ساتھ انکار ممکن نہیں ہے، مخالفت کی بات دوسری ہے۔

اسی سلسلے میں ایک ضمنی بحث یہ اُٹھ کھڑی ہوئی ہے کہ مولانا نے یہ سفر کس سن میں فرمایا تھا۔ جیسا کہ عرض کیا گیا "کاروانِ خیال" کا خط ۱۹۴۲ء کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں مولانا نے دو باتیں ایسی تحریر فرمائی ہیں جن سے زمانۂ سفر کا تعین ہوتا ہے "یہی غزل آج سے ۳۲ برس پہلے ..... سنی تھی" اور "میری عمر ۲۰، ۲۱ برس کی ہوگی" ۱۹۴۲ء میں سے ۳۲ برس گھٹانے سے ۱۹۰۸ء نکلتا ہے مولانا کی پیدائش ۱۸۸۸ء کی تھی، اس میں ۲۰، ۲۱ برس کا اضافہ کیا جائے تب بھی ۱۹۰۸ء یا ۱۹۰۹ء ہی حاصل ہوتا ہے۔ تقریباً یہی بات لوئی ماسینون نے اپنے مضمون میں لکھی ہے "انڈیا ونس فریڈم" مولانا آزاد کی آخری تصنیف ہے اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اس میں بھی مولانا نے اپنے بیرونی سفر کا سال ۱۹۰۸ء ہی بیان فرمایا ہے۔ اِن شواہد کی موجودگی میں میرے خیال سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کا یہ سفر کب ہوا تھا اور بحث کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے لیکن بدقسمتی سے مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی" میں مولانا کا سفر ۱۹۰۵ء میں بیان کیا ہے اور یہیں سے زمانۂ سفر کے بارے میں شکوک کی بنیاد پڑی ہے۔ "آزاد کی کہانی" کے نوٹ مولانا ملیح آبادی نے ۱۹۲۱ء میں جیل میں مولانا آزاد سے ان کے حالات سن کر تیار کئے تھے اور کتاب شائع اپریل ۱۹۵۸ء

میں ہوئی۔ اس صورت میں مولانا ملیح آبادی کو تسامح ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے اور ۱۹۰۸ء یوں بھی ۱۹۰۵ء میں بہ آسانی بدل جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کے سوانح پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ ۱۹۰۵ء میں وہ ہندوستان ہی میں تھے۔ ۱۹۰۵ء کے تقریباً وسط تک لسان الصدق" شائع ہو رہا تھا۔ اپریل ۱۹۰۵ء میں وہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شریک ہوئے تھے اور اکتوبر ۱۹۰۵ء میں "الندوہ" کی ادارت کے سلسلے میں ندوہ پہنچ گئے تھے۔ ابو سلمان صاحب نے مولانا ملیح آبادی کی روایت اور کاروانِ خیال، انڈیا ونس فریڈم اور لوئی ماسینون کے بیانوں میں مطابقت پیدا کرنے کی یہ صورت نکالی ہے کہ دونوں کو صحیح تسلیم کر لیا ہے اور مولانا کے بجائے ایک کے تین سفر بیان کئے ہیں۔ پھر بھی ایک معما باقی رہ جاتا ہے، مطابقت تو دو سفروں سے بھی پیدا ہو جاتی تھی، تین کی کیا ضرورت تھی؟ اس کی ضرورت انھیں یوں پیش آئی کہ مولانا ملیح آبادی نے "آزاد کی کہانی" میں ص ۱۴۴ پر مولانا آزادؒ کے مکہ معظمہ حاضر ہونے کا ذکر کیا ہے اور پھر ص ۱۴۵ پر بڑے بھائی کے ہمراہ عراق جانے کا۔ ابو سلمان صاحب نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ سفر تصور کر لیا ہے۔ بہرحال میری ناچیز رائے یہ ہے کہ مولانا آزاد نے اس زمانے میں بیرونی سفر ایک ہی فرمایا تھا اور وہ ۱۹۰۸ء میں تھا۔ مولانا کے بعض اور معتبر سوانح نگاروں مثلاً مولانا غلام رسول مہر اور مولانا محمد یونس خالدی کی بھی یہی رائے ہے اور نہ خود مولانا آزاد کی کسی تحریر یا بیان سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء میں دو یا تین مرتبہ باہر تشریف لے گئے تھے۔

کتاب کا اصلی موضوع یعنی "تعمیر افکار" داستانِ شک و انکار کے زیر عنوان ۲۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ مولانا آزاد رح نے اپنی زندگی کے اس دور کا ذکر مختلف موقعوں پر فرمایا ہے، کہیں تشبیہات و استعارات کے پردوں میں اور کہیں صاف صاف لفظوں میں۔ عبقری کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش سے بہ آسانی مطمئن نہیں ہوتا ہے اور اسے ہمیشہ خوب سے

خوب تر کی جستجو رہتی ہے۔ مولانا کے عبقری ہونے میں شبہ نہیں ہے۔ انھیں مذہب کا جو تصور ورثے میں ملا تھا وہ ان کے متجسس ذہن اور بے چین روح کو مطمئن نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ عرصے کے لئے وہ مذہب کی ضرورت اور افادیت ہی سے منکر ہو گئے۔ لیکن یہ انکار بھی روح کی پیاس نہ بجھا سکا اور لیلائے مقصد کی تلاش میں دل و دماغ برابر سرگرداں رہے چونکہ مبدئے فیاض سے طبع رسا اور فہم سلیم ودیعت ہوئی تھی اس لئے بالآخر متاع گم گشتہ کا سراغ مل کر رہا۔ ان آزمائشوں سے گزرنے میں دل و دماغ کو جو جھٹکے لگے انھوں نے بلاشبہ تعمیر افکار میں بہت اہم رول ادا کیا، طبیعت میں مشکل پسندی آگئی اور نظر کسی اعلیٰ مقصد کی متلاشی رہنے لگی۔ مولانا سے کم تر درجے کا انسان اول تو مذہب کے موروثی تصور ہی سے مطمئن ہو کر بیٹھ رہتا اور بہ آسانی والد کی گدی سنبھال کر پیری مریدی کے دھندے میں لگ جاتا اور اگر اس کی طبیعت ایسی ہی باغی اور بے چین ہوتی تو کفر و الحاد کا راستہ ہمیشہ کے لئے اختیار کر لیتا مولانا کی عظمت یہ ہے کہ ان کے قدم اٹھے بھی اور منزلِ مقصود سے پہلے کہیں رکے بھی نہیں اور یہ سب وادیاں ۲۲ یا ۲۴ برس کی مختصر عمر میں قطع کر ڈالیں! بقول خود مولانا آزاد:

"۲۴ برس کی عمر میں جبکہ لوگ عشرتِ شباب کی سرگرمیوں کا سفر شروع کرتے ہیں میں اپنی دشت نوردیاں ختم کر کے تلووں کے کانٹے چن رہا تھا" ان کا زندگی بھر یہی طریقہ رہا، ناحق کی حمایت پر کبھی اپنے کو راضی نہ کر سکے اور حق کا سراغ مل جاتے پر اس کی حمایت و نصرت سے باز نہ رہ سکے۔ میرے خیال سے یہ موضوع اس سے زیادہ وضاحت کا خواستگار تھا جتنی وضاحت سے ابو سلمان صاحب نے اپنی تصنیف میں کام لیا ہے کیونکہ اگر وہ کوشش کرتے تو مولانا کی آئندہ زندگی کے بہت سے افکار و رجحانات کی جڑیں انھیں یہیں پیوست ملتیں۔

مولانا کے بعض قریبی اعزہ، اساتذہ اور دوسرے متعلقین کے حالات ایک جگہ مہیا کر کے ابو سلمان صاحب نے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ اور الحاج علی آویؒ سے مولانا کے تعلق کی نوعیت بھی واضح کر دی ہے یعنی ان دونوں بزرگوں سے مولانا کا علاقہ

خلوص و مودت یا زیادہ سے زیادہ عقیدت و نیاز کا تھا، باقاعدہ اُستادی شاگردی کا نہ تھا۔ کتاب کے آخر میں مولانا کے اس دور کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مضامین اور تصانیف کی جامع فہرست دی ہے اور یہ بھی ایک مفید کام ہے۔

کسی عظیم اور بقول قاضی عبد الغفار مرحوم مشکل شخصیت کی سوانح نگاری کے دو مناسب طریقے ہوسکتے ہیں۔ یا تو سوانح نگار کو اپنے ہیرو سے قرب کی عزت حاصل رہی ہو اور وہ اس کی زندگی کے بعض ایسے گوشوں کو بے نقاب کرسکتا ہو جو اس وقت تک لوگوں کی نظروں سے مخفی ہوں اور یا اس میں یہ صلاحیت ہو کہ صاحبِ سوانح کی تحریروں کے آئینے میں اس کی شخصیت کا جلوہ دیکھ اور دکھا سکے۔ مولانا آزاد کی سوانح عمری دونوں طریقوں کے مطابق لکھی جا چکی ہے۔
پہلا طریقہ مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی مرحوم نے "ذکر آزاد" میں اختیار کیا ہے اگرچہ اس میں یہ کمی ضرور رہ گئی ہے کہ وہ مولانا آزاد کی مکمل سوانح عمری نہیں ہے بلکہ ان کی زندگی کے صرف اس حصے کا احاطہ کرتی ہے جس میں مولانا ملیح آبادی کو ان کی رفاقت کا شرف حاصل رہا اور دوسرے طریقے کے مطابق میرے خیال سے اب تک سب سے اچھی سوانح عمری قاضی عبد الغفار کی "آثار ابو الکلام" ہے۔ مہادیو ڈیسائی کی انگریزی تصنیف "مولانا ابو الکلام آزاد" میں ان دونوں طریقوں سے بیک وقت کام لیا گیا ہے اور اس لئے میری ناچیز رائے ہیں اس پر ابھی تک کوئی خاص اضافہ نہیں ہوسکا ہے اگرچہ مولانا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں اس میں بعض واقعاتی غلطیاں یقیناً رہ گئی ہیں۔ "امام الہند (تعمیر افکار)" ان دونوں طریقوں سے ہٹ کر لکھی گئی ہے۔ اسے اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس کے مطالعے سے مولانا کے بارے میں نئی معلومات حاصل ہوسکیں گی یا ان کی شخصیت کے نئے پہلو روشنی میں آسکیں گے بلکہ اس کی اہمیت اور افادیت یہ ہے کہ مولانا کی ابتدائی زندگی کے بارے میں جو معلومات مختلف جگہ بکھری ہوئی تھیں انھیں مصنف نے ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اپنی اس کوشش میں انھوں نے خود مولانا کی تحریروں کے علاوہ "آزاد کی کہانی" پر سب سے زیادہ اعتماد کیا ہے۔ ان کے سامنے آئندہ کام کا جو نقشہ ہے امید ہے اس کی تکمیل میں وہ مولانا پر شائع شدہ دوسرے مواد سے بھی پورا استفادہ کریں گے۔

مولانا آزاد
اپنے معاصرین کے خطوط کی روشنی میں

مرتبہ: عبداللطیف اعظمی

مکاتیب کو ادب میں ایک خاص مقام حاصل ہے اور ان کی بہت سی خصوصیات بیان کی جاتی ہیں، مثلاً یہ کہ لکھنے والے کے خلوص دل کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ان سے لکھنے والے کی سیرت اور شخصیت کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے اور وہ اپنے دور کے سماجی شعور کے صحیح عکاس ہوتے ہیں۔ مگر میں نے اردو کے خطوط کا مطالعہ ایک اور نقطۂ نظر سے کیا ہے، وہ یہ کہ مکتوب نگار اور مکتوب الیہ کے درمیان خطوط کے ذریعہ جو گفتگو ہوتی ہے، اس میں دوسروں خصوصاً اپنے معاصرین کا کس انداز سے ذکر آیا ہے۔ اس ذکر کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس گفتگو کی حیثیت کچھ اس قسم کی ہے جو بند کمرے میں ہوتی ہے، اس لئے یہ گفتگو مکتوب نگار کے صحیح جذبات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ میں نے اپنے اس مطالعہ میں بہت سی مشہور شخصیتوں کے بارے میں معلومات جمع کی ہیں، آج کی صحبت میں مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق پیش کرتا ہوں۔ یہ معلومات ہزاروں صفحات کے مطالعہ کا نچوڑ ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنے دور کی عظیم ترین شخصیتوں میں سے تھے اور ساتھ ہی ان کی شخصیت بہت ہی متنازعہ فیہ رہی ہے۔ اس لئے مجھے یہ جاننے کا بڑا اشتیاق تھا کہ مولانا آزاد کے ان معاصرین نے جن سے ان کے معرکے رہ چکے ہیں یا جن کو ان کے سیاسی موقف سے اختلاف تھا۔ اپنے نجی خطوط میں، جس کو میں نے بند کمرے کی گفتگو سے تعبیر کیا ہے، کس پیرایے میں ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں میری سب سے پہلے نگاہ مولانا محمد علی پر پڑی۔ کیونکہ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کا میدانِ عمل مشترک تھا ـــــ دونوں پرجوش اور بیباک

جرنلسٹ اور تحریک آزادی کے نڈر سپاہی تھے ــــ اس کی وجہ سے جہاں دونوں
وابستہ تھے، وہاں بہت سے مسائل میں شدید اختلاف بھی تھا۔ مولانا محمد علی کے
رفیق کار اور مخلص ترین دوست مولانا عبدالماجد دریابادی کے الفاظ میں "مشہور تھا کہ محمد علی
اور مولانا آزاد میں صفائی نہیں، اُن بَن کے چرچے ایک ایک کی زبان پر تھے"[۵۱] اس لئے
مجھے امید تھی کہ مولانا محمد علی کے خطوط میں مولانا آزاد کا یقیناً ذکر آیا ہوگا، اس لئے بھی
یقین تھا کہ بقول مولانا دریابادی مولانا محمد علی کے "آخر کے خطوط زیادہ تر اختلافی اور نزاعی
شکووں سے لبریز ہیں"[۵۲]۔ مگر مجھے اپنی کوشش میں سخت ناکامی ہوئی۔ مولانا محمد علی کے خطوط
کا سب سے بڑا مجموعہ وہ ہے جسے محمد سرور صاحب نے مرتب کیا ہے اور جو جامعہ ملیہ سے شائع
ہوا ہے، کتابی سائز کے کچھ زائد تین سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے، اس میں مولانا آزاد کا کہیں
ضمناً بھی ذکر نہیں آیا ہے، کچھ خطوط مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب "ذاتی ڈائری کے
چند ورق" میں شائع ہوئے، مولانا دریابادی سے مرحوم کے جو بے تکلفانہ تعلقات تھے، اس
سے دنیا واقف ہے، ان کے خطوط میں مولانا نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے، مگر ان میں بھی
مولانا آزاد کا کسی طور بھی ذکر نہیں۔ البتہ پروفیسر محمد سرور صاحب کی مرتبہ کتاب "محمد علی۔
بحیثیت تاریخ اور تاریخ ساز کے" میں ایک خط ہے، جو ۲۸ء میں یورپ سے لکھا گیا
ہے، اس میں ضمناً ذکر آیا ہے۔ مرکزی خلافت کے سکریٹری مولانا محمد عرفان مرحوم کے خط میں
لکھتے ہیں: "البتہ ایک صاحب "ابوالنصر" جن کا خط مولانا ابوالکلام سے ہو بہو ملتا ہے۔ ان
بے چارے نے ایک کاپی ارسال کی ہے"[۵۳]۔

مولانا محمد علی کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی کی گرامی شخصیت ہے، جنھوں نے مولانا آزاد
کی معیت میں کام کیا، ساتھ ہی جنھیں مولانا آزاد کے موقف سے شدید اختلاف بھی رہا ہے، اس

---

۵۱ محمد علی، ذاتی ڈائری کے چند ورق، حصہ اول صفحہ ۳۳۳۔
۵۲ ایضاً حصہ دوم صفحہ ۲۷۶۔ ۵۳ صفحہ ۳۶۵۔

وجہ سے میرا گمان ہے کہ سید صاحب کے [illegible] لانا کا ذکر آیا ہوگا، مگر اب تک سید صاحب کے صرف وہ خطوط شائع ہوسکے [illegible] مولانا سید مسعود عالم ندوی مرحوم کو لکھے گئے تھے۔ ان میں صرف دو جگہ ذکر آیا ہے، ایک ذکر غیر اہم ہے، لکھتے ہیں۔

"[illegible] مولوی ابوالکلام صاحب کی مجلس اصلاح عربی و فارسی کی کمیٹی کی شرکت کے لئے لکھنؤ جا رہا ہوں" (مورخہ ۲۵ مئی ۱۹۴۳ء۔ مکاتیب سلیمان صفحہ ۲۱۰)

لیکن دوسرا ذکر بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے علامہ سید سلیمان ندوی کے صحیح خیالات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کے سلسلے میں ہے۔ فرماتے ہیں:

"[illegible] دعائی لوگوں سے میں چوکنا رہتا ہوں۔ ابوالکلام کے ساتھ بھی میرا یہی معاملہ رہا"

(مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۳۶۳ھ مکاتیب سلیمان صفحہ ۱۶۵)

سنا ہے کہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی سید صاحب کے ان خطوط کو جو ان کو لکھے گئے تھے مرتب فرما رہے ہیں۔ سید صاحب اور مولانا دریابادی میں جس قدر بے تکلفی اور خیالات میں ہم آہنگی ہے، اس کی بنا پر مجھے امید، بلکہ یقین ہے کہ ان میں ضرور مولانا آزاد کا ذکر آیا ہوگا، اگر مولانا دریابادی نے "سنسر" سے کام نہ لیا تو توقع ہے کہ ان کی اشاعت سے بہت سی نئی باتیں منظر عام پر آئیں گی۔

اب وہ تذکرے ملاحظہ ہوں جو مولانا آزاد کے بارے میں ان کے معاصرین کے خطوط میں کسی نہ کسی سلسلے میں آئے ہیں۔ مولانا گوناں گوں خصوصیات کے حامل تھے، مذہب، صحافت، ادب اور سیاست ان کے مخصوص میدان تھے، اس لئے جن لوگوں سے ان کے تعلقات تھے، ان میں عالم دین، صحافت نگار، ادیب اور سیاست داں سبھی قسم کے لوگ نظر آئیں گے، مگر ان کی خدمات جلیلہ کا بڑا حصہ سیاست سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر سیاست دانوں سے ان کے تعلقات زیادہ رہے ہیں، اس زمانے کے خطوط ابھی بہت کم منظر عام پر آئے ہیں، یہ سب جب شائع ہوں گے اس وقت مولانا آزاد کے بارے میں ان کے ساتھیوں اور ہم عصروں کی رائیں بڑی تعداد میں سامنے آئیں گی اور یہ فیصلہ کرنا آسان ہوگا کہ ان کے معاصر ان کی شخصیت سے کس قدر متاثر تھے، ان کے

خیالات و افکار سے کس قدر متفق تھے اور ان کی خدمات اور علمی قابلیت کے کہاں تک معترف تھے میں سب سے پہلے میدان سیاست کے رفیقوں کے خطوط کے اقتباسات نقل کرتا ہوں۔ مہاتما گاندھی اپنی عظیم الشان شخصیت کی بنا پر جہاں مولانا آزاد کے بزرگ تھے، وہاں ان کے رفیق کار بھی تھے انہی کے تذکروں سے ابتداء کرتا ہوں۔

مہاتما گاندھی

مولانا صاحب ایک دن کے لئے واردھا میں ٹھہر گئے اور ہم نے ایک طویل گفتگو کی۔ انھوں نے مجھے اس سمجھوتے کا مسودہ دکھایا جو اسمبلی کے مسلم لیگی اور کانگریسی ممبروں کے درمیان ہوا ہے۔ میرے خیال میں یہ ایک عمدہ دستاویز تھی۔ مگر انھوں نے مجھے بتایا کہ تم تو اسے پسند کرتے ہو، مگر ٹنڈن جی پسند نہیں کرتے۔ میں نے مولانا کی تجویز کے مطابق اس سلسلے میں موخر الذکر کو ایک خط لکھا ہے۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟

(بنام پنڈت جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۲۲ جولائی ۱۹۳۷ء، چند پرانے خطوط ص ۸۲-۳۸۳)

یہ تو مہادیو کی یادداشتوں کی نقل جو انھوں نے اپنی سیاحت صوبۂ سرحد پر لکھی تھیں .....
میں یہ یادداشتیں تمام ممبروں کے پاس گشت نہیں کرا رہا ہوں، بلکہ ان کی نقلیں صرف مولانا اور سبھاش کو بھیج رہا ہوں۔

(ایضاً۔ مورخہ ۲۵ اپریل ۳۸ء حصہ دوم صفحہ ۵۷)

میرے اس تار کے جواب میں جس میں میں نے سبھاش کو مشورہ دیا تھا کہ جناح سے باضابطہ گفت و شنید کا آغاز کردیں، انھوں نے مجھے تار دیا ہے کہ وہ دسویں کو بمبئی میں ہوں گے۔ میری خواہش ہے کہ تم بھی وہاں پہلے ہی پہنچ جاتے۔ میں مولانا صاحب کو بھی اسی انداز کا ایک خط لکھ رہا ہوں اور اس خط کی نقل ان کو بھیج رہا ہوں۔

(ایضاً۔ مورخہ ۳۰ اپریل ۳۸ء۔ حصہ دوم صفحہ ۶۱)

عزیزی جواہر لال

اگر تم تیار ہو تو اب تم ضابطے کے ساتھ سول نافرمانی کا اعلان کرسکتے ہو...... مولانا صاحب

[illegible] فرمایا کہ دوسری سیتہ گرہ کے لئے [illegible] شخص کا انتخاب کرنا چاہیئے [illegible] تم (یعنی جواہر لال۔ نظمی) آپ نے یہ تیار ہو تو میں کسی دوسرے شخص کا انتخاب [illegible]۔

(ایضاً۔ مورخہ ۲۴ راکتوبر ۱۹۳۲ء۔ حصہ دوم صفحہ ۳۳۳)

مولانا صاحب مصر تھے کہ مجھے الہ آباد جانا چاہیئے۔ میں نے اپنی مجبوری ظاہر کی۔ آج کل میرے لئے سفر کرنا دشوار ہے۔ علاوہ بریں میں نے اسی زمانے میں تین میٹنگیں طلب کی ہیں اس لئے مولانا سے میں نے معافی مانگ لی اور ان کو لکھ بھیجا کہ میں اپنی رائیں ایک قرارداد کی شکل میں بھیج دوں گا۔ (ایضاً۔ ۲۴ راپریل ۱۹۳۶ء حصہ دوم صفحہ ۳۸۳)

پنڈت موتی لال نہرو

... شیفع مسلک کے چند کٹر قسم کے رجعت پسندوں کے سوا مسلمانِ پنجاب کی اکثریت نے لکھنؤ کی قراردادوں سے اتفاق کا ابھی سے اعلان کر دیا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو شملہ والی میٹنگ میں شریک تھے، ہمیں یقین دلایا ہے کہ پنجاب سے بھی بہتر نتائج بنگال میں ہمارے سامنے آئیں گے اور مجھے ان کی کامیابی کا یقین ہے بہ شرطیکہ سرمایہ کافی رہا۔

(بنام ڈاکٹر بیسنت۔ مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۲۸ء۔ کچھ پرانے خط حصہ اول صفحہ ۱۰۶)

پنڈت جواہر لال نہرو

میں نے (مہادیو کی صوبہ سرحد سے متعلق) یادداشت کو پڑھ لیا ہے اور اب میں خاں صاحب کو اور خان عبدالغفار خاں کو خط لکھوں گا...... آپ کے علاوہ اگر کوئی شخص اس کام کو موثر طریقے پر انجام دے سکتا ہے، تو وہ مولانا ابوالکلام ہیں۔ میرے خیال میں ان کا صوبہ سرحد جانا نہایت ضروری ہے۔

(بنام مہاتما گاندھی مورخہ ۲۸ راپریل ۱۹۳۸ء۔ ایضاً حصہ دوم صفحہ ۵۸)

[illegible] گاندھی جی مولانا آزاد کو دیکھنے کی غرض سے آج الہ آباد پہنچے۔

(بنام سرتیج بہادر سپرو۔ مورخہ ۲۴ رمارچ ۱۹۳۹ء۔ ایضاً صفحہ ۱۲۰)

یاد دولی میں جو واقعہ پیش آیا وہ یہ تھا کہ میں نے، گاندھی نے اور دوسرے لوگوں نے

مولانا آزاد پر دباؤ ڈالا کہ وہ صدارت کے لیے اپنا نام پیش کرنے کی اجازت دیں۔ مولانا اس پر آمادہ نہیں تھے۔ جس روز میں باردولی سے روانہ ہو رہا تھا (تمہارے جانے کے بعد دوسرے دن) میں گاندھی جی اور دوسرے لوگوں کو خدا حافظ کہنے گیا۔ ہم میں سے کچھ لوگ گاندھی جی کی جھونپڑی کے برامدے میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ ولبھ بھائی اور مولانا کے سوا اور کون لوگ ہمارے ساتھ تھے۔ مولانا نے پھر کہا کہ ان کو اس ذمے داری کے قبول کر لینے میں پس و پیش ہے۔ اس پر ولبھ بھائی نے کہا کہ اگر مولانا انکار کر دیں تو ڈاکٹر پٹا بھی سے کہا جائے کہ وہ کھڑے ہوں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر پٹا بھی کا نام میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے ولبھ بھائی کی تردید کئے بغیر کہا کہ مولانا کو اس پر ضرور رضامند کیا جائے۔ اس کے بعد فوراً ہی میں باردولی سے روانہ ہو گیا۔ الہ آباد پہنچنے پر مجھے ایک تار اس مضمون کا ملا کہ مولانا رضامند ہو گئے۔

(بنام سبھاش چندر بوس۔ مورخہ ۳ راپریل ۳۹ء۔ ایضاً صفحہ ۱۷۸-۹)

میں نہیں جانتا کہ تمہارے لئے کانگریس کی مجلس عاملہ کے ایک رکن کی حیثیت سے جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ ان خطوط پر جن کی تم تصریح کرتے ہو، کسی سمجھوتے یا مفاہمت کی تجویز پیش کرنا کہاں تک درست ہوگا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں ہے کہ اس تجویز سے انتشار اور غلط فہمی پیدا ہوگی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ تم مولانا آزاد سے مشورہ کر لو؟ وہ کل یہاں آرہے ہیں اور تین چار دن ٹھہریں گے۔ اگر تم پسند کرو تو میں تمہارا ٹائپ کیا ہوا مسودہ ان کو دے دوں۔ (بنام سید محمود۔ مورخہ ۲ر فروری ۱۹۴۱ء۔ ایضاً صفحہ ۲۶۷)

سید وزیر حسن

میری یہ قطعی رائے ہے کہ تا حدِ امکان بڑے سے بڑے پیمانہ پر ایک عام جلسہ ایسے تمام مسلمان طبقوں اور عوام کا جو کانگریس کا نصب العین قبول کر چکے ہیں، نیز ان مسلمانوں کا جن کو میں کانگریسی خیال کا کہہ سکتا ہوں، کسی مرکزی جگہ جلد ہی مارچ کے اخیر تک یا اپریل کے

شہ[illegible]ند کیا جائے اور ضروری تجویزیں منظور کر کے مسلم لیگی پروپیگنڈے کی تردید میں ایک عام بیان جاری کیا جائے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس جلسے کے داعی ہوں۔

(بنام جواہرلال نہرو۔ مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۳۸ء۔ ایضاً صفحہ ۱۴۸)

سبھاش چندر بوس

مجھے بتایا گیا ہے کہ جب تم دہلی میں تھے تب تم نے مہاتما گاندھی تک یہ پیغام پہنچایا کہ مولانا آزاد سے ملنے کے لئے انھیں الہ آباد جانا چاہیئے۔

(بنام جواہرلال نہرو۔ مورخہ ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء۔ ایضاً صفحہ ۱۵۳)

خان عبدالغفار خاں

آنے وقت میں مولانا صاحب سے بھی ملا تھا اور میں نے ان سے ایک بات عرض کی تھی، جس کے متعلق انھوں نے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ ٹیلی فون پر آپ سے باتیں کریں گے۔ ممکن ہے انھوں نے آپ سے باتیں کی ہوں۔ دراصل یہ بات میں نے سیگاؤں میں مہاتما جی سے سنی تھی وہ اس خیال سے کسی قدر پریشان تھے کہ جواہر لعل ان کی رائے سے قطعاً اتفاق نہیں رکھتے یہ قصہ وردھا کی گفتگو کے بعد کا ہے اور وہ اُس وقت پس و پیش میں تھے کہ انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ میں نے ان کو اطمینان دلایا کہ میں پنڈت جی سے اسٹیشن پر ملا تھا اور ان سے بات چیت بھی کی تھی جو بالکل اطمینان بخش تھی۔ کچھ لوگوں کو (کچھ شکوک ؟) تھے۔ اس لئے پہنچنے پر میں نے مولانا صاحب سے اپنے خیالات عرض کئے اور انھوں نے مجھ سے اتفاق فرمایا۔ یہ طے پایا کہ ٹیلی فون سے آپ کو مطلع کر دیا جائے۔ مجھے امید ہے کہ آپ مہاتما جی کو لکھ دیں گے تاکہ معاملات کی صورت وہی ہو جائے جو مہاتما جی چاہتے تھے۔ مولانا صاحب اور میں یہی چاہتے ہیں۔

(بنام جواہرلال نہرو۔ مورخہ ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۸ء۔ ایضاً صفحہ ۳۳۰-۳۲۹)

پُرنیما بنرجی

یہاں (الہ آباد) سے رخصت ہونے سے پہلے مولانا سے ملنے کا ارادہ رکھتی ہوں، مجھ کو یقین ہے

گرمی، درجیل کی زندگی ان کے سکون میں خلل انداز ہونے یا زندگی سے متعلق ان کا
اس سے اُن کو برگشتہ ومنحرف کرنے میں ایک لمحہ کے لئے بھی کامیاب نہ

(بنام جواہرلال نہرو - مورخہ ۷ مئی ۱۹۴۱ء - ایضاً صفحہ ۳۳۹)

جی - ادھیکاری (کمیونسٹ پارٹی کے ایک سربرآوردہ ممبر)

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ..... سردست قوم کے اندر برطانیہ دشمن حیثیات کی حرارت بھر دی ہے۔ جب یہ حرارت ٹھنڈی پڑ جائے گی تب قوم اس سے شدید تر ہزیمت خوردگی اور جاپان دوستی کے جذبات کے آغوش میں جا پڑے گی - مولانا نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا تھا جو چھپ چھپ کر حملہ آور کو خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔

(بنام پنڈت جواہرلال نہرو - مورخہ ۳ مئی ۴۲ء - ایضاً صفحہ ۸۷-۳۸۶)

آصف علی

یہاں (قلعہ احمد نگر) سے تمہارا جانا مجھے اور مولانا کو فراق کا ایک صدمۂ عظیم پہنچا گیا شام تک تو کچھ زیادہ محسوس نہیں ہوا، مگر دوسرے دن صبح کو یہ فراق بہت کھلا - میری روانگی تک مولانا نمایاں طور پر دل گرفتہ سے دکھائی دے رہے تھے..... برسبیل تذکرہ چلتے چلتے دو ہفتے کی شکر کا کوٹا مجھ پر لاد دیا گیا اور مجھے اس کو بھی اپنے آخری وصیت نامے میں اس کی فیاضانہ تقسیم کے لئے شامل کر لینا پڑا - اس وصیت نامے کو نافذ کرنے والے تنہا مولانا ہوں گے۔

(بنام جواہرلال نہرو - مورخہ ۳۰ اپریل ۴۵ء - ایضاً صفحہ ۴۰۷)

ایم - این - ساہا (یونیورسٹی سائنس کالج - کلکتہ)

کلکتہ یونیورسٹی نے آپ کو اور مولانا آزاد کو کملا لکچرر مقرر کیا ہے - باوجودیکہ مسلم لیگیوں نے اس سے شدید اختلاف کیا اور کہا کہ مولانا آزاد اپنا ما فی الضمیر انگریزی میں ادا نہیں کر سکتے۔

(بنام جواہرلال نہرو - مورخہ ۱۲ اگست ۴۵ء - ایضاً صفحہ ۱۲-۴۱۳)

ایس۔ انچ۔ شیین [illegible] نئی دہلی،

[illegible] واقعات اور حالات کے پیشِ نظر ڈاکٹر صاحب[51] نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ میں ان کی بہترین تمنائیں آپ کو اور مولانا آزاد کو پہنچا دوں۔

(بنام جواہر لال نہرو۔ مورخہ ۱۵ اگست ۶۴۵۔ ایضاً صفحہ ۱۴۲)

ڈاکٹر اقبال

الحمد للہ کہ مولانا آزاد کو آزادی ملی[52]۔ ...... مولانا آزاد اب کہاں ہیں، پتہ لکھئے کہ ان کی [illegible] عریضہ لکھوں۔

(بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۳ اپریل ۱۹۱۹ء اقبال نامہ صفحہ ۱۰۰)

مولانا ابوالکلام کا تذکرہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ بہت دلچسپ کتاب ہے۔ مگر دیباچہ میں مولوی فضل الدین احمد لکھتے ہیں کہ "اقبال کی مثنویاں تحریک الہلال ہی کی آواز بازگشت ہیں" شاید ان کو یہ معلوم نہیں کہ جو خیالات میں نے ان مثنویوں میں ظاہر کئے ہیں ان کو برابر ۱۹۰۷ء سے ظاہر کر رہا ہوں۔ اس کے شواہد میری مطبوعہ تحریریں نظم و نثر انگریزی و اردو موجود ہیں، جو غالباً مولوی صاحب کے پیشِ نظر نہیں۔ بہرحال اس کا کچھ افسوس نہیں کہ انھوں نے ایسا لکھا، مقصود اسلامی حقائق کی اشاعت سے ہے نہ نام آوری۔ البتہ اس بات سے مجھے رنج ہوا کہ ان کے خیال میں اقبال تحریک الہلال سے پہلے مسلمان نہ تھا، الہلال نے اسے مسلمان کیا۔ ان کی عبارت سے ایسا خیال مترشح ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کا مقصود یہ نہ ہو۔ میرے دل میں مولانا ابوالکلام کی بڑی عزت ہے اور ان کی تحریک سے ہمدردی۔ مگر کسی تحریک کی وقعت بڑھانے کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اوروں کی دل آزاری کی جائے۔[53]

(ایضاً صفحہ ۱۱۱)

---

[51] ڈاکٹر تائی چیتاؤ، صدر امتحان یوان ایک خیرسگالی مشن کے سربراہ کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے۔ [52] رانچی کی نظربندی سے جنگِ عظیم اول کے بعد رہائی ملی تھی۔ [53] اگلے صفحے پر حاشیہ ملاحظہ فرمائیے۔

بحمداللہ کہ اب قادیانی فتنہ پنجاب میں رفتہ رفتہ کم ہو رہا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی دو تین بیان چھپوائے ہیں، مگر حال کے روشن خیال عمار کو ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے۔
ایضاً صفحہ [illegible]

باقی رہا یہ امر کہ موجودہ بیداری کا سہرا میرے سر ہے یا ہونا چاہیئے، اس کے متعلق کیا عرض کروں مقصود تو بیداری سے تھا، اگر بیداریٔ ہندوستان کی تاریخ میں میرا نام تک بھی نہ آئے تو مجھے قطعاً اس کا ملال نہیں، لیکن آپ کے اس ریمارک سے مجھے بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس بات کا شاید کسی کو احساس نہیں۔ مولوی ابوالکلام صاحب آزاد کے تذکرہ کا دیباچہ لکھنے والے بزرگ نے جن الفاظ میں مولانا محمد علی، شوکت علی اور میری طرف اشارہ کیا ہے، ان سے میرے اس خیال کو اور تقویت ہوگئی ہے، لیکن کسی کو بھی اس کا احساس نہ ہو تو مجھے اس کا رنج نہیں، کیونکہ اس معاملہ میں خدا کے فضل و کرم سے بالکل بے غرض ہوں۔

(بنام عشرت رحمانی۔ مورخہ ۳۰ راگست ۱۹۲۱ء۔ اقبال نامہ

رفٹ نوٹ صفحہ ۱۰)، غالباً سید صاحب نے ڈاکٹر اقبال کے شکوہ کی مولانا آزاد کو اطلاع کر دی تھی۔ چنانچہ مولانا آزاد مرحوم اپنے ایک خط میں سید صاحب کو لکھتے ہیں: "ڈاکٹر اقبال کا شکوہ بیجا نہیں۔ یہ نہایت ہی لغو اور سبک بات ہے کہ فلاں نے فلاں بات فلاں کے اثر سے لکھی، اور فلاں کے خیال میں یوں تبدیلی ہوئی۔ لیکن لوگوں کا پیمانۂ نظر یہی باتیں ہیں تو کیا کیا جائے۔ دراصل ان مخنت "تذکرہ" کی ساری باتیں میرے لئے تکلیف دہ ہوئیں۔ مسٹر فضل دین نے یہ مقدمہ لکھ کر نظر ثانی کے لئے بھیجا تھا، میں نے واپس نہیں بھیجا اس لئے کہ وہ موجودہ حالت میں کتاب کو پہلا حصہ کر کے شائع کرنا چاہتے تھے اور میں مُصر تھا کہ ایک ہی مرتبہ میں پوری کتاب شائع کر دی جائے۔ صرف اتنا ٹکڑا اور درجہ ضمنی ملفوظات و عدم انضباط کی وجہ سے نہایت مکروہ ہو گیا۔ خیال کیا کہ مقدمہ کا واپس نہ کرنا اشاعت میں روک ہوگا، لیکن انھوں نے بجنسہ چھاپ کر جلد باندھ کر ایک ایک نسخہ بھیج دیا اور ان ساری باتوں کو وہ مزاج [illegible] ڈاکٹر اقبال کے [illegible] کے زیرا مقدمہ طرز تحریر و استدلال وغیرہ کے لحاظ سے بھی بالکل [illegible] اقبال کی نسبت آپ نے کیونکر تبدیلی معلوم [illegible] کہی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اقبال ہے [illegible] سے ہٹ گئے اور دونوں مثنویوں میں [illegible]
(۲۱ جنوری ۱۹۲۰ء)

اکبر الہ آبادی

.... اسی ضمن میں پین وپلیثر اور چند دیگر الفاظ کے متعلق کچھ نوٹ لیے تھے۔ الہلال میں یہ بحث دیکھ کر میں نے بغیر زیادہ غور کیے ایک خط اڈیٹر صاحب کو لکھ دیا، جس کو انھوں نے چھاپ ... میں اپنے خط کو واپس لیتا ہوں۔

(بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ مورخہ ۲۶ اگست ۱۹۱۳ء خطوط مشاہیر، ۱۴۱، ۱۴۲)

میں نے ابھی الہلال کو لکھ بھیجا ہے کہ میں اس تحریر کو واپس لیتا ہوں۔ آپ کو بھی اجازت دیتا ہوں کہ ان الفاظ کی بحث میں (جس غرض سے وہ پیش ہی) مجھ کو اپنے خلاف نہ سمجھئے۔ آپ کی کل تحریر سے مجھ کو اتفاق ہے بجز اس کے کہ ہیپینیس (HAPPINESS) کا ترجمہ لذت میں ابھی نہیں سمجھا۔

(ایضاً۔ مورخہ یکم ستمبر ۱۹۱۳ء)

میں نے الہلال کے آرٹیکل نہیں دیکھے تھے۔ صرف اسی پر نظر پڑی تھی کہ حظ و کرب لذت والم میں کس کو ترجیح ہے۔ پچھلے دونوں لفظ بہت مانوس تھے، میں نے الہلال کو دو سطریں لکھ بھیجیں۔ اس کے بعد میں نے آرٹیکل پڑھے، آپ کی مشکلات کا خیال آیا، لہذا میں نے دست برداری کی ؎

نگفتہ نہ دارد کسے با تو کار ۔۔۔ ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

(PAIN - PLEASURE) اُس وقت یعنی ۱۹۱۳ء میں میں فلسفۂ جذبات لکھ رہا تھا۔ نفسیات کی بہت سی اصطلاحیں اردو میں گویا پہلی بار آرہی تھیں۔ نوعمری کا زمانہ ایک تو یوں ہی جوشش کا ہوتا ہے (میری اس وقت ۲۱ سال کا تھا) پھر پہلی تصنیف، جوش دُہرا دُہرا تھا۔ مولانا ابو الکلام صاحب الہلال کی فرمائش کتاب کا ایک باب الہلال میں اشاعت کے لیے گیا۔ ان دو انگریزی لفظوں کے ترجمے حظ و کرب تجویز کیے۔ الہلال نے اس پر نوٹ دیا کہ ان کے بجائے لذت والم مناسب ہیں اور اس پر ایک طویل و سرگرم بلکہ تلخ و تند سلسلۂ بحث الہلال ہی میں چل نکلا۔ الہلال نے اپنی تائید میں ایک مکتوب حضرت اکبر کا شائع کیا تھا۔ اس خط اور اس کے بعد والے خطوط میں اشارے اسی بحث سے متعلق ہیں۔

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

.... ہاں جناب الہلال صاحب نے میرا خط نہیں چھاپا۔ لکھا کہ میرے دوسرے آرٹیکل کے منتظر رہیے۔ آپ کی فلسفہ دانی کا اعتراف کرتے ہیں۔ میں نے ان کو بھی مشورہ دیا کہ جب جملہ امور متعلقہ پر لحاظ کرنا منظور و ممکن نہیں تو اعتراض سے اعراض اولیٰ ہے۔ (ایضاً صفحہ ۴۹، ۵۲ مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۳ء)

... خط کا ٹھیک ایووئٹ ٹرم مجھ کو سوائے حرمان کے کوئی نہیں ملتا۔ لیکن حرمان میں پین کا آئیڈیا صریحی نہیں ہے۔ اردو میں مایوسی کے معنوں میں شعرا کی زبان پر ہے۔ یاس و حرمان غالباً کہہ سکتے ہیں۔ وہ محظوظ ہوئے، میں محروم رہا۔ لذت والم میں کچھ حرج نہیں، لیکن واضع مصطلحات کو اختیار ہے۔ آپ کے دوست الہلال کا زرِ ضمانت ضبط ہو گیا ؎[۱]

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر دورِ فلک ہلال کو لایا صلیب پر[۱]

(ایضاً۔ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء ص ۵۵)

میں نے الہلال کی گواہی اسی سبب سے واپس لی تھی کہ ایک لفظ پر کسی ایک پہلو کے لحاظ سے ٹوک دینا آسان ہے۔ میں نے دیکھا کہ آپ کی نظر میں مفہومات فلسفہ ہیں۔ آپ سسٹم چاہتے ہیں، ہسٹری چاہتے ہیں، نہایت بلند اور مشکل کام ہے، اعتراض بیجا ہے، بجز اس کے کہ آپ ہی کی طرح آپ کے ساتھ اس کام میں دن رات غرق رہے۔ (ایضاً صفحہ ۵۸)

۳ ستمبر کے پرچہ الہلال میں جو فہرست علوم کے نام کی شائع ہوئی ہے، کاش ہر ایک علم کے ساتھ اس علم کے دو ایک مسئلہ بھی لکھ دیے جاتے تو یہ فہرست بہت مفید ہو جاتی۔ کیونکہ نہ صاحب مضمون سے درخواست کی جائے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ الہلال نے موجودہ مضمون شائع کر دیا ہے کس تاریخ کے پرچے میں شائع کیا ہے؟

(ایضاً مورخہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۶۱، ۶۲)

.... کوشش کیجیے کہ بیان صاف ہو۔ ابوالکلامی نہ ہو۔ (ایضاً، مورخہ ۴ جون ۱۹۱۷ء ص ۱۲۱)

---

[۱] اکبر صنعتوں کے بھی بادشاہ تھے۔ مغرب اور غریب کی اور مغرب اور الہلال کی اور برق، ہلال اور فلک کی مناسبتیں بالکل ظاہر ہیں۔ (مولانا عبدالماجد دریابادی)

مولانا عبدالحق بابائے اردو

بڑی فکر یہ ہے کہ دلی میں جاکر ٹھہروں کہاں۔ سوا ابوالکلام آزاد یا رفیع احمد قدوائی دوسری کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔

(بنام مولوی سید ہاشمی فریدآبادی۔ تاریخ درج نہیں۔ اردوئے معلی صفحہ ۱۵۴)

اب خود طلب مسئلہ انجمن کی منتقلی کا ہے۔ اس پر غور کر رہا ہوں۔ دریا گنج جانے سے سب منع کرتے ہیں۔ اب رہے وہ مکانات جو ہماری زمین پر بنالئے گئے ہیں، اس بارے میں مولانا اور پنڈت نہرو سے گفتگو کرنی باقی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۵)

مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں اور میرے ساتھ رفیق اور شبر بھی ہیں مجھے وہاں کے قیام سے بہت شرم معلوم ہوتی ہے۔ سچ سچ ایک پناہ گزیں کی حیثیت ہے.... ہم مولانا کے ہاں ناخواندہ مہمان یا پناہ گزینوں کی حیثیت سے رہتے ہیں مجھے آئے چوتھا روز ہے، لیکن وہاں ایک ایک دن بھاری ہے اور جب آدمی چائے یا کھانے کے لئے بلانے آتا ہے تو مجھے بے حد شرم معلوم ہوتی ہے.... آج جب ہم چائے پی رہے تھے تو دفعتہً قاضی عبدالغفار خاں نازل ہوئے اور چائے میں شریک ہوئے۔ رفیق اور شبر سے کچھ علیک سلیک ہوئی۔ وہ بھی مولانا کے مہمان ہیں۔ پہلے مولانا کو جو مکان ملا تھا (شاید پرتھوی راج روڈ پر) وہ بہت وسیع اور عالی شان اور اس کا چمن بہت ہی پر بہار تھا۔ یہ مکان بہت چھوٹا ہے اور مہمانوں کے لئے صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اس میں ہم تین اور ایک اور صاحب ٹھہرے ہوئے ہیں۔ قاضی صاحب نے اجمل خاں سے کہا کہ میں ان کے ساتھ نہیں ٹھہروں گا۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے ہاں صرف ایک ہی کمرہ ہے۔ اتنے میں مولانا.... پہنچے انھوں نے مولانا سے جاکر کہا تو مولانا نے اوپر کی منزل میں اپنے پاس کا کمرہ ان کو دے دیا۔ مولانا ہمارے ساتھ چائے یا کھانا نہیں کھاتے۔ (ایضاً صفحہ ۵۷-۱۵۸)

مولانا کے ہاں قیام سے مجھے بہت شرم معلوم ہوتی تھی اور وہاں زیادہ ٹھہرنا مجھے گوارا نہ تھا، اس لئے نظام پیلس میں آگیا ہوں۔ (ایضاً صفحہ ۱۵۸)

قاضی محمد عبد الغفار

آپ کی اخبارات اور رسائل کی فہرست میں میں نے دیکھا کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے اخبار "پیغام" اور رسالہ "لسان الصدق" کی چند جلدیں آپ کے کتب خانہ میں موجود ہیں: "آثار ابو الکلام آزاد" کا نیا اڈیشن تیار کر رہا ہوں اور اس سلسلہ میں ان دونوں جرائد کو دیکھنا چاہتا ہوں ...... یہ فائل خود مولانا آزاد کے پاس بھی نہیں ہیں۔

(بنام عبدالقوی دسنوی۔ مورخہ ۲۷ اپریل ۱۹۵۴ء)

میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر فلم "مرزا غالب" کے متعلق کوئی اطمینان بخش فیصلہ نہ ہوا تو یہ معاملہ بہت آگے بڑھے گا اور وزیر اعظم اور مولانا آزاد تک جائے گا۔

(بنام شہاب الدین دسنوی۔ مورخہ ۶ نومبر ۱۹۵۴ء نقوش۔ مکاتیب نمبر)

یہ غور کرنے کی بات ہے اگر مرکزی انجمن یا اس کے سکریٹری کی طرف سے کوئی آواز اٹھائی بھی جائے تو اس آواز کو ٹھوس اور ہر طرح مستند مواد پر مبنی ہونا چاہیئے، تاکہ جب پنڈت جی یا مولانا سے بات کریں تو ان کے سوالات کا پوری طرح جواب دے سکیں۔

(بنام حمیدہ سلطان۔ مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۵۴ء۔ ایضاً)

نواب وقار الدولہ وقار الملک مشتاق حسین خاں

(مسلم یونیورسٹی کے) ڈیپوٹیشن کے ممبروں کے نئے انتخاب کے وقت ایک تو اس بات کا ضرور لحاظ ہے کہ موزوں نام کافی تعداد میں منتخب ہوں، خواہ ان کی تعداد میں پہلے سے کمی کر دینا ضروری نہیں اور پھر جو لوگ اہل الرائے اور قوم کے ہمدرد ہوں ان کے انتخاب کی کوشش کی جائے، مثلاً حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب، مولوی ظفر علی خاں صاحب اڈیٹر زمیندار، مولوی وحید الدین سلیم، مولوی ابو الکلام صاحب آزاد ....

(بنام حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شیروانی۔ مورخہ ۲۳ جولائی ۱۹۱۳ء۔ مکاتیب محسن الملک وقار الملک۔ صفحہ ۱۳۰۔۱۳۱)

مہدی الافادی

ایک صاحب (ابوالکلام) "مستی" کے پیچھے پڑے ہیں کہ بے لگاؤ اس کا استعمال سنجیدگی کے خلاف ہے۔ ان کی نسبت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ

ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں

پینے کا اقرار کریں یا نہ کریں، لیکن اس خوش کیف شخص نے مخمور آنکھیں (رسیلی بینیاں ٹونا بھری) تو دیکھی ہوں گی، پھر یہ "تقدس ربانی" کیا "کفر" نہیں ہے؟

(بنام مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ مورخہ ۸ راگست ۱۹۱۹ء مکاتیب مہدی[۱])

کلکتہ سے "تذکرہ" (ابوالکلام) کی ایک جلد ہدیۃً ملی۔ رانچی کے بعد یہ دوسری رجسٹری تھی۔ جو میرے نام بھیجی گئی۔ اس امتیاز سے بہت خوش ہوں کیا اب بھی میرے بڑے آدمی ہونے میں شک ہے؟۔

(ایضاً مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۹۱۹ء صفحہ ۸۵ - ۸۶)

"تذکرہ" ابوالکلام کی ایک جلد ہدیۃً ملی ظاہری حیثیت سے لائق رشک ہے اور کیوں نہ ہو مسٹر احمد کی مشاطہ گری نے حسن کا غذی کو خوب نکھارا ہے، لیکن سوال یہ ہے کتاب کہاں تک اپنے موضوع کے حدود میں ہے۔ اب تک جس قدر دیکھ سکا، "اسمار الرجال" کا خاکہ ہے، خود رو یہ یمارکس ہیں، بے ترتیب فصلوں میں جمع کر دئے گئے ہیں، لیکن خاتمہ جان دے دینے کے لائق ہے۔ ذرا اچھی طرح کھلے گا۔ اظہار خیال محفوظ رہے گا۔ الہلالی تبلیغ کو میں پسند تو کرتا ہوں، لیکن افسوس ہے کہ مرض کا یہ اصلی علاج نہیں۔

(بنام مولانا سید سلیمان ندوی۔ مورخہ ۴ر اکتوبر ۱۹۱۹ء ایضاً صفحہ ۴۰)

مولانا سیماب اکبر آبادی

یہ آپ بار بار کہتے ہیں کہ تاج کو الہلال ہونا چاہیئے اور میں بار بار کہہ دیتا ہوں کہ:

---

[۱] "سامنے آئینہ تھا مستی تھی"۔ عزیز لکھنوی کے اس استعمال "مستی" پر مولوی ابوالکلام آزاد کو اعتراض تھا۔ ہمدم میں اسی پر مباحثہ رہا تھا۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی۔

[illegible] ہر کس بقدر ہمت اوست"۔ الہلال ایک مذہبی رسالہ تھا، آج ایک سیاسی اخبار ہے
الہلال ایک رہنمائے ملک کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، آج ایک شاعر کی اڈیٹری میں
شائع ہو رہا ہے، پھر میں جانتا ہوں کہ سیاست میں مجھے کمال حاصل نہیں، نہ ایک سیاسی
شخص کی حیثیت سے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔

(بنام ساغر نظامی۔ مورخہ ۱۳ ر نومبر ۱۹۳۱ء۔ روح مکاتیب حصہ اول صفحہ ۱۹۶)

"خطوط رموزی" کے نام سے اردو کے مقبول مزاحیہ نگار ملا رموزی کے کچھ خطوط شائع ہوئے
ہیں۔ غالباً یہ مزاحیہ اور طنزیہ مضامین ہیں جو خطوط کی شکل میں لکھے گئے ہیں، مگر چونکہ اس مجموعہ
کو خطوط کی صنف میں شمار کیا جاتا ہے، اس لئے نامناسب نہ ہوگا اگر اس کے اقتباسات
بھی یہاں پیش کئے جائیں۔

"خیام" لاہور کے سالنامہ میں غالباً مولانا آزاد کی کوئی غزل شائع ہوئی تھی۔ ملا رموزی
اڈیٹر خیام شبلی بی کام کو لکھتے ہیں: "مشہور لوگوں کے مضامین کا جہاں تک تعلق ہے، تو
جب ابوالکلام آزاد ایسے رئیس المشاہیر شاعر کی غزل تک اس میں موجود ہے تو اب اس کے
بعد گاندھی جی کی غزل ہی اور رہ جاتی ہے، ورنہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک اردو کا اخبار اپنے
سالنامہ میں کیا ستارہ مشتری اور ناہید لے آئے؟" (صفحہ ۲۷-۲۸) اڈیٹر رسالہ
"ارمغان" دہلی کو اردو صحافت کا ذکر کرتے ہوئے الہلال کے بارے میں لکھتے ہیں: "صحافت
اردو میں" الفاظ کا ذخیرہ" بہت خاصا جمع کیا جا رہا ہے، رہے علوم یا ٹھوس تحقیق تو اس کا
وجود نہ اخبارات اردو میں، نہ رسائل اردو میں، مگر اس کے اسباب ہیں۔ چنانچہ نمبر ایک یہ کہ
[illegible] الہلال اور رسالہ معارف اعظم گڑھ کو ملک میں سب سے سوا اعتبار اور وقعت کیوں
[illegible] کہ ان [illegible] بلند مضامین پیش کئے؛ محض اس لئے کہ ان
کے [illegible] اس طرح کہ ان علوم کی باقاعدہ تکمیل کی
(صفحہ ۱۲۸)

[illegible]

مولانا سید سلیمان ندوی

(مضمون کی کتابت ہو چکی تھی اور رسالہ پریس کے لئے تیار تھا کہ عین وقت پر معلوم ہوا کہ سید صاحب کے کچھ خطوط معارف میں چھپے ہیں ان میں مولانا آزاد کے متعلق جو تذکرے ملے ہیں، یہاں پیش کرتا ہوں۔

[illegible] اثنائے نظربندی میں مولانا ابوالکلام سے ملاقات باوجود اشتیاق نہ ہو سکی، اس کا افسوس اور حسرت ہے۔ (بنام مولوی ابوالکمال سید عبدالحکیم صاحب دسنوی۔ مورخہ ۲۹ دسمبر ۱۹۱۸ء معارف ستمبر ۶۲ ص ۲۲۴)

مولانا شیروانی اور مولانا ابوالکلام کی چھیڑ چھاڑ اخبارات میں آپ پڑھ چکے ہیں حالانکہ دونوں مولانا شبلی کے واسطہ سے باہمدگر علمی دوست تھے، مگر اختلافِ نظر دونوں کو حق کا منظر دو جگہ دکھا رہا ہے۔ (ایضاً ۲۲۵، ۲۲۶)

یہاں آکر (ناگپور بسلسلہ اجلاس کانگریس اعظمی) میری طبیعت کچھ اچھی نہیں رہی، اکثر لوگ مبتلائے بخار ہیں، ایک کمرہ میں مولوی ابوالکلام تین روز سے پڑے ہیں، دوسرے کمرے میں محمد علی صاحب کی بیوی انفلوئنزا میں مبتلا ہیں۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۸)

بیچارہ مولوی مسعود علی صاحب نے ضلع بھر میں (اعظم گڈھ میں بسلسلہ خلافت اعظمی) جلسہ کا پروگرام شائع کیا تھا، تین چار جگہ کے جلسوں کا پروگرام تھا، سب گڑبڑ ہو گیا، آج وہ ڈرتے ہوئے شاہ گنج گئے ہیں، بتا گئے تھے کہ گاندھی جی، محمد علی اور ابوالکلام کو لے آئیں گے۔ گاندھی جی تو صاف نکل گئے، محمد علی صاحب اور ابوالکلام نے ۲۸ کا وعدہ کیا ہے۔ محمد علی صاحب کا خط آیا ہے کہ وہ تاریخ بھی نہ رہی، ۲، ۳، ۴ کو آسکتے ہیں، بشرطیکہ اس کے معاوضہ میں ایک مہینہ قومی یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اعظمی) میں ترتیب نصاب کے لئے قیام کروں دیکھیں مولانا ابوالکلام کیا گل کھلائیں۔ مجھے تو وہ تاریخ بھی سستی نظر آتی ہے۔ (ایضاً صفحہ ۲۲۹)

شوکت صاحب کے چھ سات تار آئے اور بڑی لجاجت کے، انصاری صاحب کے آئے، ابوالکلام صاحب اور ظفر علی خاں کی طرف سے آئے، میں نے دل پر جبر کر کے سب کو جواب دیدیا ہے ...... تیسری کو صبح ۸ بجے شاید کلکتہ میں داخل ہو، اگر ابوالکلام صاحب نے نہ روکا تو اسی شب کو پٹنہ روانہ ہو جاؤں گا اور وہاں سے اعظم گڈھ۔ (ایضاً۔ معارف اکتوبر ۶۲ صفحہ ۳۱۰)
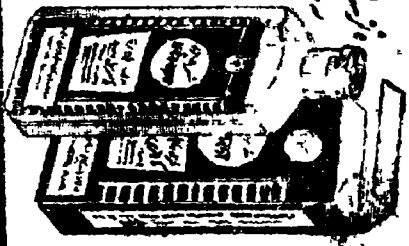
بیان بابتہ ملکیت رسالہ و دیگر تفصیلات

فارم نمبر ۴

مقام اشاعت: جامعہ نگر۔ نئی دہلی نمبر ۲۵

وقفۂ اشاعت: ماہانہ

پرنٹر، پبلشر اور اڈیٹر کا نام: عبد اللطیف اعظمی

قومیت: ہندوستانی

پتہ: جامعہ نگر۔ نئی دہلی

ملکیت: جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی

میں عبد اللطیف اعظمی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط پبلشر: عبد اللطیف اعظمی

۲۵ فروری سنہ ۱۹۶۳ء

The Monthly JAMIA
P. O. Jamia Nagar, New Delhi-25

جامعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

مجلس ادارت

خط و کتابت کا پتہ

رسالہ جامعہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

دور کے اندیشے

پروفیسر محمد مجیب

بچے اپنی طبیعت سے ماں باپ کی عزت کریں تو یہ ایک پیاری اخلاقی صفت ہو جاتی ہے، وہ خوف سے یا لالچ سے یا بار بار کہنے سے ان کی عزت کریں تو اس سے تربیت اور تعلیم کی ایک ضروری شرط پوری ہو جاتی ہے۔ مگر ماں باپ اور اولاد کے قدرتی رشتہ میں ایک بناوٹ بھی آجاتی ہے جس میں ایک شائبہ لگاؤ کا بھی ہوتا ہے۔ دوست ایک دوسرے پر احسان کرتے ہیں تو اس سے دوستی میں استقلال اور لطف پیدا ہوتا ہے، لیکن ان میں سے کسی کو کہنا پڑے کہ میرا یہ کام دوستی کی خاطر کر دو تو دوستی میں لین دین کی بو آجاتی ہے۔ دوسری طرف غالب کا یہ کہنا بھی بالکل صحیح ہے کہ کثافت کے بغیر لطافت کا جلوہ نظر نہیں آسکتا۔ قدرت کے حسن کو ظاہر ہونے کے لئے چمن اور سبزہ کی ضرورت ہے۔ اسی اصول پر انسانی زندگی کے حسن کو نمایاں کرنے کے لئے قاعدہ قانون، دستور اور رواج درکار ہوتا ہے۔ جمہوریت مروت ہے، شرافت ہے، احسان ہے، آزادی انسانیت کی آبرو، اخلاق کی جان ہے، مگر جمہوریت اور آزادی کو وجود میں لانے اور قائم رکھنے کے لئے ایسے جتن کرنے پڑتے ہیں کہ سختی اور جبر کا شدید احساس ہوتا ہے اور ان کے بدلے جو کچھ ملنا چاہیئے، اس کی حیثیت وعدہ اور امید کی سی ہی رہتی ہے۔ آزادی ہمارا حق ہے، جمہوری حکومت اس حق کو محفوظ رکھنے اور زندگی کا معمول بنانے کی سب سے اچھی تدبیر، آزادی خریدا ہوا مال نہیں ہے کہ ہم یہ سوچیں کہ کم یا زیادہ، ناقص یا اچھا۔ جمہوری حکومت ہم نے خود اپنے لئے پسند کی ہے، آزادی اور جمہوریت نے ہم میں رشتے قائم کر دئے ہیں، جنھیں مضبوط کرنا اور مضبوط رکھنا ہمارا

فرض ہے اور ہمیں چاہیئے کہ جس طرح بھی ہو سکے اس فرض کو بہتر سے بہتر طریقے پر انجام دیں۔

یہ بات سب کی سمجھ میں آجاتی ہے اور سب اسے مان بھی لیتے ہیں، لیکن سمجھ لینے اور مان لینے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ بات ہر دم نظر میں رہے اور جو فیصلہ اور خواہش ہو وہ اسی کے مطابق ہو۔ لوگ خدا کو مانتے ہیں، دل سے نہیں تو زبان سے ضرور کہتے ہیں کہ وہ خدا کے حکم پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کرتے وہی ہیں جو ان کے جی میں آتا ہے، وجہ یہ ہے کہ جو نسبت مادی چیزوں کی ہے وہ عقیدے اور اصول کی دنیا میں نہیں ہے۔ پہاڑ بڑا ہوتا ہے اور بڑا معلوم ہوتا ہے، پتھر اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا۔ آزادی کا اصول بہت بڑا ہے، ہمارے روزمرہ کے مسائل بہت چھوٹے، مگر بڑی چیز چھوٹی چیز کے آڑ میں چھپ جاتی ہے، ہمارا دیس جس سے ہم سب محبت کرتے ہیں بہت بڑا ہے، ہمارا گاؤں، یا شہر یا علاقہ اس کے مقابلے میں بہت چھوٹا ہے، مگر ہم ملک کے معاملات کا اتنا خیال نہیں کر پاتے جتنا کہ اپنی بستی یا علاقہ کا۔ اور اس کے فائدے کے لئے اس طرح جھگڑتے ہیں کہ جیسے ملک سے ہم کو کوئی خاص واسطہ نہیں۔ ہماری آزادی اور ہماری جمہوری حکومت کی کامیابی اس پر منحصر ہے کہ ہم خیالات کی دنیا میں چیزوں کی صحیح نسبت قائم رکھیں اور چھوٹی چیز کے پیچھے بڑی کو بھول نہ جائیں۔

انسانی زندگی ہمیشہ اور ہر جگہ خطروں سے گھری رہتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کے لئے بھی طرح طرح کے خطرے پیدا ہوتے رہتے ہیں، جن سے بچنے کی سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ لوگ ان سے واقف ہوں اور بچاؤ کی تدبیریں کرتے رہیں۔ ہندوستان کے لئے ان اندیشوں کے علاوہ جو ہر ملک کو ہوتے ہیں یہاں کی زبانوں اور مذہبوں کی طرف سے خطرہ ہے۔ ہندوستان کی ایک قومی زبان ہونا چاہیئے، جو سرکاری زبان بھی ہو، لیکن ملک میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں، جن میں سے چودہ کا دستور میں باقاعدہ ذکر ہے۔ ان زبانوں کے بولنے والے قدرتی طور پر ان سے محبت کرتے ہیں اور ان کی ترقی

[illegible] - پرائمری اور سکنڈری اسکولوں میں یہ زبانیں ذریعہ تعلیم بن چکی ہیں اور اب انھیں یونیورسٹیوں میں بھی ذریعہ تعلیم بنایا جا رہا ہے۔ اصولاً یہ بالکل صحیح ہے، مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جن لوگوں کی پوری تعلیم ان کی علاقائی زبان میں ہوگی ان کا دوسری زبانیں بولنے والوں سے رشتہ کیسے قائم رہ سکے گا۔ قومی زبان سب سیکھیں گے، لیکن اس میں بے تکلفی سے گفتگو اور پڑھنا لکھنا انھیں کے لئے ممکن ہوگا جن کی مادری زبان بھی ہو، اس طرح علاقائی زبانوں کی وجہ سے اس کا اندیشہ ہے کہ آبادی کے بڑے بڑے حصوں کے درمیان ایک اجنبیت سی پیدا ہو جائے گی، جو قومی یکجہتی کے لئے بڑی رکاوٹ بن سکتی ہے۔

مذہبی اختلافات کی وجہ سے ہندوستان کو بہت نقصان پہنچ چکا ہے اور بہت سے لوگ انھیں کو دور کرنا زیادہ ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم یہ قانون بنا سکتے ہیں کہ اسکولوں میں مادری زبان کے علاوہ دو یا تین ہندوستانی زبانیں سکھائی جائیں۔ اس سے تعلیم میں بے شک دشواری پیدا ہوگی، مگر کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ اس سے دستور کا دیا ہوا حق چھینا جا رہا ہے۔ یہ حکم دینا کہ ہر ہندوستانی اپنے مذہب کے علاوہ ہندوستان کے ایک یا دو اور مذہبوں کی تعلیم حاصل کرے ممکن نہیں اور ممکن ہوتا بھی تو اس کا بھی بھروسہ نہیں کہ اس طریقے سے اختلافات کم ہوں گے یا بڑھیں گے لیکن دراصل زبانوں کا اختلاف مذہبی اختلافات سے زیادہ خطرناک ہے، لوگ چاہیں تو مذہب کے اختلاف کو نظر انداز کر سکتے ہیں، اس لئے کہ اس کی وجہ سے مخالفت صرف کبھی کبھی اور خاص معاملوں میں پیدا ہوتی ہے۔ زبان کا اختلاف ہر وقت موجود رہتا ہے اور ہزاروں طریقوں سے سامنے آتا ہے۔ مسلمان اقبال کی طرح یہ تو کہہ سکتا ہے کہ مذہب آپس میں بیر رکھنا نہیں سکھاتا، مگر کہنے کے لئے پاس کوئی سند ہے کہ ہندی اور تامل یا اردو اور تیلگو کا فرق مٹایا جا سکتا ہے

ایسے ہی ہندی زبان اور مذہب کے اختلاف سے جو خطرے پیدا ہوتے ہیں انھیں
مثال سمجھ کر سوچیے کہ آزادی اور جمہوریت کی حفاظت کے لئے کیا کرنا چاہیے
آزادی ایک کیفیت کا نام ہے اور یہ کیفیت بدلتی رہتی ہے ہمارے سب کے ساتھ
ہو سکتا ہے کہ ہم کسی وقت محسوس کریں کہ آزاد ہیں اور کسی وقت یقین ہو جائے
کہ آزاد صرف وہ ہیں جس کے ہاتھ میں طاقت اور اختیار رہے۔ آزادی کے احساس
کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم جتنی شدت سے اپنے لئے آزادی کا
مطالبہ کریں، اتنے ہی شوق سے ہر دوسرے شخص کو ایسی ہی آزادی دینے پر
تیار ہوں۔ جمہوریت کی روح رائے دینے اور بحث کرنے کا حق نہیں ہے بلکہ ایک
دوسرے کی خواہش اور ضرورت کا لحاظ۔ آپ کہیں گے کہ یہ ممکن نہیں ہے لوگوں
کو صحیح رستے پر چلنے کے لئے مجبور نہ کیا گیا تو وہ بھٹک جائیں گے۔ آزادی سے
ناجائز فائدہ اٹھائیں گے، خود غرضی پر متفق ہو کر جمہوریت کا نام بدنام کریں گے۔
یہ اندیشہ بھی بے جا نہیں۔ اسی وجہ سے آزاد جمہوری حکومت کو بھی قانون
اور عدالت کی ضرورت رہتی ہے۔ قانون۔ عدالت۔ ٹیکس اور مختلف قسم کی پابندی
وہ کثافت ہیں جس کے بغیر آزادی اور جمہوریت کی لطافت ظاہر نہیں ہو سکتی
لیکن سوال یہ ہے کہ ہم اپنی نظر کہاں جمائیں۔ قاعدے قانون اور کثرت رائے
پر یا مروت شرافت اور احسان پر اس کا فیصلہ کوئی ایک شخص یا کوئی ایک سیاسی پارٹی سارے ملک کے
لئے نہیں کر سکتی۔ یہ فیصلہ صرف ہر شہری اپنے لئے کر سکتا ہے تعلیم تربیت کی پوری کوشش ہونا چاہیے کہ
وہ اس فیصلے کی طرف مائل ہو، مروت، شرافت اور احسان کی ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی مثالیں قائم کیے جس
سے یقین ہو کہ یہ صفتیں ملک کی فضا میں ہیں۔ صرف چند یادگار تاریخی شخصیتوں میں نہیں ہیں۔ آزادی اور
جمہوریت کو انسانیت سے جدا نہیں کیا جا سکتا کہ ان کا مدار انھیں صفتوں پر ہے جو آدمی کو انسانیت کی اعلیٰ
قدروں کا حامل بناتی ہیں۔ (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی)

غزل

حضرت غلام ربانی تاباںؔ

فراغ دل کو کہاں غم کے مشغلے کے سوا
سکون کچھ بھی نہیں ایک واہمے کے سوا

حرم بھی دیر بھی ہنگامہ زار سود و زیاں
مقام امن نہیں کوئی میکدے کے سوا

نہ کوئی راہ سے نسبت بجز خرابئ راہ
نہ کوئی ربط ہے منزل سے فاصلے کے سوا

ہم اہلِ شوق پہ سب آسرے حرام ہوئے
تری جفائے فراواں کے آسرے کے سوا

کرے ہے درد تمنا گلوں کے ساتھ نمو
بہار کیا ہے غم دل کے مرحلے کے سوا

وہ کشمکش جسے آسودگی کی جان کہیں
کہاں نصیب دل و دل کے رابطے کے سوا

بہت دنوں میں یہ جانا کہ کچھ نہیں تاباںؔ
حیات شوق شکستوں کے سلسلے کے سوا

مولانا آزاد کی ایک آرزو

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

غالباً ۱۹۳۲ء کی بات ہے ڈاکٹر مختار احمد انصاری مرحوم اس زمانہ میں جامعہ کے امیر (چانسلر) تھے ان کی خواہش تھی کہ جامعہ میں توسیعی خطبات کا سلسلہ جاری کیا جائے جس میں ایسے اصحاب کو لیکچر دینے کی دعوت دی جائے جو بین الاقوامی شہرت کے مالک ہوں یہ جامعہ کی شدید عسرت کا دور تھا مگر ڈاکٹر انصاری مرحوم کی توجہ نے کارکنوں کی ہمت بندھائی اور خطبات کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ سب سے پہلے ٹرکی کے سابق امیر البحر جین رؤف بے کو دعوت دی گئی۔ طرابلس و بلقان کے معرکوں اور جنگ عظیم میں رؤف بے نے ہمت و جرأت کے جو حیرت انگیز کارنامے انجام دئے تھے ان کی بنا پر انہیں غیر معمولی شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ ہندوستان میں یہ کارنامے الہلال کے ذریعہ لوگوں کے علم میں آئے تھے۔ ایک طرف ہمت و جرأت اور سرفروشی و جاں بازی کے یہ واقعات، دوسری طرف الہلال کا پرزور قلم نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پڑھنے والوں کے دل جوش و ولولہ سے بھر جاتے تھے، اس بنا پر جلسوں کی صدارت کا سوال ہوا تو سب سے پہلے مولانا ابوالکلام کا نام سامنے آیا۔ لوگوں کو بڑی خوشی تھی کہ ایک طرف رؤف بے کو دیکھنے اور ان کے خیالات سننے کا موقع ملے گا اور دوسری طرف مولانا آزاد کے عالمانہ تبصرہ سے استفادہ اور ان کی بے نظیر خطابت سے جوش عمل اور ولولہ کار میں اضافہ کا موقع ملے گا لیکن افسوس کہ مولانا کی صحت عین وقت پر خراب ہو گئی اور تشریف نہ لا سکے۔

چند دنوں کے بعد مولانا کی تندرستی بحال ہوئی تو آپ دہلی تشریف لائے۔ دریا گنج میں ایک کوٹھی کرایہ پہلے رکھی تھی اسی میں قیام ہوا۔ میں اس زمانہ میں جامعہ میں پڑھتا تھا۔ چند دوستوں نے

طے کیا کہ مولانا سے ملنے چلا جائے۔ چنانچہ ہم لوگ دریا گنج پہنچے، اطلاع کرائی کہ جامعہ کے چند طلبہ حاضر ہوئے ہیں۔ سکریٹری نے اطلاع کی اور مولانا نے کمرہ کے اندر بلا لیا۔ رؤف بے کی تقریروں کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ ذہنوں میں جنگ عظیم کے بعد ٹرکی کے انقلابی حالات اور کمالی اصلاحات تازہ تھیں۔ الغاء خلافت کے سلسلے میں مولانا آزاد کا مشہور سلسلہ مضامین پڑھ چکا تھا جو زمیندار کے چالیس کالموں میں شائع ہوا تھا اس طرح کچھ اس کی توجیہہ سمجھ میں آتی تھی اور دل کو یوں بھی اطمینان دلا لیا تھا کہ

ہر بنائے کہنہ کا بادان کنند   می ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

تعمیر سے پہلے تخریب ضروری ہے۔ قصر خلافت کے بوسیدہ کھنڈر مسمار ہو چکے ہیں ممکن ہے ان پر نئے در و بام تعمیر ہوں۔ لیکن اسلامی قوانین کو منسوخ کر کے یورپی قوانین جاری کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اور اس قسم کی اصلاحات مذہبی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض محسوس ہو رہی تھیں۔ مولانا سے ملاقات ہوئی تو رؤف بے کی تقریروں کا ذکر آیا اور اس سلسلہ میں ٹرکی کے موجودہ حالات پر گفتگو نکل آئی ہم میں سے کسی نے عرض کیا یہ مصطفےٰ کمال کی لامذہبیت کا نتیجہ ہے لیکن مولانا نے فرمایا،

"نہیں یہ اس عقیم نصاب تعلیم کا نتیجہ ہے جس نے نئے انداز نظر کو نظر انداز کیا اور ان علماء کا قصور ہے جو ہنوز ارسطو و افلاطون کے در کی جاروب کشی میں مصروف ہیں دنیا بدل گئی ہے علوم و فنون کہاں سے کہاں پہنچ گئے ہیں فکر و نظر کا معیار کچھ سے کچھ ہو گیا ہے ذہنوں کے سانچے یکسر بدل گئے ہیں لیکن ہمارے علماء ہیں کہ یونانیوں کے پس خوردہ ہی پر قناعت کئے ہوئے ہیں وہ عصر حاضر کے مسائل علم کلام کی فرسودہ کتابوں سے حل کرنا چاہتے ہیں اور نئے سوالات کے جواب پرانی کتابوں میں تلاش کر رہے ہیں۔ اس طرز عمل کا یہی نتیجہ نکلنا تھا جو نکلا لیکن اب بھی ہمارے غور و فکر کا انداز نہیں بدلا ہم مصطفےٰ کمال کو گالی دے کر اپنی کوتاہیوں پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں۔"

اس کے بعد بہت دیر تک دینی مدارس کے نصاب تعلیم پر تبصرہ کرتے رہے اور اس کی کوتاہیوں اور خرابیوں کی تفصیل بیان فرماتے رہے پھر بڑے درد سے فرمایا کہ:

"اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم مصطفےٰ کمال یا کسی اور کو برا بھلا کہیں اور بڑھتی ہوئی لادینی پر صرف ماتم کریں بلکہ اصل خرابی کو سمجھیں زمانہ کے تقاضوں سے آشنا ہوں، نئے انداز نظر سے واقفیت حاصل کریں۔ جدید علوم و فنون کو نصاب میں شامل کریں، مذہب کے اصل سرچشموں تک رسائی حاصل کریں، تقلید جامد کے شیوۂ قدیم کو ترک کریں، کتاب و سنت کے اصل نصوص کو غور و فکر کا مرکز بنائیں، نظر میں وسعت اور فکر میں گہرائی پیدا کریں، خود ساختہ رسم و رواج کی بندشوں سے آزاد ہوں اگر ہم نے ایسا کر لیا تو ہم عصر حاضر کی مشکلات حل کر سکیں گے اور لادینی کے سیلاب کو روک سکیں گے ورنہ ہماری کہنہ دیواروں میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ وقت کے اس تیز و تند دھارے کو روک سکیں۔"

اس وقت مولانا پر ایک خاص کیفیت طاری تھی بڑے درد کے ساتھ فرمایا

"مدتوں غور کیا ہے دین و ملت کی فلاح کی اور کوئی راہ نہیں ہے جی چاہتا ہے کہ اس خیال کو کہیں عمل میں لانے کا موقع ملتا لیکن بدقسمتی سے کہیں آزمائش کا موقع نہیں ملتا۔"

واقعی یہ مولانا کی سوچی سمجھی رائے تھی الہلال کی اشاعت سے پہلے ہی یہ خیالات ذہن میں جاگزیں ہو گئے تھے، الوکیل وغیرہ رسائل و اخبارات میں ان کے یہ خیالات شائع ہو چکے ہیں الہلال نکالا تو مختلف انداز میں اس جانب توجہ دلاتے رہے۔ چوتھی جلد تو ان مضامین سے پر ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ قدامت پسندوں نے مولانا شبلی کو ندوۃ العلماء سے علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا، ندوہ کی تحریک قدیم نصاب و نظام تعلیم کے خلاف ایک زبردست چیلنج تھی یہ مولانا شبلی کے دل کی آواز تھی وہ اور ان کے اصلاح پسند دوست اس تحریک میں شامل ہو گئے تھے، مولانا شبلی کی کوششوں سے

ندوہ کا دار العلوم جدید و قدیم کا سنگم بنتا جا رہا تھا اور امید ہونے لگی تھی کہ جس اصلاح کا خواب مصلحین ملت مدتوں سے دیکھ رہے تھے اس کی تعبیر دار العلوم ندوۃ العلماء کے قالب میں نگاہوں کے سامنے آ رہی ہے مگر جمود پسند طبیعتیں اس انقلاب کی متحمل نہ ہو سکیں قدامت پسند علماء نے مخالفت کا ایسا طوفان برپا کیا کہ ندوہ کی کشتی ساحل مراد تک آتے آتے رہ گئی مولانا شبلی کی علیحدگی نے اصلاح پسندوں کی تمناؤں پر پانی پھیر دیا۔ مولانا آزاد اس انقلاب حالت سے بہت متاثر ہوئے اس تاثر کے نتیجہ میں وہ طویل مضامین لکھے جو الہلال کی جلدوں میں اب تک محفوظ ہیں۔ اور جنہیں پڑھ کر ملت کی محرومی پر آج بھی دل خون ہوتا ہے۔

لیکن ندوہ کے اس دل دوز سانحہ کے بعد بھی مولانا آزاد کے دل سے یہ خیال نکلا نہیں بلکہ اس کی ضرورت کا احساس اور بھی شدید ہو گیا اصلاح ملت کے سلسلے کے مضامین میں ان خیالات کا اظہار صاف نظر آتا ہے۔ الہلال کے صفحات میں ایک نئے طرز کی درسگاہ کی ضرورت کا بار بار اظہار ہوتا رہا اس وقت الہلال و البلاغ کی جلدیں سامنے نہیں ہیں لیکن مجھے یاد آتا ہے کہ ایک بار کلکتہ میں ایک درسگاہ کے قیام کا اعلان تھا بلکہ اس کی عمارت کی تصویر بھی شائع کی تھی لیکن پھر انگریزی حکومت نے مولانا کی جدوجہد کو خطرناک سمجھ کر الہلال بند کر دیا مولانا نے الہلال کے بعد البلاغ جاری کیا لیکن اس کے سترہ ہی پرچے نکل پائے تھے کہ وہ بھی بند ہو گیا اور ۱۹۱۶ء میں مولانا رانچی میں نظر بند کر دیے گئے۔

جنگ عظیم کے بعد جب سیاسی قیدیوں کی رہائی عمل میں آئی تو مولانا بھی نظر بندی سے رہا ہوئے لیکن باہر آئے تو ملک میں انگریزوں کے خلاف ایک ہیجان برپا تھا خلافت کے حوادث اور جلیانوالا باغ کے مظالم نے ہندو مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا تھا اور کانگریس و خلافت کانفرنس کے ذریعہ سارا ملک متحد ہو کر انگریزوں سے ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں مصروف تھا مولانا نے ان حالات پر غور کیا اور ایک مرد مجاہد کی طرح ہر سمت سے یکسو ہو کر تحریک آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو گئے۔ اس مصروفیت میں کسی اور کام کا موقعہ نہ تھا مگر مولانا نے اس ہنگامہ کے زمانہ میں بھی

کلکتہ میں ایک عربی اور دینی درسگاہ قائم کی مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی مولانا عبداللہ مصری مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی اور مولانا عثمان ندوی جیسے ذی علم اور صاحب نظر اساتذہ کے ذریعہ اس دیرینہ آرزو کی تکمیل کی کوشش کی لیکن قید و بند کے اس دور میں کسی تعمیری کام کا چلانا سخت دشوار تھا مولانا آزاد پھر گرفتار ہوگئے۔ مولانا عبدالرزاق صاحب بھی جیل بھیج دیے گئے۔ مولانا عبدالرحمٰن نگرامی مرحوم نے اس زمانہ میں بڑی کڑیاں جھیلیں فاقہ پر فاقے کئے لیکن ساری قربانیوں کے باوجود کلکتہ کی یہ اسلامی درسگاہ نہ چل سکی۔ اس وقت کی تکلیفوں کا اندازہ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نگرامی کے مضمون "الجوع وما فی الجوع" سے ہوسکتا ہے۔ جو الجامعہ کلکتہ میں شائع ہوا تھا۔

اس کے بعد آزادی کی تحریک میں برسوں ایسی مصروفیت رہی کہ کسی دوسرے کام کی جانب توجہ کا موقع نہ ملا مگر مولانا کے دل میں یہ خیال برابر جاری رہا۔ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس قیصر باغ کی بارہ دری میں ہو رہا تھا اس زمانے میں مجھے چند دوستوں کے ساتھ برلنگٹن ہوٹل میں ان سے ملنے کا موقع ملا اور وہاں سے مولانا کی ہمراہی میں نواب علی حسن خاں صاحب مرحوم سابق ناظم ندوۃ العلماء کی کوٹھی تک جانے کا موقع ملا۔ اس موقع پر ندوہ کی گزشتہ تاریخ کا ذکر کرتے رہے اور اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ ملت کی درماندگی کا اس کے سوا اور کوئی علاج نہیں کہ "جدید و قدیم کا ایک سنگم بنایا جائے۔"

۱۹۳۷ء میں جب صوبہ جاتی خود مختاری حاصل ہوئی اور اکثر صوبوں میں کانگریسی حکومتیں قائم ہوئیں اور مولانا پنجاب، یوپی، بہار اور بنگال کے نگراں مقرر ہوئے تو آپ کو اس دیرینہ خیال کو پھر بروئے کار لانے کا خیال ہوا، عربی مدارس کو نصاب و نظام تعلیم کی اصلاح پر آمادہ کرنے کے لئے لکھنؤ میں مدارس عربیہ کے منتظمین اور اساتذہ کا ایک جلسہ اپنی قیام گاہ پر کیا اس کے لئے ایک کمیٹی بھی بنائی جس کے کئی بار ان کی رہنمائی میں جلسے ہوئے مگر سیاسی حالات اس طرح کے تھے کہ مولانا زیادہ وقت اس کام میں صرف نہ کرسکے اور مدارس عربیہ کے حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوسکی۔

۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان آزاد ہوا اور مولانا مرکزی حکومت کے وزیر تعلیم مقرر ہوئے

تو پھر اس دیرینہ آرزو کو جامۂ عمل پہنانے کا خیال آیا سرکاری طور پر ایک معیاری عربی درسگاہ قائم کی جاسکتی تھی مگر سرکاری درسگاہ کا مسلمانوں پر خاطر خواہ اثر نہیں ہو سکتا تھا پھر مدرسہ عالیہ کلکتہ کی اصلاح کا خیال آیا لیکن اس کی جو سرکاری حیثیت اس سے پہلے رہ چکی تھی اور انگریزوں کے ساتھ اس کا جو تعلق تھا اس کی بنا پر اس سے بھی مطلوبہ مقصد حاصل کرنا ممکن نہ تھا اس زمانہ میں مولانا کو خیال آیا کہ کیوں نہ ندوہ کے دارالعلوم کی طرف پھر توجہ کی جائے جدید علوم کی تعلیم کے لئے بڑے کثیر سرمایہ کی ضرورت تھی۔ مسلمانوں میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ لاکھوں روپے سالانہ کے مصارف برداشت کرسکیں اس لئے آپ نے ندوہ کے ارباب حل وعقد سے گفتگو کی اور فرمایا کہ حکومت ہند کی طرف سے دارالعلوم کے پورے مصارف کا انتظام کر دیا جائے اور بڑے پیمانے پر دارالعلوم کو چلایا جائے مگر ندوہ کے منتظمین اس پر راضی نہ ہوئے اور حکومت کے اثرات سے اپنی درسگاہ کو الگ رکھنا چاہا۔ مولانا کے اصرار پر ان لوگوں نے کہا کہ

"مولانا آپ ندوہ کو خوب سمجھتے ہیں آپ ہی کی سربراہی ہمیشہ حاصل رہتی تو ہمیں اس پیشکش کو قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا مگر آئندہ معلوم نہیں کن لوگوں سے سابقہ پڑے اور ندوہ کیا سے کیا ہو جائے اس لئے مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ حکومت کی سرپرستی میں اس درسگاہ کو چلایا جائے۔"

اس جواب پر مولانا خاموش ہوگئے اور دل کی آرزو عمل کی شکل نہ اختیار کرسکی لیکن ہر صاحب فکر آج بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ ملت کی درماندگی کا یہ ایک بہترین علاج ہے۔ دیکھئے کب اور کہاں مولانا کی یہ آرزو بروئے کار آسکے۔

کج نگاہی

عبداللہ ولی بخش قادری

کچھ بھلے مانس ہمیشہ روٹھے ہوئے سے دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی گم سم، کبھی غراتے ہوئے۔ انھیں زمانے کی ایک بھی کل سیدھی نظر نہیں آتی۔ جہاں دیکھتے ہیں، چولیں ڈھیلی ہی پاتے ہیں۔ کوئی بھی چوکس نہیں معلوم ہوتا۔ قدم قدم پر ان کا دل کڑھا کرتا ہے۔ ناگواری بڑھتی رہتی ہے اور جذبات کا ٹھہراؤ کم ہوتا جاتا ہے۔ ذرا سی زحمت بھی ان کے لئے ایک آفت بن جاتی ہے۔ ہر بات پر بگڑتے ہیں، ہر کام پر کھسیاتے۔ تمام خوبیاں ان کے لئے ناپید ہو کر رہ جاتی ہیں۔ جب بھی کسی طرف توجہ فرماتے ہیں، خرابی ہی دیکھتے ہیں۔ دوسروں کے عیب ٹٹولنے میں مزا آتا ہے اور مخالفت ان کی شریعت بن جاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ہر صبح کا استقبال ایک جھنجلاہٹ کے ساتھ کرتے ہیں۔ بستر سے اُٹھتے اُٹھتے ماحول کی گرانی کا بوجھ انھیں محسوس ہونے لگتا ہے۔ چاہتے ہیں کہ ناک پر مکھی تک نہ بیٹھے۔ بلاوجہ تاؤ کھاتے ہیں۔ ذرا جوتا نہ ملا، گرم ہو گئے۔ ناشتے میں کچھ دیر ہوئی، برس پڑے۔ کبھی متعلقین یا ملازمین کی شامت آتی ہے، کبھی موسم پر لعن طعن ہونے لگتی ہے۔ اللہ اللہ کر کے زندگی کا دھندا شروع ہو پاتا ہے لیکن سارا کاروبار چوپٹ دکھائی دیتا ہے۔ افسر ہیں تو کم نظر، ماتحت ہیں تو بے خبر۔ باقی بچے ساتھی۔ ان کی رائے میں سب کے سب ابن الوقت اور جہل مرکب۔ ہر ایک نالائق و نامعقول، مطلبی اور مکار۔ اگر ان کے منصب میں ترقی ہوتی ہے تو محض اس لئے کہ اقربا پروری اور احباب نوازی کا دور دورہ ہے۔ اگر وہ عزت و شہرت پاتے ہیں تو اس وجہ سے کہ سازش اور خوشامد کا زمانہ ہے۔ پڑوسیوں سے یہ خوش نہیں رہتے کیونکہ ان کے بچے شور مچاتے ہیں، بے ادب اور بدتمیز ہیں۔ کسی دعوت میں شریک ہوں تو انتظام و طعام کی شکایت

کرتے ہوئے ملیں۔ کسی راہ گیر پر اگر نظر پڑ جائے تو ناک بھوں چڑھ جاتی ہیں۔ کوئی صورت کا خراب نکل آتا ہے تو کوئی جامہ زیب نہیں معلوم ہوتا۔ بازار جائیں تو کوفت انھیں ہو۔ اگر کوئی چیز پسند آتی ہے تو اس کی قیمت مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگر قیمت ٹھیک ہوتی ہے تو چیز اچھی نہیں لگتی۔ اگر اتفاقاً قیمت اور چیز دونوں قابلِ قبول ہوں تو دکان کا ڈھچر یا دکان دار کا رویہ قابلِ اعتراض ہو جاتا ہے۔ جب بھی ان کے سامنے کسی ملاقاتی یا واقف کار کا تذکرہ ہو اس کی ذات پر عمل جراحی یہ فرمائیں۔ معقول سے معقول آدمی کے ٹانکے ان سے ادھڑوا لیجیے۔

طنزیہ قہقہے ان سے سنیئے اور سرد آہیں یہ بھریں غرضیکہ یہ بندہ روئے عالم سے خفا اپنے لئے ہے:

اسی طرح جذبات کے مد و جزر میں کبھی آنکھ بھوں چڑھائے، منہ پھلائے اور کبھی منہ لٹکائے یہ آپ کو نظر آئیں گے۔ بچارے دل کا کانٹا، زبان سے نکالا کرتے ہیں اور دوسروں کی کجی دور کرنے کی فکر میں اپنی نگاہ کا زاویہ بگاڑ بیٹھے ہیں۔ پھر انھیں کوئی اتنا نظر نہیں آتا جسے یہ اپنی نظر میں رکھ سکیں اور ان کی نگاہ اپنے ہی توہمات میں الجھ کر رہ جاتی ہے، وہ اپنے آپ کو اطمینان کی لذت سے محروم کر لیتے ہیں۔ اگر وہی بھات بہتر ہو بھی تاہم کھاتے کو منہ ٹیڑھا ہی رہتا ہے۔ جب بھی انھیں دیکھیے، بدلی ہوئی نگاہ ہے، بدلا ہوا مزاج! ان کی باتیں عموماً کوفت کا باعث ہوتی ہے جنھیں سن کر یہی کہا جا سکتا ہے کہ:

سبب تو کچھ نہیں معلوم لیکن — نظر آتے ہیں وہ کچھ خفا سے

لیکن ان کچھ کچھ خفا رہنے والوں کی طبیعت میں یہ بات بھی داخل ہو جاتی ہے کہ قواعد و ضوابط کا احترام نہ کریں۔ اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند رکھیں۔ آپ کو ادبی دنیا میں ایسے ناقد ملیں گے جو قطعی "ناقص" ہیں یعنی صرف نقص نکالتے ہیں۔ آپ ایسے سیاست دانوں کو بہ آسانی شمار کر سکتے ہیں جو حکومت کی ہر بات پر معترض رہتے ہیں۔ وہ بات کو صرف اس حد تک سنتے اور سمجھتے ہیں کہ اس کی مخالفت کر سکیں۔ انھیں اپنے اگلے ہوئے نوالے چبانے ہوئے بھی ندامت نہیں ہوتی۔ وہ اپنے اعتراض میں نہ اعتدال کا خیال کرتے ہیں

اور نہ تضاد کا۔ آج کل کے ہنگامی حالات میں ایسے لوگ صاف پہچانے جاسکتے ہیں، جن کی غلط نگاہی نے اُن سے معقولیت چھین رکھی ہے انھیں آپ حالاتِ حاضرہ پر بے لاگ تبصرہ فرماتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں، سرکاری اقدامات میں یہ کیڑے ڈالیں۔ لوگوں کے جوش وخروش میں انھیں شبہ نظر آئے۔ سیاست کی خامیاں اِن سے سُن لیجئے۔ حفاظتی تدابیر کی بے اثری اِن پر عیاں ہو۔ الغرض کوئی ایسا موضوع نہیں جس پر ان کی نظر ترچھی نہ پڑے لیکن اصل بات یہ ہے کہ ان کا دل طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا، دیکھ کر جل گیا ہے اور یہ فی سبیل اللہ اعتراض واختلاف کا بازار گرم کر بیٹھے ہیں۔ ایسے بدنفس بالآخر اپنی ترچھی نظر کی بدولت قطعی طور پر خود غلط ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مدرسوں میں ایسے بچے اکثر ملتے ہیں جو ساتھیوں کے فیصلے سے ہٹ کر ضرور قدم رکھتے ہیں انھیں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے میں مزا آتا ہے۔ کہنا یہ نہیں مانتے، پابندی انھیں گوارا نہیں ہوتی۔ گھروں کے اندر بھی بال ہٹ کا تماشہ ہوا کرتا ہے۔ بھولے بھالے معصوم بھی خوب ستاتے ہیں۔ پاس بلاؤ تو بھاگیں۔ خاموش رہنے کو کہا جائے تو شور مچائیں۔ لیکن بچوں کا یہ منفی رجحان اپنا وجود تسلیم کرانے کے لئے ہوا کرتا ہے۔ اولاً انھیں بات بنانی نہیں آتی اور وہ حُسنِ تدبیر سے اپنا کام نہیں چلا سکتے۔ لہٰذا جب اقرار نہیں کرنا چاہتے تو انکار ہی کرتے ہیں جب اتفاق نہیں کر سکتے تو اختلاف ہی کرتے بنتی ہے۔ بیچ کی راہ ان کے بس میں نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ان کی نیت بالکل صاف ہوتی ہے۔ ان کے دل میں کوئی چور نہیں ہوا کرتا اس لئے وہ بے دھڑک کہتے ہیں، لگی لپٹی کچھ نہیں رکھتے۔ تاہم بچوں کا یہ رویہ ان کی بے اطمینانی اور بددلی کا نتیجہ ضرور ہوتا ہے۔ استاد اور سرپرست اپنی توجہ سے اُن کے سوچنے کا غلط انداز بلا شبہ درست کر سکتے ہیں۔ ضرورت یہ ہے کہ اختلافی معاملات سے حتی الامکان بچوں کو بچایا جائے تاکہ انھیں کسی قسم کے تصادم کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ان کے ساتھ معمولی معمولی باتوں کو مسئلہ نہ بنایا جائے۔ ان کی معقول بات کو سراہا جائے اور مناسب عمل کی تعریف کی جائے ساتھ

ہی ساتھ اپنے عمل پر بھی نگاہ رکھی جائے۔ کبھی کبھی ہماری ترچھی نظر، بچوں کو ترچھا بنا دیتی ہے۔ بڑوں کے اپنے نقطۂ نگاہ سے بچوں کی زندگی بہت کچھ متاثر ہوتی ہے۔ جب ایک بچہ اپنا کام نہیں کرتا یا بات نہیں سنتا تو یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کس حد تک وہ بات اور کام بچے کی زندگی اور اس کی صلاحیت سے مطابقت رکھتے ہیں۔ بچپن کی طرح نوجوانی میں بھی ڈگر سے ہٹ کر چلنے کی خواہش زور مارتی رہتی ہے۔ پابندی یہاں بھی کھلتی ہے بزرگوں کے احترام کو بالائے طاق رکھ کر گستاخانہ رویہ بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی طبیعت بھی بے روک ہوتی ہے اور مصلحت بینی کا پاس یہ بھی نہیں کر پاتے لیکن یہ ترچھی نظر والی بات پھر بھی نہیں ہے۔ یہ تو نوجوان دل کی امنگ اور آزادی کی تڑپ ہوتی ہے۔ وہ ابھی تک آدابِ مجلس کو پورے طور پر برت نہیں پاتے ہیں اس لئے ان کے برتاؤ میں منفی رجحان کی جھلک نظر آتی ہے۔ مگر ان کی نظر بھی اس وقت سے ترچھی ہونے لگتی ہے جبکہ سرپرست سخت گیری پر اتر آتے ہیں اور ان کے طرزِ عمل میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ کالج کے طالب علم کا احتجاجی انداز اور تخریبی نظریہ یقیناً اس کے غیر آسودہ ذہن کی غمازی کیا کرتے ہیں اور جس بے باکی سے وہ اقدار کی ناقدری کرتا ہے اس کے اندر اس کی اپنی بے قدری کا احساس ضرور کارفرما ہوتا ہے۔

اگر یہ ترچھی نظر نوجوانی کے جاتے جاتے سیدھی نہیں ہو جاتی تو اسے زندگی کے کچے پن کی علامت سمجھنا چاہیئے۔ سماجی زندگی کے تقاضوں سے آنکھیں چار نہ کرنے والے ہمیشہ اکھڑے اکھڑے رہتے ہیں اور انھیں ہر وقت اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کی فکر لگی رہتی ہے۔ ترچھی نظر بھی منفی نظریہ حیات کا ایک حربہ ہے۔ نکتہ چینی اور عیب بینی پر محض اس لئے کمر باندھ لی جاتی ہے کہ اپنی کوتاہیوں کا غم نہ ستائے۔ انھیں اپنے اختلاف ہی میں شانِ امتیاز نظر آتی ہے۔ انھیں کاروانِ حیات کے رہروانِ تیز گام کے ساتھ چلتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی ہے اور اپنے گم ہو جانے کا خطرہ اس حد تک لاحق ہو جاتا ہے کہ چیخ چیخ کر نشانِ منزل اور سمتِ کارواں ہی غلط بتانے لگتے ہیں۔ یہ بددماغ بات چیت میں بھی اپنے آپ کو بڑا ذہین اور طباع ظاہر کرنے کی کوشش کیا کرتے ہیں بلکہ اپنی خام خیالی میں خود کو ایسا ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ موقع بے موقع اپنے آپ کو پختہ، مکمل اور موثر دکھلانے کے لئے مختلف ہتکنڈے

استعمال کرتے ہیں لیکن ان کی بوکھلاہٹ، شدت جذبات اور بے جا توجہ سے دوسروں پر الٹا ہی اثر پڑتا ہے۔ جتنا یہ تنتے ہیں اسی قدر اصلی خد و خال ابھرتے ہیں۔ ایسی صورت میں عزت گرتی ہے، وقار کم ہوتا ہے۔ اس رسوائی پر دل کچھ اور کڑھتا ہے اور خود فریبی کی بدولت ترچھی نظر کچھ اور ترچھی ہو جاتی ہے۔

یہی وہ خوش فہم لوگ ہیں جو بزعم خود ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر زندگی کی بازی جیتنا چاہتے ہیں حالات کی سختی اور واقعات کی تلخی انھیں حقائق سے آنکھیں چرانے پر آمادہ کر دیتی ہے تاہم طبیعت، خود نمائی کے لئے مجبور کرتی رہتی ہے لیکن خود کچھ کرتے نہیں، محض پینترے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ صورت حال اپنے اوپر اعتبار و اعتماد نہ ہونے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ ایسے لوگ اپنے آپ سے ڈرتے ہیں اور خود کو ہمیشہ غیر محفوظ خیال کیا کرتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس ترچھی نظر کی اوٹ میں ان کی داد طلب نگاہیں پہچان میں آ سکتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو زمانے کے ظلم و ستم کا شکار سمجھتے ہیں۔ یہ تو در حقیقت حالات کی ستم ظریفی ہے کہ ان پر کوئی ترس نہیں کھاتا ورنہ وہ شکایت کے نہیں، عنایت کے مستحق ہیں لیکن ان کے لچھن مار کھانے کے ہی ہوتے ہیں، اس لئے زمانہ عموماً معاف نہیں کرتا۔ یہ اپنی گمراہی اور غفلت کے سبب دنیا کو بہکاتے ہیں لیکن دراصل خود بہک کر رہ جاتے ہیں۔ انھیں نرمی کے ساتھ دھیرے دھیرے راہ پر لگانے کی ضرورت ہے۔ جب وہ یہ سمجھ لیں گے کہ دل کا چین اپنے آپ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے بے چین رہنا پڑتا ہے۔ شہرت، زحمت چاہتی ہے اسے پکڑیے تو بھاگتی ہے۔ اس کے خیال میں رہیے تو خوار ہو جائیے۔ لیکن جوہر دکھائیے تو اس کی چمک دمک کے ساتھ تعلق پیدا کر لیتی ہے، پھر اس سے بچئے تب بھی پیچھا نہیں چھوڑتی کبھی نہ کبھی ڈھونڈ ہی لیتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نام کے لئے کام چاہیئے۔ زندگی کے باغ میں خون پسینہ ایک کرنے سے بہار آتی ہے۔ لگن کا سچا اور دھن کا پکا ہی پھل پاتا ہے۔

"نئی کویتا"

جناب مجیب رضوی

نئی کویتا سے زمانۂ حال کی شاعری مراد لینا درست نہیں ہے کیونکہ ایک خاص قسم کی ادبی تحریک کو اس نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔ یہاں "نئی" کا مطلب جدید نہیں ہے بلکہ اس لفظ کا مطلب انوکھی یا عجیب زیادہ مناسب اور موزوں ہے۔ اس کا خمیر ٹی ایس ایلیٹ، ہربرٹ ریڈ، اور ا پانڈ، ہنری لارنس، جیمس جوائس اور سارتر کے جدت پسند خیالات اور ادبی تجربات سے بنا ہے۔ یہ تحریک ادب کے ہر پہلو میں نیا پن چاہتی ہے۔ اسے نئے طرز بیان کی تلاش ہے۔ اسے نئے خیالات، نئے جذبات و احساسات، اور نئے تصورات کی جستجو ہے۔ اس "نئے پن" کو ہندی شاعری میں سمونے کے لئے یہ تحریک ایک نئی زبان، نئی ترکیب، نئی علامت، نئی تشبیہہ، نئے استعارے اور نئی ہیئت کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اس تحریک کے حامیوں کو ابھی تک اس میدان میں کسی خاص کامیابی کا دعویٰ نہیں ہے۔ پھر بھی وہ اپنی کوشش میں مستقل مزاج ہیں۔ اسی حد سے تجاوز کرنے والی جدت پسندی کی بدولت یہ "نئی" ہے۔ لیکن چونکہ ہندی زبان و ادب کا مزاج اور ہندی عوام کا ادبی مذاق اس نئے پن کے لئے سازگار نہیں ہے اس لئے اس تحریک نے اس ادب کو جنم دیا ہے جو انوکھا بھی ہے اور عجیب بھی۔

جس طرح اردو میں لفظ 'ادب' کے ساتھ بے ادبی کی گئی ہے، اسی طرح ہندی میں لفظ واد کی مٹی پلید ہوئی ہے۔ اُردو میں اگر کلاسکی ادب، ترقی پسند ادب، تنزل پسند ادب، تعمیری ادب، انسانیت پسند ادب وغیرہ کی گرم بازاری ہے تو ہندی میں چھایا واد، پرگتی واد، مانوتا واد، پرتیک واد، پریوگ واد کا ایک کناٹ بلیس سجا نظر آتا ہے۔ انھیں ادبوں اور وادوں سے چڑھ کر

'منجیر' کی تمہید میں نرالا مرحوم نے لکھا تھا:۔

"ایک سے ایک بڑھ کر کرکش (سخت، شبد۔ (لفظ)، بھاو کا پتہ نہیں.... جو قلم کی نوک سے نکل گیا وہی بھاؤ۔ کلا؟ جس طرح بھی کہئے کلا ہے۔ دوسری طرف سے پرگتی شیل (ترقی پسند) آگئے گاندھی وادی جہاں ناک سکوڑ کر دیا، پریم، کرونا کا پاٹھ پڑھا رہے تھے، وہیں سماج وادی بنا ہچک کے ٹاٹ الٹنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ہندی ساہتیہ میں اور اس طرح کا بیہ ساہتیہ میں بھی اکال تانڈو شروع ہو گیا۔"

ادیوں اور وادوں کے اس سیلاب کو سمجھنا ضروری ہے کیونکہ یہی وہ پس منظر ہے جس میں نئی کویتا کا جنم ہوا ہے۔ اس پس منظر کو جاننا اس لئے بھی ضروری ہے کیونکہ خود کو ایلیٹ، ساتر اور راز را پانڈے کی ہندی کا رہن کا پی تسلیم کرنے میں یہ تحریک شرم محسوس کرتی ہے اور اس کے حامی، رسائل "لہنسر"، "نئی کویتا"، "نکش"، "کسوٹی" وغیرہ کو شاں ہیں کہ ہندوستانی سرزمین، اس کے سیاسی، اقتصادی، سماجی، تہذیبی ادبی اور لسانی تقاضوں سے اس تحریک کی ہم آہنگی ثابت ہو جائے تاکہ ہندی ادب کے گاؤں میں یہ یورپی اونٹ اجنبی نہ رہ جائے۔ اسی لئے اس تحریک کے حامیوں میں شعرا اور تخلیقی ادیبوں سے دوگنی تگنی تعداد نقادوں کی ہے۔ "نئی کویتا" کی تحریک اس نام سے ۱۹۵۳ء میں دوسرے تار سپتک کی اشاعت کے بعد شروع ہوتی ہے لیکن وادوں کا یہ طوفان ۳۲ء سے ہندی ادب پر منڈلاتا دکھائی پڑتا ہے، یہ وہ دور ہے جب چھایاواد انحطاط پذیر ہو چکا تھا اور کچھ نقادوں کی رائے میں "کل چھایا وادیوں کے مکان" وادوں کے طوفان میں اڑ گئے تھے۔ اس لئے اسی انیس بیس سال کی شاعری کا سرسری تجزیہ اس چھوٹے سے مضمون میں مناسب ہوگا:

چھایا واد کے بعد خاص طور پر چار رجحانات ہندی شاعری میں دکھائی پڑتے ہیں پہلے زمرے میں وہ ادیب پائے آتے ہیں جن میں ملکی اور غیر ملکی سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی تبدیلیوں کے اثرات نمایاں ہیں۔ یہ حقیقت نگاری کی طرف مائل ہیں، ان میں طبقاتی شعور کا مقصد لا سا

نقش پایا جاتا ہے۔ ان کا رجحان خارجیت پسندی کی طرف ہے، حالانکہ چھایا وادی رومانیت سے یہ بالکل پاک نہیں ہے۔ یہی وہ ادیب ہیں جنھوں نے ۱۹۳۶ء میں متحد ہوکر ہندی میں ترقی پسند ادب کی داغ بیل ڈالی۔ دوسرے زمرے میں وہ تخلیقی ادب آتا ہے جس میں ذاتی حسرت و یاس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ذہنی الجھن کو جگہ دی گئی ہے۔ ان میں بے اطمینانی ہے، ناامیدی ہے، شکوک ہیں۔ اس ادب میں داخلیت کو زیادہ دخل ہے، خارجیت سے یہ بچنا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی بچ نہیں پاتے۔ یہی ادیب ۱۹۴۲ء میں خود کو "پریوگ واد" کے پرچم کے نیچے متحد کرتے ہیں۔ اس کے بعد کے ہندی ادب کی تاریخ انھیں دو گروہوں کے ذہنی مہابھارت کی داستان ہے جسے پڑھ کر نتیجہ اخذ کرنا مشکل ہے کہ ان میں کورو کون ہے اور پانڈو کون ہے، حق کی طرف کون ہے اور باطل کی طرف کون ہے۔

تیسرے قسم کے ادب پارے وہ ہیں جو زندگی کی الجھنوں سے دور ہیں لیکن ان میں زندگی کا موہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ یہ زندگی کی رنگینی کی طرف زیادہ دھیان دیتے ہیں لیکن اس کے لئے کسی طرح کی جد و جہد سے گھبراتے ہیں۔ اپنے کلام میں رنگینی بھرنے کے موہ میں یہ اس قدر منہمک دکھائی پڑتے ہیں کہ کوئی بھی تفصیل چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اس طرح یہ فوٹوگرافک حقیقت نگار بن جاتے ہیں۔ ایسے ادیبوں کو اوپر کے دونوں گروہ فراریت پسند کہہ کر چڑھاتے ہیں۔ چوتھے زمرے میں وہ ادیب آتے ہیں جو ہلکی پھلکی چیزیں لکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے سامنے کوئی نصب العین نہیں تھا۔ یہ صرف عوام کی واہ واہ لوٹنا چاہتے تھے۔ ان کے کلام میں مقامی رنگ دکھائی پڑتا ہے، بول چال کی زبان اور بولیوں کی ترکیبوں کا استعمال ضرورت سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان کے شاہکار وہ ہیں جن میں نوجوانوں کے گھٹے جذبات کو تسکین ملتی ہے اور نتیجے میں رومانی رنگینیت بھرنے کی کوشش دکھائی پڑتی ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر گیت لکھنے کی طرف مائل تھے۔

تیسرے اور چوتھے زمرے کے ادیب کبھی ترقی پسندوں کے خیمے میں دکھائی پڑتے ہیں اور

کبھی پریوگ وادیوں کے۔ ان میں سے کچھ ایک ہی وقت میں دونوں طرف دکھائی پڑتے ہیں۔
۱۹۴۳ء میں پہلے تار سپتک کی اشاعت ہوتی ہے۔ اس ایک کتاب میں سات شعرا کا کلام اگیے جی نے جمع کیا تھا۔ اس میں تین رجحانات صاف دکھائی پڑتے ہیں۔ پہلا رجحان سماجی حقیقت نگاری کا ہے۔ سات میں سے پانچ ادیب ـــــ رام بلاس شرما، پربھاکر ماچوے بھارت بھوشن اگروال، گجانن مکتی بودھ اور نیمی چند جین اسی کے علمبردار ہیں۔ داخلیت کی علمبردار اگیے ہیں اور گرجا کمار ماتھر زندگی میں رنگینی بھرنے کی کوشش کرتے ہوئے تیسرے رجحان کے علمبردار دکھائی پڑتے ہیں۔ چوتھے زمرے کے ادیبوں کی تمام تر خصوصیات کو ان سب نے اپنالیا ہے۔ اسی لئے شاید اس کا کوئی نمائندہ تار سپتک میں نظر نہیں پڑتا۔ ان شعرا نے شاعری کے نئے موضوع تلاش کئے، ساتھ ہی ساتھ نئے نئے مشبہ بہ ڈھونڈ نکالے، یہ مشبہ بہ زندہ جاوید زندگی سے لئے گئے اور نیچر سے ادھار لی ہوئی پرانی علامتوں اور پرانے مشبہ بہ کو ان لوگوں نے ٹھکرا دیا۔ موجودہ زمانے کی حقیقی تصویر اتارنے کی کوشش کی گئی۔ بول چال کے محاورے، بولیوں کے ہلکے پھلکے لفظ، اردو انگریزی کے رائج الوقت الفاظ کو ہندی شاعری میں جگہ دی گئی اور کوشش کی گئی کہ ہندی کویتا کا مینڈک نہ رہ کر بہتے نیر کا روپ لے لے۔ ان لوگوں نے آزاد شاعری بھی کی اور معرا شاعری بھی رباعی اور غزل لکھنے کی کوشش کی، لوک گیتوں کی بحروں پر تجربے کئے ہیئت کے میدان میں سانیٹ، بیلڈ، مونو لاگ وغیرہ لکھنے کی کوشش بھی ان کے کلام میں نظر آتی ہے۔

پہلے تار سپتک کی بہورنگی میں یک رنگی جھلکتی ہے مختلف خیالات اور رجحانات کے حامل ہوتے ہوئے بھی یہ سب مجموعی طور پر ہندی شاعری کو مالا مال کرنے اور روایات کے بندھن سے آزاد کرنے کی دھن میں لگے دکھائی پڑتے ہیں۔ لیکن پہلے سپتک کی اشاعت کے بعد ہی یہ اتحاد عمل ختم ہو جاتا ہے اور کشور ادب کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ نئی ادبی کاوشوں کی مرکزیت ختم ہو جاتی ہے اور ہر طرف چھوٹی چھوٹی جاگیریں اور طرح طرح کے "واد" بکھرے دکھائی نظر پڑتی ہیں۔ ان میں دو اہم ہیں۔ ایک پر پر گتی واد (ترقی پسند) کا بورڈ لٹکا ہے اور دوسری پر پریوگ واد

(تجرباتی)، کا بورڈ آویزاں ہے۔ لیکن شخصیتوں کے علاوہ دونوں میں کوئی بنیادی فرق نظر نہیں آتا۔ صرف فرق اتنا ہے کہ پریوگ وادیوں نے صرف تجربات پر ہی دھیان دیا ہے اور مواد سخن کو بالکل غیر ضروری قرار دے دیا ہے جبکہ پرگتی وادی مواد سخن پر بھی زور دیتے ہیں۔

چونکہ کسی فلسفہ اور کسی نظریہ کے بغیر پریوگ واد بحیثیت تحریک کے زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لئے ۱۹۵۳ء میں اگیئے جی نے پریوگ واد کا بورڈ اتار کر اس دکان پر "نئی کویتا" کا بورڈ لٹکا دیا۔ نئی کویتا اصل میں اسی جدت پسندی کا ایک ایڈیشن ہے جس میں ضرورت کے تحت "صحت مند انسان کی تلاش" کا باب بڑھا دیا گیا ہے۔ اسی صحت مند انسان، ورسنک کا ٹھپہ لگا کر اگیئے جی نے دوسرے تار سپتک کی تالیف کی اور ساتھ ہی ساتھ اپنی کوششوں میں ایک نظریاتی پہلو پیدا کرنے کی جرأت کی۔ ان کا کہنا ہے کہ پرانی روایات اور قدروں سے ہم بیزار ہیں۔ ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں یقین کی منزل گم ہو چکی ہے، ہر چیز کی حقیقت اور ہر عینی حقیقت کا وجود مشکوک ہے۔ زندگی کے کسی پہلو میں بھی ٹھہراؤ نہیں ہے، جامعیت نہیں ہے، ایک بحرانی دور ہے۔ اس بحران میں فرد بحیثیت انسان کھو گیا ہے۔ اس شخص کو پہچاننا اور اسے خود کی اصلیت سے روشناس کرانا، اس میں جذبۂ انسانیت پیدا کرنا ہی "نئی کویتا" کا نصب العین ہے۔ چونکہ ترقی پسندوں نے کمیونزم کے میکانکی آدرش کے نیچے فرد کو دبا کر پامال کر ڈالا ہے اس لئے فرد کو اوپر اٹھانے، اس میں خودی پیدا کرنے، اس کی انا کو جگانے کی ضرورت کے تحت ہی نئی کویتا کا جنم ہوا۔

"نئی کویتا" کے حامی سماجی گندگیوں کے ساتھ ساتھ نفسیاتی گندگی سے بھی انسان کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن نفسیاتی حقیقت نگاری کے خبط میں ہوسناکی کے مناظر پیش کرنا ہی ان کا لائحہ عمل بن گیا ہے۔

اس فلسفیانہ موشگافی کے باوجود اپنی اصل شکل میں "نئی کویتا" پریوگ وادی ہے اس میں اب بھی نئی تشبیہوں، علامتوں، ترکیبوں، استعاروں اور امیج (IMAGE) کی تلاش ہے۔

اس میں وہی پرانی یاسیت، زندگی سے دور بھاگنے کی کوشش، جذبات کی گھٹن، خواہشات کا طوفان، درد دکھ، بے یقینی، شخصیت پرستی، خیال اور بیان کی گنجلک موجود ہے۔ اس شاعری میں طنز ہے۔ اس طنز میں مزاح نہیں ہے بلکہ جھلاہٹ ہے اور یہ تلوار کی دھار بن کر پرانی قدروں پر وار کرتا ہے۔ اصل میں طنز طنز نہ رہ کر ان شاعروں کے لئے زندگی کو دیکھنے اور پرکھنے کا چشمہ بن گیا ہے۔ اپنی جھنجلاہٹ میں یہ مجذوب کی طرح بڑبڑاتے ہیں۔ چونکہ یہ حقیقت نگار بھی بنتے ہیں اس لئے مجذوب کی بڑ کو جوں کا توں لکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے ایسی بڑ میں گالیاں بھی ہوں گی، بھونڈے اور غیر شاعرانہ الفاظ بھی ہوں گے، خیالات میں بھی بھونڈا پن ہوگا، جذبات بھی اکثر حسن سے عاری ہوں گے۔ ان اوصاف سے نئی کویتا بھری پڑی ہے۔ اسی لئے ان شعراء کے کلام میں شاعری کی زبان، اشاریت اور نزاکت ناپید ہے۔

نئی نئی علامتوں، دور از کار تصورات اور امیج کا استعمال ہی ان شعراء کی نمایاں خصوصیت ہے۔ اس چھوٹے سے مضمون میں ان کا سرسری جائزہ لینے کی کوشش ہی کی جا سکتی ہے۔

نئی کویتا کی زبان

مجذوب کی بڑ بول چال کی زبان ہی میں ہو سکتی ہے۔ اس لئے بول چال کی بھاشا پر نئی کویتا کا بے حد زور ہے۔ دوسرے سپتک میں بھوانی پرشاد مشر نے اس پر کافی زور دیا ہے:

جس طرح ہم بولتے ہیں اُس طرح تو لکھ،
اور اس کے بعد بھی ہم سے بڑا تو دِکھ

دوسرے تار سپتک میں دو ایک پرانے پریوگ وادی ہیں اور زیادہ تر نئی نسل کے شاعر ہیں۔ ان میں زبان کا ارتقاصات دکھائی پڑتا ہے۔ یہ شاعر شاعری کی زبان کو زیادہ سے زیادہ بول چال کی زبان کے نزدیک لانے میں کوشاں ہیں۔ ان کی زبان سیدھی سادی ہے اور روزمرہ استعمال میں آنے والی چیزوں سے علامتیں، تشبیہیں، استعارے اور تراکیب استعمال کی گئی ہیں۔ نیچے کی مثالیں اسی حقیقت کا مرقع پیش کرتی ہیں :-

جی ہاں حضور میں گیت بیچتا ہوں۔
میں طرح طرح کے
قسم قسم کے
گیت بیچتا ہوں
جو بہت ڈھیر لگ گیا ہٹاتا ہوں
گاہک کی مرضی ... اچھا، جاتا ہوں
میں بالکل انتم اور دکھاتا ہوں
یا بھیتر جا کر پوچھ آئے آپ،

بھوانی مشر

موٹے اوٹھوں میں چوڑ ٹے چل رہا
آسمان کی چھاتی میں انجن کا سارا شور بھر رہا
جانے کس راکشس کی آنکھوں جیسی لال ہری لائیٹس چمک رہیں
سگنل کھمبوں کی

نرلش مہتا

ہر گھر میں صرف چراغ نہیں، چولھے سلگے
لیکن پھر بھی
رہ رہ کر دھندھواتا ہے
چھپر سے چھنتا ہوا دھواں
ہرا اور

....

دفتر کے تھکے ہوئے کلرکوں کی ڈانٹ ڈپٹ

بچوں کی تیخ پکاریں
پتنی کی بھن بھن
دھرم ویر بھارتی

نئی کویتا کا شاعر اصل میں کسی چیز پر یقین نہیں رکھتا۔ خود اعتمادی کھو چکا ہے اگیہ جی کا کہنا ہے کہ یہ زمانہ ہی عدم یقین کا ہے اور اگر شاعر حقیقت پسند ہے تو اس کو متلون مزاج بھی ہونا پڑے گا۔ اسی کی ایک اچھی مثال دھرم ویر بھارتی کے کلام سے ملاحظہ کیجئے۔

ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو، ٹھہرو ہم آتے ہیں
ہم نئی چیتنا کے بڑھتے اَوِرام چرن
ہم مٹی کی آپراجت گتی مے سنتانیں
ہم ابھی شاپوں سے مکت کریں گے کوی کامن

لیکن شاعر کو ذہنی آزادی دلانے والے یہی مہارتھی اسی نظم میں لکھتے ہیں :

ہم سب کے دامن پر داغ
ہم سب کی آتما میں جھوٹ
ہم سب کے ماتھے پر شرم
ہم سب کے ہاتھوں ٹوٹی تلواروں کی موٹھ
دو ہم کو پھر جھوٹے یدھ
دو ہم کو پھر جھوٹے دھیئے
ہاریں گے پھر یہ ہے طے

نئی کویتا کے شاعر نے لوک گیتوں کی دھنوں، لفظوں اور محاوروں کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ پنتی دھر، نریش کمار مہتا، ڈاکٹر دو ند کھرمر، رام ناتھ مشرا ور مہت رھٹنا گر نے اس سلسلے میں کافی کامیابی حاصل کی ہے، اس کی بہترین مثال یہ گیت ہے :

بدچھپا ڈوسے

جھینگر و بولے
بن بن جھنکے رے
بن بن جھنکے رے۔
نجریا پھولن گمکے رے
پون جھکورے
برچھن جھورے
موہن ہرست رے
نگریا کنجن برت رے

ونشی دھر نے بھی لوک گیت کو اپنایا ہے۔

نین کھلے
بھور بھئی
نیندیا نے گیل گہی
بگیا میں ہنسن لگی
کلی نئی
بھور بھئی

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نئی کویتا کے شاعر چھایا وادی زبان اور ترا کیب سے آزاد ہو چکے ہیں اور سنسکرت کے موٹے موٹے لفظوں سے انھیں چھٹکارا مل گیا ہے۔ اس میدان میں انھوں نے صرف کوشش کی ہے۔ یہ کوشش قابل ستائش ہے کیونکہ ایسی ہی کوششیں ہندی کو وہ شکل دے سکتی ہیں جس سے وہ قومی زبان کے درجے پر فائز ہو سکے۔

نئی کویتا والوں کا کہنا ہے کہ ہم کہتے کم ہیں اور اشارے کنائے میں سمجھاتے زیادہ ہیں۔ ان کی زبان صرف تشبیہ اور علامتوں کے ذریعہ بولتی ہے۔ ان شعرا نے بٹی پٹائی علامتوں اور ترکیبوں

سے نئی کویتا کو آزاد کرانا چاہا ہے۔ انھیں نئے پن کی تلاش ہے۔ اس تلاش جنوں میں انھوں نے خود کو مضحکہ خیز بھی بنا لیا ہے۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارے۔ ان کا کہنا ہے کہ کچھ دنوں میں ہماری یہی نئی علامتیں اور تشبیہ نکھر کر خوبصورت خیالات، تصورات اور نازک جذبات کے اظہار کا وسیلہ بن جائیں گی۔ پرانی تشبیہوں علامتوں اور تشبیہ کے خلاف اجنت کمار کا یہ محاکمہ قابلِ غور ہے:

چاندنی چندن سدرش ہم کیوں لکھیں۔
مکھ ہمیں کملوں سریکھے کیوں دکھیں
ہم لکھیں گے چاندنی اس روپئے سی ہے کہ جس میں
چمک ہے پر کھنک غائب ہے
ہم کہیں گے زور سے مکھ گھر عجائب ہے

(یہاں پردیپ کے اتول زندہ اور مُردہ بھاؤ رہتے ہیں)

علامتیں

علامتوں کو نئی کویتا نے اپنے گنجلک خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے لیکن علامتوں کی تلاش میں ہندی شاعری کی موسیقیت، اس کے مزاج و روایت، اس کے مذاقِ سلیم کی طرف سے آنکھ بند کر کے گھوڑے دوڑائے گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان شعراء کو کلام کے نسخے کے ساتھ ترکیبِ استعمال کی پوری تفصیل بھی مہیا کرنی پڑتی ہے۔ چند علامتیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ **رتھ کا ٹوٹا پہیا:**۔ زندگی کا رتھ دو پہیوں سے چلتا ہے ـــ عقل اور دل سے لیکن اگر دل پر مادیت چھا جائے تو انسانی جذبات اور احساسات عقل کے بوجھ کے نیچے دب جائیں گے۔ اس طرح زندگی کا ایک پہیہ ٹوٹ جائے گا۔ اس لئے رتھ کا ٹوٹا پہیا اس انسان کی علامت ہے جو انسانی جذبات اور احساسات سے عاری ہو۔

۲۔ **ندی:**۔ چونکہ ندی ہمیشہ بہتی رہتی ہے اور سماج بھی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا

اس تعلق سے ندی سماج کی علامت کے طور پر تسلیم کی گئی ہے۔

۳۔ ندی کا دیپ :۔ طوفانی ندی میں جیسے ریت کا کوئی ٹاپو ڈوبنے والوں کے لئے سہارا ہوتا ہے اسی طرح زندگی کے لئے شاعر اور فنکار سہارا ہیں۔ اس لئے وہ ندی کا دویپ ہیں۔

۴۔ کھنڈر :۔ پرانی روایتوں اور قدروں کی علامت ہے۔

۵ کمزور ہڈیاں :۔ بھوکا اور دکھی انسان

۶۔ تمسر (اندھیرا) : پرانی روایتوں کی علامت

۷۔ نشا (رات) : روایت پرستی کی زندگی۔

۸۔ آلوک ریکھا، اوشا :۔ نئے احساسات کی علامت۔

۹۔ بھگیرت :فنکار

۱۰۔ دھار :۔ زندگی

۱۱۔ پوکھر :۔ زندگی میں جمود

۱۲۔ لو۔ بونڈر آندھیاں :۔ بحرانی دور میں نئی اور پرانی قدروں کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے خیالات و احساسات۔

۱۳۔ شیام گھن :۔ جواہر لال نہرو۔

۱۴۔ سنہرے سپنے :۔ خوب صورت تصورات

یہ وہ جانے پہچانے الفاظ ہیں جن کے خاص معنی اور مطالب سینکڑوں برسوں سے ہمارے دماغ میں موجود تھے انھیں الفاظ میں نئے معنی پر دنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب تک پڑھنے والا ان نئے معنی و مطالب سے مانوس نہ ہو جائے وہ اس کو سمجھنے سے قاصر رہے گا۔

امیج

تیسرے تار سپتک میں سرویشور سکسینہ کی نظم میں شام کی نئی امیج دیکھئے :۔

سلما ستاروں کے کام والی
نیلی مخمل کا خول چڑھا
امبر کا سندورا
الٹی دھرتی پر ندیوں کے جل میں
گر ترو کے شکھروں سے
ڈھرڈھر کر
سب سیندور پھیل گیا۔

دوسرے شاعر کی شام کی امیج سے بھی محظوظ ہولیجئے :-

ایک شوبیت بھالو، ہو۔ پنجوں پر اپنے کھڑا
برف پر کھڑا ہو
تاڑ سے بھی بڑا ہو
اتنے میں جلدی سے کوئی شیش کاٹ دے
لہو تب اچھلا ہو
اوپر سے نیچے تک بھالو تو لال ہو،
دھرتی بھی لال ہو، امبر بھی لال ہو۔

بے چارے سورج دیوتا کی قدر و منزلت بھی ملاحظہ کرلیجئے :-

روز صبح پورب سے آتا ہے،
میرے لئے گرم چائے کیتلی میں لاتا ہے
مجھ کو پلاتا ہے
روز شام پچھم کو جاتا ہے
وہ تو ایک بیرا ہے۔

شری کانت ورما نے ایک جگہ لکھا ہے :-

"آنکھوں میں کالے پرشن بھرے بیٹھی گم سم"

یہ گم سم بیٹھنے والی ہماری موجودہ تہذیب ہے۔ لیکن "کالے پرشن" کا مطلب سمجھنا آسان کام نہیں ہے۔ "کالے پرشن" کا مطلب ہے فلسفہ حیات اور نظریات کی بنیاد پر زندگی کے مسائل کے بے سود اور واہیات حل۔

نئی کویتا کا شاعر حسن کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ حسن استعجاب کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ انسان استعجاب کے پیچھے سرگرداں ہے۔ جہاں استعجاب ہے وہیں انسان کے لئے حسن ہے کشش ہے۔ حسن پرست، شعراء اور سخن فہموں پر طنز کرتے ہوئے سرویشور ورما نے حسن کی حقیقت سے روشناس کرایا ہے :-

" اپنے اس کٹیا پارٹی بوڑھے کے
پیروں میں شہتیر باندھ کر
چوراہے پر کھڑا کردو۔
پھر چپ چاپ ڈھول بجاتے جاؤ۔
شاید پیٹ پل جائے
دُنیا وِدَ شتا نہیں کو تو ہل خریدتی ہے۔

غرضیکہ نئی کویتا ہندی ادب کے گاؤں میں وہ اونٹ ہے جسے صرف لال بجھکڑ ہی بوجھ سکتے ہیں۔ اس کی طرز فکر، اظہار، حسن بیان، تراکیب، تشبیہات، استعارات، علامتیں سب ہی غیر مانوس ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ جن حالات اور ذہنی اور مادی تبدیلیوں کو اس شاعری میں جگہ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ سب ہماری عوامی زندگی سے ہی نہیں بلکہ ابھی تک خواص کی زندگی سے بھی کوسوں دور ہیں۔ اسی لئے نئی کویتا والوں کی تمام تر کوششیں بیل گاڑی میں راکٹ جوت کر چلانے کا عزم ہی ثابت ہوئی ہیں۔

مختلف مذہبوں کی پارلیمنٹ

جناب دھرم سروپ

امریکی بہنو اور بھائیو![1]

جس گرم جوشی اور محبت سے آپ نے ہم سب کا استقبال کیا ہے، اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مجھے جو انتہائی خوشی محسوس ہو رہی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔ میں دنیا کے قدیم ترین سنیاسیوں کی جماعت کی طرف سے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں اس دیش کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جہاں مذہب کا جنم ہوا۔ اور میں وہاں کے کروڑوں ہندوؤں کی طرف سے بھی آپ کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں ان مقررین کا بھی ممنون ہوں، جنھوں نے مجھ سے پہلے اپنی تقریروں میں ہم مشرقی نمائندوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب اس کانفرنس سے اپنے اپنے دور دراز ملکوں میں صلح و آشتی اور رواداری کا پیغام لے کر جائیں گے۔ اس سلسلہ میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں ایک ایسے مذہب کی نمائندگی کر رہا ہوں، جس نے نہ صرف تمام دنیا کو صلح و آشتی کا سبق دیا ہے، بلکہ ہمیشہ دنیا کے سب مذاہب کو اصولاً اور عملاً اپنایا ہے۔ مجھے اس بات کا فخر ہے کہ میں اس قوم کا فرد ہوں جس نے ہر مذہب و ملت کے ستم زدوں کو اپنے ہاں جگہ دی ہے۔ میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ جب روم کے مطلق العنان حکمرانوں نے عزرائیل قوم کی متبرک عبادت گاہوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور جب اس قدیم قوم کی تہذیب کے علمبردار روم کے مظالم سے تنگ آکر ہندوستان

---

[1] شکاگو میں خطبۂ استقبالیہ کا جواب بتاریخ ۱۱ ستمبر ۱۸۹۳ء

آئے تو ہم نے انہیں گلے لگا کر اپنے یہاں جگہ دی۔ یہ ہمارا ہی مذہب اور ہماری ہی قوم تھی جس نے زرتشت کے خود دار پیروؤں کو اس طرح اپنایا کہ وہ آج تک اپنے مذہب اور اپنی روایات پر چلتے ہوئے ہماری قوم کا ایک شاندار جزو بن گئے ہیں۔ دوسروں کو اپنا نا تو ہماری گھٹی میں پڑا ہے۔ میرے بھائیو! میں آپ کے سامنے ایک پرارتھنا کا مختصر سا حصہ پیش کرتا ہوں جسے میں بچپن سال سے دہراتا آیا ہوں اور جسے میری طرح میرے کروڑوں ہم مذہب ہر روز دہراتے ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ میرا مذہب کیا ہے۔

"میرے خدا جس طرح مختلف ندیاں اپنے اپنے منبع سے نکل کر مختلف مقامات سے گزرتی ہوئی آخر کار سمندروں میں آکر گھل مل جاتی ہیں، اسی طرح وہ تمام راستے جو مختلف مذہبوں اور قوموں کے لوگ اپنی اپنی پسند یا روایت کے مطابق اختیار کر لیتے ہیں۔ سب آخر تجھ ہی تک پہنچ جاتے ہیں، خواہ وہ دیکھنے میں کتنے ہی عجیب غریب اور الٹے سیدھے نظر آئیں۔"

ہماری یہ معتبر کانفرنس خود اس عالم گیر اصول کی تصدیق کرتی ہے، جس کا اعلان ہزاروں برس پہلے گیتا میں ان الفاظ میں کیا گیا تھا:

"جو کوئی بھی میری شرن میں آتا ہے، میں یقیناً اس تک پہنچتا ہوں۔ تم جس صورت میں مجھے تلاش کروگے میں اسی صورت میں تمہیں ملوں گا۔ سب انسان مختلف رستوں سے مجھ تک آنے میں کوشاں ہیں اور آخر کار پہنچیں گے، کیونکہ میں ہی سب رستوں کی منزل ہوں۔"

جماعت بندی، کینہ پروری، بغض وعناد، مذہبی تعصب نے دنیا پر صدیوں سے

لہ میانِ کعبہ و بُت خانہ ہیچ فرقے نیست ۔۔۔ بہر طرف کہ نظر می کنی برابر اوست

تسلط جما رکھا ہے۔ ان کی بدولت بار بار فساد ہوئے، جنگ وجدال تک نوبت آئی، انسان کے خون سے زمین لال ہوئی، کئی قومیں تباہ ہو گئیں اور ان کی تہذیب کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ اگر ان شیطانی طاقتوں نے ہماری سوسائٹی پر غلبہ نہ پایا ہوتا تو ہماری تہذیب اور ثقافت کئی اور منزلیں طے کر چکی ہوتی، لیکن ہمیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ ان شیطانی طاقتوں کے مٹنے کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے پوری امید ہے، بلکہ یقین ہے کہ گھنٹوں کی جس میٹھی سریلی آواز سے اس کانفرنس کا آغاز ہوا ہے وہی آواز ایک نعرہ بن کر تعصب اور کینہ پروری کی موت کا اعلان کرے گی، خواہ وہ تعصب تلوار کے زور پر قائم ہو یا قلم کے بل بوتے پر۔ اگر ہم سب یہ سمجھ لیں کہ ہم ایک ہی منزل کی طرف گامزن ہیں تو سماجی اور سیاسی نظام میں تعصب کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی، تمام تفرقے مٹ جاتے ہیں، بغض وعناد ختم ہو جاتا ہے اور ہم سب ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے ہیں۔

ابھی ابھی[۵۱] آپ نے جو بلیغ اور شاندار تقریر سنی اس میں معزز مقرر نے ہم سے پر زور اپیل کرتے ہوئے کہا "آؤ ہم ایک دوسرے کو برا بھلا کہنا چھوڑ دیں۔ میں یہ کہوں گا کہ آؤ ہم سوچیں کہ ہمارے آپس کے تفرقات پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں۔ ان کی اصل کیا ہے؟ ان سب کا باعث ہماری لاعلمی اور جہالت ہے۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی سناتا ہوں، جس سے میری بات واضح ہو جائے گی۔ ایک تھا کنویں کا مینڈک، وہ جنم سے وہیں رہتا آیا تھا۔ ایک دن کی بات ہے کہ ایک اور مینڈک وہاں آ نکلا۔ یہ مینڈک سمندر کے کنارے رہتا تھا۔ کنویں کے مینڈک نے پوچھا، بھئی! کہاں سے آنا ہوا۔ اس نے جواب دیا میں سمندر سے آیا ہوں۔ کنویں کے مینڈک نے کنویں کے ایک سرے

---

[۵۱] سوامی جی نے یہ چھوٹی سی تقریر ۱۵ ستمبر ۱۸۹۳ء کو کی، لیکن چونکہ اس کا موضوع وہی ہے جو ان کی پہلی تقریر کا تھا، اس لئے میں نے اسے پہلی تقریر سے ملا دیا ہے۔

سے دوسرے تک چھلانگ لگائی اور کہا سمندر کیا میرے اس کنویں سے بڑا ہے؟ سمندر کا مینڈک مسکرا کر بولا ۔ بھئی کہاں سمندر اور کہاں تمھارا یہ کنواں! ان دونوں میں مقابلہ ہو ہی کیا سکتا ہے ۔کنویں کے مینڈک نے ایک اور چھلانگ لگائی اور کہا اچھا تو کیا تمھارا سمندر اتنا بڑا ہے؟ سمندر کے مینڈک نے کہا ۔ ارے بھائی! تم بھی کیا بے عقلی کی بات کرتے ہو ۔ میں کہہ تو رہا ہوں کہ سمندر اور کنویں میں کوئی مقابلہ ہی نہیں ۔کنویں کا مینڈک اکڑ کر بولا ۔ تو تم جھوٹ کہتے ہو، چلو یہاں سے چلتے بنو، میرے اس کنویں سے اندکوئی چیز بڑی نہیں ہو سکتی ۔

غور سے دیکھا جائے تو ہم سب کی یہی شکل ہے ۔ ہم سب اپنے اپنے کنویں کی مینڈک ہیں ۔ میں ہندو ہوں، میں اپنے کنویں میں بیٹھ کر سمجھ لیتا ہوں کہ تمام کائنات میری اسی چھوٹی سی دنیا میں بسی ہے، اسی طرح عیسائی اور مسلمان بھی اپنے اپنے کنویں پر ہی تمام عالم کا دارو مدار سمجھنے لگتے ہیں ۔ اب آپ خود ہی بتایئے کہ ہمارے تفرقات کی بنیاد لاعلمی اور جہالت نہیں تو اور کیا ہے[1]

میرے امریکی بھائیو! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہم سب کو یکجا کرکے عالمی یک جہتی کی طرف ایک زبردست قدم اٹھایا ہے اور ان دیواروں کو جو ہمارے درمیان حائل ہیں، مٹانے کی ایک قابلِ قدر کوشش کی ہے ۔ میری دعا ہے کہ خدائے تعالیٰ آپ کی اس کوشش کو کامیاب بنائے ۔

(رام کرشنا مشن کی طرف سے ایک کتاب زیر ترتیب ہے یہ مضمون اسی سے شکریہ کے ساتھ لیا گیا)

---

[1] جنگِ ہفتاد و دو ملت ہمہ را عذر بنہ
چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

سونا ـــــ ایک قدر بیجا

جناب عبدالرشید، ڈائرکٹر جامعہ ریسرچ سنٹر

سونا بھی موجودہ سماج میں انسان کی قدر و منزلت گھٹاتا بڑھاتا ہے۔ خاں صاحب نے اپنی لڑکی کی شادی میں ۲۰ تولے سونا دیا۔ شیروانی صاحب کی بہو تو سونے سے لدی ہوئی ہے۔ جب بڑی بوڑھیاں بیٹھتی ہیں اور کسی لڑکی کی شادی کا ذکر چھڑتا ہے تو پہلا سوال یہی اٹھتا ہے کہ فلاں کی بہو یا بیٹی کو کتنے زیور ملے۔ چاندی کے نہیں ۱۴ کیرٹ کے نہیں بلکہ اصلی سونے کے یا گنی گولڈ کے۔ ظاہر ہے یہ دینے والے کی حیثیت اور ہمت پر مبنی ہے۔ جس کے پاس زیادہ سونا ہے یا زیادہ سونا حاصل کرنے کی قدرت رکھتا ہے وہ سماج میں بہتر جگہ حاصل کرنے کا مستحق بھی ہوتا ہے۔ واقعی آدمی آدمی کی قدر نہیں کرتا بلکہ سونے کی قدر کرتا ہے۔

سونے کو یہ قدر اسی وقت سے ہے جب سے انسان نے اسے زمین کی گہرائیوں سے کھود کر نکالنا سیکھا۔ رفتہ رفتہ تہذیب کی ترقی کے ساتھ سونے کی حیثیت بھی بڑھتی گئی۔ جاگیردارانہ دور میں اور بڑھ گئی لیکن صنعتی دور میں اس کی قسمت نے پلٹا کھایا۔ صنعتی انقلاب سے سماجی زندگی میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ صنعتی ممالک کے باشندوں کی زندگی کچھ سے کچھ ہو گئی۔ عادتیں بدلیں۔ رہن سہن کے طور طریقے بدلے۔ انفرادی ضروریات کے اعتبار سے سونے کی مانگ میں کمی واقع ہوئی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر میں سونے کی قدر رفتہ رفتہ کم ہو گئی، لیکن اسی کے ساتھ کرنسی اور صنعت کی اہمیت کے اعتبار سے اس کی مانگ میں اضافہ بھی ہوا۔

جاگیردارانہ دور سے ہم کو بہت سی قدریں ورثے میں ملی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو ایسی بھی ہیں

جو بدلتے ہوئے سماج کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتیں۔ بلکہ ترقی کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں۔ سونے سے بیجا محبت اقتصادی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ چونکہ ایک لمبے سفر کو کم سے کم مدت میں طے کرنا ہے اس لئے چھوٹی بڑی تمام رکاوٹوں کو بہرصورت دور کرنا ہے چمن بندی کی راہ میں اگر ایک نایاب پودا بھی حارج ہوتا ہے تو اسے کاٹ کر الگ کر دینے کے علاوہ اور چارہ ہی کیا ہے۔ بس اسی روشنی میں سونے سے متعلق حالیہ اقدامات کا جائزہ لینا چاہیئے۔

مقاصد

وزیر خزانہ نے حال ہی میں سونے پر کنٹرول حاصل کرنے کے لئے قاعدے قانون (GOLD CONTROL RULES) نافذ کئے ہیں۔ ان اقدامات سے حکومت کی سوجھ بوجھ ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب حکومت سونے کو یوں ہی بیکار نہیں پڑے رہنے دینا چاہتی، بلکہ تجوریوں اور بنکوں کی کال کوٹھری سے نکال کر باہر لانا چاہتی ہے اور اسے دفاعی کاموں پر خرچ کرنا چاہتی ہے اور اس سے بیرونی زرِ تبادلہ میں سہولت حاصل کرنا چاہتی ہے۔ ہندوستان میں کتنا سونا ہوگا؟ اس کا صحیح اندازہ لگانا تو مشکل ہے۔ پھر بھی خیال ہے کہ ملک میں چھ ارب روپے کا سونا ضرور ہوگا۔ اس میں سے تقریباً ۸ فیصدی زیورات کی شکل میں ہے۔ مختلف طریقوں سے جائزہ لینے کے بعد خیال ہے کہ کچھ نہیں تو دو یا تین سو کروڑ روپے کا سونا سلوں کی شکل میں ہوگا۔ اس میں خاص کر وہ سونا بھی شامل ہے جو مندروں میں جمع ہے اور جو چور بازار میں خریدا جاتا ہے۔

فی الحال گولڈ کنٹرول کا مقصد محدود رکھا گیا ہے۔ ان قاعدوں کی رو سے نہ تو زیورات کا بیچنا ممنوع ہے اور نہ زیورات رکھنے پر پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ لیکن آئندہ جو زیورات بنیں گے وہ ۱۴ کیرٹ سے زائد خالص سونے کے نہیں ہوں گے۔ اس پر سختی سے عمل کیا جائے گا۔ جن لوگوں کے پاس خالص سونے کے زیورات موجود تھے وہ

۹ فروری ۶۳ تک فروخت کئے جا سکتے تھے۔

سونے پر اور سونے کی تجارت پر جب پابندی لگائی گئی تو اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ دراصل یہ کارروائی بہت پہلے ہونی چاہیئے تھی۔ اور جبکہ اس طرح کی کئی مثالیں بھی موجود تھیں۔ انگلستان میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوتے ہی حکومت نے ایک ایکٹ (DEFENCE OF THE REALM ACT) کے تحت سونے کے تمام اسٹاک پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسی طرح دوسری جنگ عظیم کے موقع پر بھی ایسا ہی کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ تمام بیرونی اثاثے پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔

جو سونا چوری چھپے ملک میں آتا ہے اس کی روک تھام اور اس پر قابو حاصل کرنا اس قانون کا بنیادی مقصد ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ہر سال قریب ۵۰ کروڑ روپے محض اسی غیر قانونی درآمد کی وجہ سے باہر چلے جاتے ہیں۔ حکومت کو یہ رقم (FOREIGN EXCHANGE) کی شکل میں ادا کرنی پڑتی ہے۔ اقتصادی تعمیر کی یہ پابندی عائد کرتی ہے کہ کم سے کم غیر ضروری سامان باہر سے درآمد کیا جائے تاکہ قومی سرمایہ بچے اور وہ ان ضروری چیزوں پر صرف ہو جو ہماری صنعتی ترقی کے لئے بے حد ضروری ہیں جیسے مشینیں وغیرہ۔ جو اس سے انحراف کرتا ہے۔ وہ ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان قاعدوں کا ردعمل سماج پر مختلف پہلوؤں سے ہوگا۔ اگر سختی سے قاعدوں کو عمل میں لایا گیا تو رفتہ رفتہ لوگوں کی نظروں میں سونے کی قدر کم ہو جائے گی اور اس کی مانگ میں بھی کچھ نہ کچھ کمی واقع ہو گی لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے طویل مدت کی ضرورت ہے۔ کیوں؟ ہندوستان پر جاگیردارانہ نظام کا سایہ ابھی باقی ہے۔ اب بھی ملک کی بیشتر آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے۔ رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ شادی بیاہ کے علاوہ اور موقعوں پر بھی سونے کی ضرورت پڑتی ہے مثلاً پیدائش۔ سالگرہ اور مذہبی تقریبیں وغیرہ۔ اچھا تو یہ تھا کہ ان رسموں میں سونے کا استعمال

ہی ترک کر دیا جاتا لیکن عملی طور پر فی الحال یہ ممکن نہیں ہے ۔ اس لئے کوشش یہ کرنی چاہیئے
کو سونے کے استعمال میں زیادہ سے زیادہ کمی برتی جائے۔ چنانچہ اب زیورات تو بنیں گے لیکن
قانونی طور پر ان میں اصلی سونے کی مقدار بہت کم ہو گی اس طرح سونے کے مجموعی استعمال میں
کمی پیدا ہو جائے گی ۔

دشواریاں

یہ تو ٹھیک ہے کہ ۱۴ کیرٹ سے زیادہ خالص سونا زیورات کے لئے استعمال نہ کیا
جائے ۔ لیکن اس پر عمل کیسے ہو ؟ یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ زیورات میں اصلی
سونے کی مقدار کا پتہ کیسے لگایا جائے ؟ ابھی تو وہی پتھر پر گھس کر پتہ لگانے کا طریقہ رائج
ہے ۔ جوہری نے زیور کو کسوٹی پر گھسا اور نشانات کی چمک سے اندازہ لگالیا کہ سونا کھرا ہے
یا کھوٹا ۔ یہ طریقہ مقبول عام تو ہے لیکن کلیتاً ذاتی تجربے پر مبنی ہے ۔ قاعدے قانون کو عمل میں
لانے کے لئے شخصی پرکھ سے کام نہیں چل سکتا ۔ ہاں اگر سونے کے بیوپاری خود ہی زیورات وغیرہ
پر ایک مخصوص مہر لگانے کا طریقہ رائج کر دیں تو مسئلہ حل ہو جائے گا ۔ جیسا کہ انگلستان کے سناروں
نے اپنی طرف سے سونے یا چاندی کی چیز پر مہر لگانے کا اصول رائج کیا تھا اس مہر کو "ہال مارک"
(HALL MARK) کہتے ہیں ۔ کچھ اسی طرح کا طریقہ ہم کو بھی اختیار کرنا پڑے گا ۔ یہی
مسئلہ سونے کے سلوں یا ڈلوں کے ساتھ بھی پیدا ہوتا ہے ۔ خریدتے وقت کیسے معلوم کیا جائے
کہ سونا ۱۴ کیرٹ کا ہے یا نہیں ۔ ان دشواریوں کے پیش نظر فی الحال لیبسن رکھنی والی
بھٹیوں کو خالص ۱۴ کیرٹ کا سونا بنانے کی اجازت دی گئی ہے ۔

ایک سوال اور ہے ، کیا حالیہ قاعدے قانون سے سونے کی غیر قانونی درآمد واقعی رک
جائے گی ؟ خلیج فارس ، مکاؤ ۔ ہانگ کانگ جیسی جگہوں سے بڑی مقدار میں سونا آتا ہے ۔ کیا
ان جگہوں پر ایسے سناروں کی کمی ہے جو اصلی سونے کو خالص ۱۴ کیرٹ والے زیورات میں تبدیل
نہیں کر سکتے ۔ پہلے اصلی سونا مختلف شکلوں میں طرح طرح کے جال بٹوں سے لایا جاتا تھا ۔

اب زیورات آئیں گے کسی نہ کسی شکل میں غیر قانونی درآمد کا سلسلہ جاری رہنے کا امکان ختم نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خود ہندوستان میں ایسے سناروں کی کمی نہیں ہے جو "نافاناً" غیر قانونی سونے کو زیور کی شکل نہ دے سکیں۔ ہم نے جب بے ایمانی اور چور بازاری اپنی فطرت ثانیہ بنا لی ہے تو کتنے ہی سخت قاعدے قانون کیوں نہ نافذ کر دئے جائیں۔ مکمل کامیابی دشوار ہے۔ عوام دشمن عناصر بے ایمانی کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال ہی لیتے ہیں۔ لیکن دشواریوں کے باوجود سونے کی غیر قانونی درآمد میں کمی پیدا ہو جائے گی اس کے آثار ابھی سے نظر آنے لگے ہیں۔

خامیاں

نئے قانون میں بہت سی اچھائیوں کے ساتھ کچھ خامیاں بھی ہیں۔ ایک خاص خامی یہ ہے کہ سونے کے زیورات گولڈ کنٹرول کی زد سے آزاد ہیں۔ ہر شخص کو اختیار ہے کہ جتنے زیور چاہے رکھے۔ ہاں ۹ فروری ۱۹۶۳ء کے بعد اصلی سونے کے زیور خریدنے کا اختیار نہیں رہ گیا ہے۔ لیکن اس بات کی تصدیق کیسے ہو کہ ۹ فروری کے بعد اصلی سونے کے زیورات میں اضافہ نہیں ہوا ہے ایسی حالت میں چوری چھپے اصلی سونا زیورات کی شکل میں درآمد ہوتا رہے گا اور بکتا رہے گا۔ جوہری اپنی دوکانوں کے شوکیس میں رکھنے کے بجائے غیر دکانداروں کے ذریعے فروخت کروائیں گے۔ خرید و فروخت بازار میں نہ سہی بازار سے ہٹ کر ہوگی۔ دن میں نہ سہی رات کی تاریکیوں میں ہوگی۔ اگر کوئی خریدار پکڑا بھی لیا گیا تو وہ قانون کی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا وہ بہت آسانی سے کہہ سکتا ہے کہ یہ تو ۹ فروری سے پہلے کا مال ہے۔

اس لئے گولڈ کنٹرول کو زیادہ موثر بنانے کے لئے کیوں نہ زیورات رکھنے والوں سے ان کے اسٹاک کا اعلان کروایا جائے۔ ایک حد مقرر کر دی جائے۔ (مان لیجئے، ۱۰ تولے) اگر کسی کے پاس اس حد سے زائد ہو تو وہ اپنے اسٹاک کا اعلان کرے۔ ظاہر ہے اس قانون کے جاری ہونے کے بعد مارے ڈر کے عورتیں شادیوں وغیرہ میں زیورات پہن کر جانے سے گریز کریں گی۔ اس طرح زیور حاصل کرنے کا ایک اہم مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ جب زیور پہنے

نہیں جا سکتے تو رکھنے سے کیا فائدہ نفسیاتی طور پر لوگوں کی نظروں میں سونے کی روایتی چمک بھی مدہم پڑ جائے گی۔ اس کی قدر گھٹ جائے گی اور اخیر میں سونے کی مانگ میں کمی پیدا ہونے لگے گی۔

گولڈ کنٹرول کے قاعدوں کے مطابق لوگوں کو یہ بھی اعلان کرنا تھا کہ ان کے پاس کتنا سونا ہے اور وہ سونا کہاں سے ان کے پاس آیا۔ لیکن گولڈ بانڈ خریدنے والوں کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں تھی کہ سونا کہاں سے آیا۔ اعلان کے لئے ۹ فروری آخری تاریخ مقرر کی گئی تھی بعد میں یہ تاریخ بڑھا کر ۲۸ فروری کر دی گئی۔ ہو سکتا ہے کہ گولڈ بانڈ خریدنے والوں کی تعداد میں کچھ اضافہ ہو جائے لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ دراصل پہلے بھی جو تاریخ مقرر کی گئی تھی وہ بہت لمبی تھی۔ وہ تو ایک طرح سے ذخیرہ اندوزوں کو موقع دینا تھا کہ سونے کو زیورات میں تبدیل کر لیں اور فروخت کر لیں۔ اس موقع سے صرافوں نے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا۔ چنانچہ ۹ فروری کو اصلی سونے کی قیمت ۱۳۰ - ۱۱۰ روپے فی ۱۰ گرام تھی۔ انھوں نے اوسط ۵۰ فیصدی زیادہ منافع کمایا۔ تاریخ بڑھانے کا نتیجہ یہ ہوا چھپے چوری زیورات بنوانے کے لئے مزید وقت مل گیا۔

گولڈ کنٹرول سے متعلق جو بھی قاعدے قانون اس وقت تک نافذ کئے گئے ہیں وہ تو شاید ابتدا ہے امید ہے کہ گولڈ بورڈ حالات اور تجربہ کے پیش نظر قاعدوں پر نظر کریگا اور ان کو زیادہ مؤثر بنائے گا

تعلیمی مسائل

ثانوی مدارس میں سائنس کی تعلیم

اس زمانے میں ایک ملک کی طاقت و حیثیت کا سارا دارومدار اس کی سائنسی معلومات، فنی مہارت اور ان کے مناسب و موزوں استعمال پر ہے۔ دنیا کی منڈی میں نہایت ہی سخت مقابلے کا سامنا کرنا ہوتا ہے صنعت و حرفت میں اعلیٰ مقام رکھنے والا ملک ہی اس میدان میں اترنے کی جرأت کرسکتا ہے اور پاؤں جما سکتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے پچھڑے ہوئے ممالک کے اندر بھی روزمرہ کی زندگی میں مشین کا عمل دخل تیزی کے ساتھ بڑھ رہا ہے۔ سائنس کی تعلیم ہی میں قوموں کی خوشحالی نظر آتی ہے اور وہی ان کی آزادی کا ذمہ لے سکتی ہے۔ اس نے صرف قدرت کے راز ہی آشکارا نہیں کیے ہیں بلکہ انسان کو انسان سے متعارف بھی کرایا ہے۔ خصوصاً ایسے ملکوں میں جہاں توہم پرستی اور تاریک اندیشی کا دوردورہ ہے، سائنس کی تعلیم کی اہمیت اور زیادہ ہے۔ سائنس کی بدولت عالمی اشتراک و تعاون بڑھا ہے۔ اس کی شرکت نسلی اور مقامی تعصبات سے پاک ہے وہ صلائے عام کی قائل ہے۔ سائنس کے اصول اور طریقے کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوا کرتے وہ ان سب کے لئے ہیں جو انھیں برتنا چاہیں۔ سائنس کی تیز رفتاری نے تمام دنیا کے بسنے والوں کو آپس میں اس قدر نزدیک کر دیا ہے کہ ایک دوسرے کے معاملات و حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ترقی یافتہ ممالک کم حیثیت اور کم اہمیت کے دیسوں کی طرف سے کلیتاً غفلت نہیں برت سکتے۔ ایک جگہ کی ابتری کا اثر دوردور تک پہنچتا ہے اور یہ نہایت ضروری ہوگیا ہے کہ دنیا کا ہر ایک گوشہ کسی حد تک لازمی طور پر علوم و فنون کی برکتوں سے فیض یاب ہو۔ اب ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانے کا دور گزر گیا اور کوئی ملک، دنیا ومافیہا سے بے خبر اپنے حال میں مست رہ کر ترقی نہیں کرسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انتشار و اختلاف کے ساتھ ساتھ امداد باہمی

کا سلسلہ بھی برابر جاری رہتا ہے۔ خواہ با دلِ ناخواستہ ہی سہی لیکن بڑی بڑی مستحکم حکومتیں بھی چھوٹی چھوٹی عارضی ریاستوں کے ساتھ غیر معمولی فیاضی کا برتاؤ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ آج کل کی صنعتی اور سیاسی فضا میں یہ بات کچھ ایسی دشوار نہیں رہی ہے کہ کوئی پس ماندہ ملک دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی رہنمائی اور ہمت افزائی کے سہارے پر چند سال کے اندر اندر اپنے یہاں فولاد کے کارخانے نہ قائم کر سکے یا بجلی کا سامان تیار کرنے کا انتظام نہ کر پائے یا اسی نوعیت کے اور دوسرے اہم کام نہ کر سکے لیکن ان بڑے بڑے کارخانوں میں مشینوں کو مناسب طور پر برتنے اور ان کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک لائق اور تربیت یافتہ عملے کی ضرورت ہوتی ہے کاریگر اور ماہرینِ فن تیار کرنے میں کافی مدت لگا کرتی ہے اور یہ کام آسان بھی نہیں ہے۔ ایسی تربیت کے لئے ملک کے اندر ایک مکمل اور مستحکم قومی نظامِ تعلیم درکار ہوتا ہے۔ اس نظام کی ایک اہم اور درمیانی کڑی ثانوی منزل کی تعلیم ہے۔

اس وقت ثانوی مدارس کی آخری تین جماعتوں میں طلبہ کی تعداد تیس لاکھ بتائی جاتی ہے تیسرے پنجسالہ قومی منصوبے کے ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد پچاس لاکھ ہو جائے گی۔ اتنی بڑی تعداد کی بنا پر اس زمانے کی تعلیم کچھ اور اہم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ دیس کی مشین چلانے والے ان میں سے ہی تیار ہوں گے اور اعلیٰ تعلیم کی بنیاد یہیں رکھی جاتی ہے۔ ہماری موجودہ ثانوی تعلیم کی ایک خامی یہ بھی ہے کہ تیرہ چودہ سال کے بے فکر طالب علم کو اپنے لئے ان مضامین کا قطعی طور پر انتخاب کرنا پڑتا ہے جن میں وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواہش مند ہے۔ گویا ایک بچے کو عمر کی اس منزل پر یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ اس کی آئندہ زندگی کی شاہراہ کیا ہوگی۔ جبکہ وہ اس مسئلے پر کسی طور پر صائب رائے رکھنے کا اہل قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اب یہ بات بڑی حد تک سب ہی تسلیم کرتے ہیں کہ ثانوی منزل پر تعلیم کو محدود و مخصوص نہ بنانا چاہیئے بلکہ اس کا دامن وسیع و کشادہ رکھنا چاہیئے۔ طلبہ کی موزونیٔ طبع کے مطابق انھیں منتخب مضامین کا گہرا مطالعہ کرانے کے ساتھ ساتھ وسیع پس منظر ضرور دینا چاہیئے۔ اس لئے بیشتر مضامین سب کے لئے لازمی ہونے چاہئیں

اور خصوصی مطالعہ کی بس ابتدا ہی کرنی چاہیئے اور اس بات کی گنجائش رکھنی چاہیئے کہ طالب علم اپنی طبیعت کے جھکاؤ کو سمجھنے کی خاطر مختلف مضامین کے ذائقے سے واقف ہو سکے اور کسی حد تک تجربے سے سیکھ سکے۔

ہمارے دیس میں سائنس کی تعلیم اولاً بڑی تاخیر سے شروع ہوئی۔ پھر بھی بہت کم مدارس میں اس کا انتظام کیا جا سکا۔ اور وہ بھی نہایت ناقص طور پر۔ تعلیمی ترقی کے ابتدائی دور میں تو سائنس کی تعلیم کا قطعی فقدان رہا کیونکہ بدیسی سامراج نے اپنے مفاد کے پیش نظر نہ ذہنی بیداری کو روا رکھا اور نہ صنعتی ترقی کے روادار ہوئے۔ لہٰذا تعلیمی نظام میں بھی سائنس کو صحیح مقام دینے کا سوال نہ اٹھا۔ تعلیم کو ملک کی فلاح و بہبود اور عوام کی شخصیت کو ابھارنے کا ذریعہ بنانے کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ تو محض حکمرانوں کے ہاتھ بٹانے والے عملے کی تیاری کا ایک ذریعہ تھی۔ اس لئے سائنس کی تعلیم کا چراغ تہہ داماں ہی رہا۔ آزادی ملتے ہی رہبران قوم نے اپنی توجہ تعلیمی مسائل کی طرف مبذول کی اور ابتدائی منزل پر بنیادی تعلیم کی اسکیم تیار ہوئی۔ اگرچہ بنیادی تعلیم مروجہ اصطلاح میں سائنس کی تعلیم نہیں کہلائی جا سکتی لیکن بچوں میں ہاتھ سے کام کرنے کی صلاحیت کو ابھارتی ہے اور انھیں مشاہدے کی ترغیب دیتی ہے۔ ان کے دل میں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی وقعت بڑھاتی ہے اور انھیں دستکاری اور حرفے سے لگاؤ پیدا کرتی ہے۔ یہ رجحان طبیعت آئندہ زندگی میں سائنس کی تعلیم حاصل کرنے اور صنعت و حرفت کی تربیت حاصل کرنے کے لئے نہایت مفید ہے۔ دوسرے پنج سالہ قومی منصوبے میں ثانوی مدارس کے اندر سائنس کی تعلیم پر خاص زور دیا گیا۔ مدالیار کمیشن کی رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ثانوی مدرسے میں عام سائنس ایک لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جائے اور اسے طالب علم کی عام تعلیم کا ایک ضروری جز و سمجھا جائے۔ علاوہ ازیں سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبہ کو اختیاری طور پر بھی ایک علیحدہ مضمون کی حیثیت سے سائنس پڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس دوران میں تقریباً سب ہی ثانوی مدارس میں ابتدائی سائنس یا عام سائنس کا

انتظام کر دیا گیا اور چار ہزار چھ سو چھبیس کے قریب مدرسوں میں اختیاری سائنس بھی شروع
کر دی گئی۔ تیسرے منصوبے کے دوران میں تمام ثانوی مدارس میں عام سائنس لازمی کرنے کے
علاوہ اکیس ہزار آٹھ سو ثانوی مدرسوں میں سے نو ہزار پانچ سو سے بھی کچھ زائد مدرسوں میں سائنس
کی خصوصی تعلیم کو ایک اختیاری مضمون کی حیثیت سے شروع کر دیا جائے گا۔ کچھ دوسرے اقدامات
بھی تجویز کیے گئے ہیں جن کے ذریعے سائنس کی تعلیم کو بہتر اور موثر بنایا جا سکے گا۔ مثلاً دوسرے
منصوبے میں چار سو پچاس سائنس کلب قائم ہوئے تھے۔ اب ان میں اضافہ کیا جائے گا تاکہ سائنس
کا شوق طلبہ میں عام ہو۔ تمام ریاستوں میں سائنس کے نصاب کو ایک نہج پر لانے کی کوشش
کی جائے گی اور اسے تعلیم کی پہلی اور آخری منزل سے بخوبی مربوط کیا جائے گا۔ سائنس کے اساتذہ
ن رہنمائی کے لیے خصوصی طور پر کتابیں تیار کی جائیں گی۔ طلبہ کے لیے اچھی اور سستی درسی کتب اور دیگر
امدادی کتب کا انتظام ہوگا۔ سائنس کا معیاری سامان معقول قیمت پر بلا دقت فراہمی کی صورتیں نکالی
جائیں گی۔ دوسرے منصوبے میں دو ہزار ایک سو پندرہ کثیر المقاصد ثانوی مدارس قائم ہوئے تھے
مدالیار کمیشن میں ایسے مدرسے کھولنے کے لیے کہا گیا تھا تاکہ مختلف صلاحیتیں رکھنے والے
طلبہ کو بقدر ظرف اپنے جوہر دکھلانے کا موقع بھی مل سکے اور ان کی عام تعلیمی سطح بھی بلند اور کشادہ
ہے۔ اس طرح فنی اور صنعتی تعلیم کی سہولتیں بھی بڑھ گئی ہیں۔ تیسرے منصوبے میں صرف تین سو اکتیس
کثیر المقاصد ثانوی مدارس کا اضافہ تجویز کیا گیا ہے کیونکہ ان سب مدارس کے کام کو بہتر بنانے کی
طرف پوری توجہ صرف کی جائے گی اور بالخصوص سائنس کی تعلیم پر دھیان دیا جائے گا۔ اس زمانے
میں اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں بھی بہت کچھ کیا جا رہا ہے۔ یوں تو ۱۹۶۱ء تک اساتذہ
کے تربیتی اداروں کی تعداد دو سو چھتیس ہو چکی تھی جبکہ ۱۹۵۱ء میں صرف ترپن تھی لیکن اب
کل تعداد بڑھ کر تین سو بارہ ہو جائے گی۔ اس کام کو اور بہتر بنانے کی غرض سے ملک کے مختلف
حصوں میں چار علاقائی تربیتی ادارے (ریجنل ٹریننگ کالج) قائم کیے جا رہے ہیں جو کثیر المقاصد
ثانوی مدارس کے لیے اساتذہ تیار کرنے والا عملہ تیار کریں گے اور ملک کے دیگر تربیتی ادارو(ں

کے لئے رہنما ثابت ہوں گے۔ ان تمام اداروں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ سائنس اور ریاضی کے اساتذہ تیار کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کیونکہ بتایا جاتا ہے کہ ہر سال میں ہزار سے زائد سائنس اور ریاضی کے اساتذہ مدرسوں میں پہنچتے ہیں جن میں سے بمشکل چھ ہزار پورے طور پر تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ دورانِ ملازمت میں اساتذہ کی تربیت کی غرض سے دوسرے منصوبے کے دوران میں چوّن توسیعی پروگرام کے مرکز قائم ہوئے تھے۔ تیسرے منصوبے میں اس کام کو وسعت دے کر بیشتر تربیتی اداروں میں شروع کردیا جائے گا۔ تاکہ بالآخر وہ تمام تربیتی اداروں کا ایک لازمی جزو بن جائے۔ اس وقت توسیعی پروگرام کا سارا زور سائنس اور سماجی علوم کے اساتذہ کی تربیت کی طرف ہے۔ اس کی طرف سے ثانوی مدارس میں سائنس کلب قائم کئے جارہے ہیں اور بہر نوع طلبہ اور اساتذہ کو سائنس کی طرف راغب کیا جارہا ہے۔

ہمارے مشہور عالم سائنس داں اچاریہ جگدیش چندر بوس کی یادگار کے طور پر ۱۹۵۸ء میں ان کی صدسالہ سال گرہ کی تقریبات کے سلسلے میں "جگدیش بوس نیشنل سائنس ٹیلنٹ سرچ" اسکیم تیار کی گئی۔ اس اسکیم کا اصل مقصد تعلیمی اداروں کے تعاون سے سائنس کا رجحان رکھنے والے ذہین طلبہ کا پتہ لگانا ہے تاکہ ان کی ہمت افزائی کی جاسکے۔ کالج میں تعلیم پانے والا کوئی بھی طالب علم جس نے ثانوی جماعت تک سائنس کی تعلیم حاصل کرلی ہے۔ اس اسکیم کے ذریعے امداد کا خواہاں ہوسکتا ہے۔ ہر سال دس طلبہ کو پچھتر روپے ماہانہ وظیفے کا انتظام کیا گیا ہے یہ وظیفہ تین سال سے لے کر پانچ سال تک ایک طالب علم کو مل سکتا ہے اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ بھی دیا جاسکتا ہے۔ اس طرح ہونہار طالب علموں کو سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حوصلہ ہوگا۔ "نیشنل کونسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ" نے ابھی ایک ایسی ہی اسکیم کا اعلان کیا ہے جسے "سائنس ٹیلنٹ سرچ" کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ اسکیم نمونے کے طور پر فی الحال دہلی کے اندر چلائی جائے گی۔ اور آہستہ آہستہ ملک کی تمام ریاستوں میں رائج ہوجائے گی یہ اسکیم بھی اس غرض سے تیار کی گئی ہے کہ ثانوی تعلیم کے اختتام پر مستقبل کے سائنسدانوں کی

شاندہی کرلی جائے تاکہ ان کی صلاحیتوں کو مقابلے اور ہمت افزائی کے ذریعے ابھارا جاسکے
اس طرح ثانوی مدارس میں سائنس کی طرف طلبہ کا جھکاؤ بڑھے گا اور اعلی تعلیمی اداروں کو سائنس
کے ذہین اور مستعد طلبہ میسر آسکیں گے۔ اس اسکیم کے مطابق "سائنس ٹیلنٹ سرچ" کے مقابلے
میں اپنے استاد سائنس کی تصدیق کے بعد دہلی کے کسی بھی ثانوی مدرسے کی آخری جماعت
میں تعلیم پانے والا طالب علم شریک ہوسکتا ہے۔ ایک طالب علم کو اس مقابلہ میں صرف ایک
مرتبہ شرکت کی اجازت ہوگی۔ صلاحیت کی جانچ، قابلیت کے امتحان اور انٹرویو کے
ذریعے طلبہ کا انتخاب عمل میں آئے گا۔ کامیاب طلبہ کو پہلے سال پچاس روپے ماہانہ اور
اگلے دو سال پچھتر روپے ماہانہ وظیفہ دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ تقریباً سو روپے کی قیمت
کی کتابیں اور تعلیمی سامان بھی ہر ایک طالب علم کو فراہم کیا جائے گا۔ سائنس میں غیر معمولی صلاحیت
رکھنے والے طلبہ کی دریافت کے سلسلے میں مقابلے کا پہلا امتحان اسی ماہ (یعنی اپریل ۶۳ء)
میں ہوگا۔

قومی منصوبوں کے ذریعے ملک کی اقتصادی حالت روز بروز بہتر ہو رہی ہے۔ کاروبار کو
فروغ ہو رہا ہے اور صنعت و حرفت بڑھ رہی ہے۔ بڑی بڑی صنعتیں قائم ہو رہی ہیں اور
ہماری زندگی میں مشین کا استعمال بڑھ رہا ہے۔ اب ہمارا دیس ایسی مشترک معیشت
اختیار کر رہا ہے جہاں کی زندگی میں زراعت و صنعت دونوں دخیل ہوا کرتے ہیں
اس لیے ہمارے واسطے سائنس کی تعلیم کی ضرورت و اہمیت برابر بڑھتی جا رہی ہے جو ملک
صنعتی ترقی کا خواہش مند ہے اسے ابتدائی تعلیم سے ہی سائنس کی طرف توجہ کرنی ہوگی
اس وقت جو ہنگامی حالات رونما ہوئے ہیں انھوں نے ہمیں کچھ اور چونکا دیا ہے۔ اس
مکر و سیاست کی دنیا میں کسی کا اعتبار نہیں۔ یار کو غیر ہونے دیر نہیں لگتی۔ صدیوں کی
تہذیبی روایات ذرا سی دیر میں ملیامیٹ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ سلوک کا جواب بدسلوکی
سے ملنے لگتا ہے۔ لہٰذا اپنے آپ کو پوری طرح چاق و چوبند رکھنے کی ضرورت ہے۔

اس دورِ حاضر میں صرف جنگ کے آلات ہی نہیں بدل گئے ہیں بلکہ حالات بھی قطعی مختلف ہو گئے ہیں۔ اب نہ جنگ کی غارت گری صرف میدانِ کارزار تک محدود ہے اور نہ اس کی تیاری۔ آج کی جنگ کے مورچے، محاذ کے علاوہ فیکٹریوں اور کارخانوں میں بھی قائم ہوا کرتے ہیں۔ ایک ملک کا مستحکم صنعتی نظام ہی اپنے سپاہی کی صحیح طور پر پشت پناہی کر سکتا ہے اور یہ بات تو ظاہر ہی ہے کہ صنعتی ترقی کا سارا انحصار سائنس کی تعلیم پر ہے مزید برآں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سائنس کی تعلیم کے ذریعے نہ صرف مادی ترقی کی راہیں کھلتی ہیں بلکہ منطقی اور استدلالی نقطہ نظر بھی پیدا ہوتا ہے سائنس ذہنِ انسانی سے توہمات کے جالے ہٹاتی ہے اور ضعیف الاعتقادی سے بچا کر تحقیق و تفتیش کا عادی بنا دیتی ہے۔

"معلم"

۱۹۶۲ء کے اُردو ادب کا جائزہ

اگلے ماہ جامعہ کا جائزہ نمبر شائع ہوگا

اس کے چند متوقع مضمون نگار حسبِ ذیل ہیں:-

پاکستانی مطبوعات کا جائزہ		پروفیسر انیس خورشید
تنقیدی ادب	"	پروفیسر آل احمد سرور
تحقیقی ادب	"	جناب قاضی عبدالودود
ناول اور افسانوں	"	جناب ظفر پیامی
نظم	"	جناب علی جواد زیدی

کوائف جامعہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وفات پر تعزیتی جلسہ

ڈاکٹر راجندر پرشاد کی وفات کی خبر جامعہ میں انتہائی رنج و غم کے ساتھ سنی گئی۔ اساتذہ اور طالب علموں کا ایک تعزیتی جلسہ منعقد ہوا: تلاوت قرآن کے ساتھ جلسہ کا آغاز ہوا۔ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے ایک مختصر تقریر کی اور ڈاکٹر راجندر پرشاد کی خدمات اور قربانیوں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے بتلایا کہ مرحوم نے کس خلوص اور لگن کے ساتھ ملک کی خدمت کی۔ ان کی ایک نمایاں اور ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ معاملات اور مسائل پر غور کرتے وقت ان کی نظر میں سب لوگ برابر ہوتے وہ نہ تو سیاسی اختلافات سے متاثر ہوتے اور نہ فرقے اور علاقے سے۔ راشٹرپتی منتخب ہونے کے بعد انھوں نے ملک کے سربراہ کی حیثیت سے بہترین نمونہ پیش کیا

آخر میں شیخ الجامعہ صاحب نے حسب ذیل ریزولیوشن پڑھ کر سنایا جسے سب نے کھڑے ہوکر منظور کیا:

ڈاکٹر راجندر پرشاد صف اول کے رہنما، گاندھی جی کے مخلص عقیدت مند اور پیروکار اور ہندوستان کے پہلے صدر تھے۔ ان کی وفات سے ملک ایک بہترین شخصیت سے محروم ہوگیا۔

مرحوم کو جامعہ سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ جامعہ کے کاموں کو قدر اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور ان کے جامعہ کے سربراہوں سے مخلصانہ تعلقات تھے۔ انھوں نے سنہ ۱۹۴۱ء میں بنیادی تعلیمی کانفرنس کی جو جامعہ کے اہتمام میں جامعہ نگر میں منعقد ہوئی تھی۔

صدارت کی اور ۱۹۶۰ء میں جب جامعہ کا جشن چہل سالہ منایا گیا، تو مرحوم نے اپنی انتہائی مصروفیت اور خرابی صحت کے باوجود اس کے بنیادی جلسے کی صدارت فرمائی۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی روح کو سکون بخشے اور ان کی خوبیوں اور اچھائیوں پر عمل کرنے کی ہم سب کو توفیق عطا کرے۔

استادوں کے مدرسہ میں سائنس میلہ اور کلچرل پروگرام

فروری اور مارچ کے مہینے استادوں کے مدرسے کے طلبا اور اساتذہ کے لئے بہت مصروفیت کے مہینے رہے ہیں اس لئے کہ بیشتر جلسے اور کلچرل پروگرام اسی زمانے میں ہوئے جس کا مختصر سا خاکہ یہ ہے۔

توسیعی پروگرام کے تحت ۱۱، ۱۲، ۱۳ فروری کو ایک سہ روزہ سائنس میلے کا انتظام کیا گیا۔ اس موقع پر جلسوں کے علاوہ ایک سائنس کی نمائش بھی کی گئی جس میں دلی کے ہائر سکنڈری اور سینئر بیسک اسکولوں کے طلبا نے اپنے ہاتھ کے بنائے ہوئے کچھ سائنس کے پروجیکٹ پیش کئے تھے۔ ان میں سے کچھ پروجیکٹ تو اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنے دلچسپ تھے کہ ان سے دلچسپی لئے بغیر کسی کا وہاں سے گزر جانا مشکل تھا۔ اس میلے کا افتتاح ڈاکٹر ڈی ایس کوٹھاری چیرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے کیا۔ آپ نے اپنی بصیرت افروز تقریر میں اس بات پر بہت زور دیا کہ سائنس ایک عظیم عالمی نعمت ہے جو ملک و قوم، نسل و رنگ مذہب وملت کے امتیازات سے بالاتر ہے اور تمام ملکی اور جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہے دراصل سائنس کی ترقی سے ہی پوری انسانیت کا مستقبل وابستہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی سے اس موقع پر ڈاکٹر جے سوار برک، ڈائرکٹر، یونیسکو، ساؤتھ ایسٹ ایشیا سائنس کوآپریشن آفس دہلی، بھی بحیثیت مہمان خصوصی تشریف فرما تھے، آپ نے نہایت موثر انداز میں اپنے تاثرات سے حاضرین کو مستفید فرمایا۔ آخر میں پروفیسر محمد مجیب شیخ الجامعہ نے اپنے مخصوص علمی انداز میں فرمایا کہ سائنس اور آرٹ کے علوم کا مقصد ایک ہی ہے یعنی حقیقت کی جستجو۔ اس مقصد کے پیش نظر ان علوم کے ماہرین کو چاہیئے کہ حقیقت کی تلاش کا ایک ایسا متوازن راستہ

اختیار کریں جس پر عمل کر سائنس اور آرٹ کے علوم ایک دوسرے سے قریب تر ہو سکیں۔

۱۲ فروری کو صبح کی نشست میں ایک تقریری مقابلے کا انتظام کیا گیا جس میں دلی کے سینئر سیکنڈری اسکول اور ہائر سیکنڈری اسکول کے تقریباً ۲۲ طلبا نے مختلف عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس جلسے کی صدارت شری جی۔ این شرما، ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن، دہلی نے فرمائی۔ آپ نے طلبا کی کوششوں کو سراہتے ہوئے اسکولوں اور کالجوں میں سائنس کلب کے قیام پر زور دیا۔

اسی دن شام کو سائنس کے استادوں کا ایک دلچسپ سمپوزیم ہوا جس کی صدارت کے فرائض شری این کے۔ سانیال، فیلڈ ایڈوائزر، ڈائرکٹریٹ توسیعی پروگرام نے انجام دئے۔

تیسرے دن کا پروگرام اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے حد دلچسپ تھا۔ صبح کی نشست میں طلبا نے خود نمائش میں پیش کئے جانے والے سائنس کے پروجیکٹ کے بارے میں دلچسپ اطلاعات بہم پہنچائیں۔

شام کی نشست میں وزارت تعلیم کے جوائنٹ ایڈوائزر شری راجہ راؤ سنگھ نے طلبا و اساتذہ کی کوششوں کو سراہتے ہوئے سائنس کے میدان میں کچھ نئی سمتوں کی طرف توجہ دلائی اور آخر میں تقریری مقابلے میں امتیاز حاصل کرنے والے طلبا کو انعامات تقسیم کئے۔

غرض اسی طرح یہ سہ روزہ میلہ ختم ہوا۔ اس میلے سے طلبا اور اساتذہ نے جس شوق اور دلچسپی کا اظہار کیا وہ بہت امید افزا ہے۔ اور آئندہ اس قسم کے کام کرنے کا ایک بہت بڑا سہارا۔

مارچ کے مہینے میں انجمن طلبا کے تینوں ہاؤسز کی طرف سے جو کچھ سرگرمیاں عمل میں آئیں ان کی مختصر سی تصویر یہ ہے۔

۵ مارچ کو ٹیگور ہاؤس کی طرف سے ٹیگور ڈے، منایا گیا۔ اس موقع پر ایک نمائش کا انتظام کیا گیا جس میں ٹیگور کی بنائی ہوئی تصویریں اور ٹیگور کی کتابیں پیش کی گئیں۔ تصویریں للت کلا اکیڈمی سے حاصل کی گئی تھیں اور کتابیں ساہتیہ اکیڈمی سے۔ اس طرح طلبا اور

اساتذہ کے سامنے ٹیگور کے دو اہم پہلو پیش کئے گئے یعنی مصوری اور ادب۔

اس موقع پر طلبا کی طرف سے موتو ایکٹنگ، ایک ایکٹ کا ڈرامہ (پردے کے پیچھے) اور کچھ کلچرل پروگرام پیش کئے گئے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بہت دلچسپ تھے۔

۱۲ر مارچ کو گاندھی ہاؤس کی طرف سے ایک محفل موسیقی منعقد کی گئی جس میں دلّی کے بہت سے مشہور موسیقی کاروں کو جمع کر کے تفریح کا ایک اچھا موقع بہم پہنچایا گیا۔

۱۶ر مارچ کو گاندھی ہاؤس کی طرف سے ایک شام غزل کا انتظام کیا گیا جس میں طلبا کی طرف سے کچھ دلچسپ پروگرام پیش کئے گئے۔ اس موقع پر ایک ڈرامہ سیندر کا پنجہ بھی پیش کیا گیا۔

غرض اس طرح یہ دونوں مہینے تعلیمی اور تفریحی سرگرمیوں کے اعتبار سے نہایت اہم تھے۔

ہندوستان میں مذہبی قوم پروری

۱۶ر مارچ ۱۹۶۳ء کو جامعہ کالج کے حلقۂ مطالعہ میں ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے اپنی زیر تصنیف کتاب "ہندوستانی مسلمان —— آج اور کل" کا وہ باب پڑھا جس کا عنوان ہے "مذہبی قوم پروری"، اس باب میں انھوں نے شاہ ولی اللہ رح کی اُن ذہنی علمی کاوشوں کا ذکر کیا ہے جس کا تعلق مسلمانوں کی ذہنی و عملی زندگی کی اصلاح سے تھا، پھر ان کے جلیل القدر صاحب زادے اور جانشین شاہ عبدالعزیز رح کا ذکر ہے جو اس وقت کے بدلتے ہوئے حالات میں مسلمانانِ ہند کا ضمیر تھے اور جنھوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی بڑھتی ہوئی طاقت کی مزاحمت کے لئے اگر کچھ نہ کیا گیا تو ہندوستانی مسلمانوں میں باوقار زندگی ایک قصہ پارینہ بن کر رہ جائے گی، فاضل مصنف نے سید احمد شہید کی تحریک پر معروضی نقطہ نظر سے روشنی ڈالی۔ اور بتایا کہ سید صاحب مسلمانوں کی مذہبی و معاشرتی اصلاح کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کا مقصد بھی پیش نظر رکھتے تھے، ان کی شہادت کے بعد ان کی تحریک کی چنگاریاں [illegible] یہاں تک کہ جب ۱۸۵۷ء

کی بغاوت شروع ہوئی تو یہ چنگاریاں ایک بار پھر شعلہ بنیں اور خاص طور سے شاملی کے میدان میں مولانا امداد اللہ مہاجر مکیؒ، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی رہنمائی میں علماء نے اپنی حریت پسندی کا نمایاں اور واضح ثبوت دیا۔ پھر دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، اس سلسلہ میں عابد صاحب نے مولانا نانوتوی رح کی درویشانہ زندگی ایثار و قربانی اور قائدانہ خصوصیات کا خاص طور سے ذکر کیا ہے اور علماء دیوبند کی قوم پروری کو واضح طور پر نمایاں کیا ہے۔ اس سے پہلے عابد صاحب نے اُس چیلنج کا ذکر کیا تھا جو نئے ہندوستان نے اپنے مسلمانوں کو دیا تھا اور جس کے مختلف جواب دئے گئے۔ ان میں سے پہلے جواب کا جو سرسید اور علی گڈھ کے مکتب خیال کی طرف سے دیا گیا پچھلے مقالے میں تفصیلی بیان تھا۔ موجودہ مقالے میں دوسرے جواب کا ذکر ہے۔ جو طبقہ علماء نے دیا۔

محفل مشاعرہ

پہلی اپریل کو جامعہ میں ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین صاحب کی صدارت میں ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی، جس میں ہندوستان اور پاکستان کے حسب ذیل شعراء نے شرکت کی:۔

حفیظ جالندھری، فراق گورکھپوری، گوپی ناتھ امن، روش صدیقی، سکندر علی وجد، سردار جعفری، قتیل شفائی، جگن ناتھ آزاد، حمایت علی شاعر، اقبال صفی پوری، نظر جعفری اور کلیم عثمانی۔

جناب غلام ربانی تاباں نے میزبان کی حیثیت سے مشاعرہ کا آغاز کیا۔ اس مختصر جگہ میں ان تمام شعرا کے کلام کا انتخاب پیش کرنا ممکن نہیں، اس لئے صرف فراق گورکھپوری اور حمایت علی شاعر کا انتخاب شائع کیا جا رہا ہے بقیہ شعراء کا کلام کسی اور اشاعت میں پیش کیا جائے گا۔

حضرت فراق گورکھپوری

غزل کے ساز اٹھاؤ بڑی اداس ہے رات
نوائے میر سناؤ بڑی اداس ہے رات

ابھی تو ذکر سحر دوستو ہے دور کی بات
ابھی تو دیکھتے جاؤ بڑی اداس ہے رات

ابھی ابھی یہ ہمیں بجھ گئے ہیں چراغ
دلوں کی خبر سناؤ بڑی اداس ہے رات

سمیٹ لو کہ بڑے کام کی ہے دولتِ غم
اسے یونہی نہ گنواؤ بڑی اداس ہے رات
اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیئے ہیں ٹوٹے ہوئے
انہیں سے کام چلاؤ بڑی اداس ہے رات
پڑے ہو دھندلی فضاؤں میں منہ لپیٹے ہوئے
ستارو! سامنے آؤ بڑی اداس ہے رات
کبھی تمھارے یہاں بھی ہوئی ہے رات ایسی
مقدروں کے خداؤ بڑی اداس ہے رات

دو آتشہ نہ بنا دے اسے نوائے فراق
یہ سازِ غم نہ سناؤ بڑی اداس ہے رات

بڑا کرم ہے یہ ہم پر ابھی یہاں سے نہ جاؤ
بہت اداس ہے یہ گھر ابھی یہاں سے نہ جاؤ
ابھی تو سوئے چراغوں نے آنکھ کھولی ہے
ابھی تو جاگتے ہیں گھر ابھی یہاں سے نہ جاؤ
گھنے درختوں کے جھرمٹ پہ پڑنے والی ہے
کمندِ ماہِ منور ابھی یہاں سے نہ جاؤ

حضرت حمایت علی شاعر

وہ ایک لفظ جو شرمندۂ بیاں نہ ہوا
اس ایک لفظ کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا
اس ایک اشک نے رکھ لی ہے آبروئے غم کی
جو دل میں ڈوب گیا آنکھ سے رواں نہ ہوا

آج اے دل لب و رخسار کی باتیں ہی سہی
وقت کٹ جائے گا کچھ پیار کی باتیں ہی سہی
یوں تو کٹتی ہی رہے گی غمِ دوراں میں حیات
آج کی رات غمِ یار کی باتیں ہی سہی
زندہ رہنے کی کبھی تو کوئی صورت نکلے
عشرتِ عالمِ دیدار کی باتیں ہی سہی
کوئی تو بات چھڑے آج بہت جی ہے اداس
کچھ نہیں تو در و دیوار کی باتیں ہی سہی
یہ تو طے ہے کہ جئے جائیں گے ہر حال میں ہم
ان کے لب پر رسن و دار کی باتیں ہی سہی

مراسلہ

اقبال کے خطوط عشرت رحمانی کے نام؟

(جامعہ کے مولانا ابوالکلام آزاد نمبر میں، مختلف خطوط سے جو اقتباسات دئے گئے تھے، ان میں ایک اقتباس اقبال نامہ کے اس خط سے تھا جو جناب عشرت رحمانی صاحب کے نام شائع ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل مراسلہ موصول ہوا ہے:۔

۱۴ - ۳ - ۶۳ شیخوپورہ ۶۸۶ بدایوں

عزیز مکرم - السلام علیکم

جامعہ کے آزاد نمبر کا شکریہ۔ معلوم نہیں انکشاف کرنا چاہیئے یا نہیں۔ مگر اقبال نامہ میں جو خطوط عشرت رحمانی کے نام سے شائع ہوئے ہیں وہ درحقیقت میرے نام ہیں۔

مولانا راغب صاحبؒ نے اقبال نامہ کے مرتب پروفیسر کو بتایا تھا کہ بہت سے خطوط میرے پاس ہیں۔ چنانچہ جواب میں انھیں لکھا تھا کہ جملہ مشاہیر کے خطوط مجھ سے عشرت رحمانی لے گئے ہیں۔ ان سے منگوا کر آپ کو بھیج دوں گا۔ چند خطوط مل سکے وہی میں نے بھیج دئے۔ جب کتاب میں یہ غلطی ہو گئی تو مرتب صاحب نے اپنے صاحبزادے کی غلطی بتائی اور دوسرے ایڈیشن میں صحیح کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر دوسرے ایڈیشن کی نوبت ہی نہیں آئی - اور نہ آئے۔

بہرحال آزاد نمبر میں عشرت رحمانی کے نام ڈاکٹر اقبال کا جو خط مورخہ ۲۱؁ء آپ نے صفحہ ۲۷۱ پر شائع کیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے میں نے ہی ڈاکٹر اقبال کو تذکرہ کے دیباچہ نگار کے اس ریمارک کی اطلاع دی تھی۔ اس کا یہ جواب ہے۔ چنانچہ اس کے بعد اقبال نامہ میں ڈاکٹر صاحب کا سید سلیمان صاحب ندوی کے نام ایک خط موجود ہے۔ جس میں

انھوں نے ان سے میرے متعلق دریافت کیا ہے کیونکہ ڈاکٹر صاحب سے غائبانہ کے علاوہ ذاتی واقفیت نہ تھی اور وہ نقیب پر بڑی نوازش فرمایا کرتے تھے۔

۱۹۲۱ء میں عشرت رحمانی غالباً اپنی ابتدائی تعلیم سے بھی فارغ نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۴۸ء کے قریب دیوار میں انھوں نے اپنا رسالہ دہلی سے نکالا تھا۔ پھر آل انڈیا ریڈیو میں چلے گئے تھے۔ اب ریڈیو میں ہی پاکستان میں ہیں۔

دعا گو

وحید احمد

طابع وناشر: عبداللطیف اعظمی، مطبوعہ ...

۱۹۶۲ء کی اُردو مطبوعات

(پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا ایک سرسری جائزہ)

جناب انیس خورشید

یوں تو قیام پاکستان کے پہلے ہی سے لاہور اُردو ادب کی نشر و اشاعت کا ایک اہم مرکز بن چکا تھا۔ دہلی لکھنو، حیدرآباد، علی گڑھ، اعظم گڑھ اور الہ آباد کے بعد یہیں سے شعر و ادب کے نئے تصورات کے نئے افق ہویدا ہوئے۔ لاہور نے جدید اردو ادب کی تشکیل میں جو حصہ لیا ہے اس سے نہ صرف ادب کے تصورات اور رجحانات کو ہی تقویت پہنچی، بلکہ اردو کتابوں اور رسالوں کی طباعت اور اشاعت کو بھی خاصا فروغ ہوا۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد ایک طرف تو اس مرکز کو مزید عروج حاصل ہوا اور دوسری طرف نئے دیس میں نئے ادبی اور ثقافتی مرکز بھی بننے لگے۔ کراچی پاکستان کا دارالخلافہ بنا، مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ کتنے ہی ادیب، فن کار، دانش ور، اور اشاعتی کاروبار کرنے والے ساحل بحر عرب کے اس شہر میں پہنچے دیکھتے ہی دیکھتے، کراچی، لاہور کے بعد پاکستان میں اُردو مطبوعات کا دوسرا سب سے اہم مرکز بن گیا۔ گذشتہ دو تین سال سے اچھی اور معیاری کتب جس رفتار سے کراچی سے شائع ہو رہی ہیں وہ ایک روشن تر مستقبل کی بشارت ہیں۔

ان دو مرکزوں کے علاوہ اردو کتابوں کی اشاعت کا کام اب ڈھاکہ، حیدرآباد، سکھر، ملتان بھاولپور، منٹگمری، گجرات، سیالکوٹ، مستونگ (قلات) ڈیرہ غازی خاں، راولپنڈی اور پشاور میں بھی شروع ہو چکا ہے۔

ہر سال کچھ نئے اشاعتی ادارے قائم ہوتے ہیں اور کچھ دم توڑ دیتے ہیں اور کچھ ادارے ایسے بھی ہیں جو اپنی سابقہ روایتوں کو قائم رکھتے ہوئے اچھی اور خوب صورت کتابیں نہ صرف شائع کرتے ہیں بلکہ اپنی روایات

کو بھی آگے بڑھاتے ہیں۔ اس سال جن اداروں نے پہلی مرتبہ کتابیں شائع کی ہیں ان میں شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی، ادارہ نگار پاکستان کراچی، ادارہ علم مجلسی کراچی، پاک اکیڈمی، کراچی، کتاب نما لاہور، ادارہ مصنفین پاکستان، ذیلی شاخ، سکھر وغیرہ خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ گزشتہ برسوں کی طرح حکومت پاکستان نے اس سال بھی جہاں علمی اور ادبی اداروں کی معاونت کی وہیں اردو کی ترقی کے لئے ایک اور ادارہ کی لاہور میں بنیاد رکھی جس کا نام "مرکزی اردو ترقیاتی بورڈ" ہے! اس بورڈ کے دائرۂ عمل میں مقامی زبانوں کے الفاظ و محاورات کی ایک ایسی فرہنگ بھی مرتب کرنا شامل ہے جنھیں آسانی سے اردو زبان میں مروج کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ اردو زبان میں ایک قاموس العلوم کی تیاری کا کام بھی اس کے سپرد ہے۔ اس بورڈ کی جانب سے ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی نگرانی میں بنیادی اردو کی لغت کی تیاری کا کام بھی شروع ہو چکا ہے اس لغت کی تکمیل کے بعد تعلیم بالغان کا ایک اہم مسئلہ حل ہو جائے گا، اور ان لوگوں کو اردو زیادہ آسانی کے ساتھ پڑھائی جاسکے گی جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اس بورڈ میں ملک کے مشہور اہل قلم اور دانشور شامل ہیں۔

اشاعتی کاروبار کے اس پھیلاؤ کے باوجود اب تک ہمارے سامنے کوئی ایسی مکمل فہرست نہیں ہے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو کتابوں کی اشاعت کے کتنے ادارے ملک میں قائم ہیں، ان کی کتنی کتابیں ہر سال شائع ہوتی ہیں اور کن موضوعات پر؟ یہی کیفیت دیگر مطبوعات کی بھی ہے جو دوسری زبانوں میں پاکستان سے شائع ہوتی ہیں۔ اس کمی کا شدید احساس اب پیدا ہو چکا ہے اور اسے پورا کرنے کے سلسلے میں کچھ کوششیں کی جا چکی ہیں اور کچھ ہنوز جاری ہیں۔ بہرحال صحیح صورت حال کے واضح ہونے میں ابھی کچھ وقت درکار ہوگا۔

اس ضمن میں اس تحقیقی رپورٹ کا ذکر ضروری ہے جسے گریجویٹ اسکول آف بزنس ایڈمنسٹریشن کراچی یونیورسٹی نے ۱۹۶۱ء میں شائع کیا تھا۔ یہ رپورٹ مغربی پاکستان کے اشاعتی اداروں کی دوسالہ (۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء) سرگرمیوں سے متعلق ہے اور اس کا خلاصہ اکتوبر ۱۹۶۱ء کے رسالے UNESCO INFORMATION BULLETIN ON READING MATERIALS[۵] میں شائع

۵ (فٹ نوٹ صفحہ ۲۵۳ پر ملاحظہ کیجیے۔)

ہوچکا ہے۔ اس جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ ان دو سالوں میں دو سو اشاعتی ادارے مغربی پاکستان میں موجود تھے جن میں ۹۰ فیصدی ادارے کراچی اور لاہور میں واقع تھے۔ طباعت کے ان دو مراکز سے کل ۲۲۰۷ کتابیں ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئیں جن میں کراچی کے ۲۲ ناشروں نے ۷۰۶ کتابیں اور لاہور کے ۲۱ ناشروں نے ۵۰۶ کتابیں شائع کیں۔ یہ اعداد و شمار بھی قطعی نہیں اور نہ ان سے اردو کی مطبوعات کی صحیح نشان دہی ہوتی ہے کیونکہ ان کتابوں میں اردو کے علاوہ دیگر زبانوں کی مطبوعات بھی شامل ہیں جو ان اداروں سے شائع ہوئی ہیں، بہرحال اردو مطبوعات کی تعداد بلاشک و شبہ دیگر زبانوں کی مطبوعات سے کہیں زیادہ ہے۔ اس جائزے سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ موضوعات کے اعتبار سے ان دو سالوں میں ناول اور افسانے زیادہ تعداد میں شائع ہوئے، اس کے بعد مذہب، تنقید، ادب اور شاعری، بچوں کا ادب، تذکرے اور سوانح حیات کا نمبر آتا ہے۔[1]

ایک دوسری قابل قدر کوشش پاکستانی مطبوعات کی قومی فہرست سے متعلق ہے جسے PAKISTAN BIBLIOGRAPHICAL WORKING GROUP یونسکو کے تعاون سے تیار کر رہا ہے۔ اس فہرست میں قیام پاکستان سے لے کر ۱۹۶۱ء تک شائع ہونے والی پاکستانی زبانوں کی مطبوعات کا اندراج ہوگا۔ حوصلہ شکن دشواریوں کے باوجود ابتدائی کام مکمل ہوچکا ہے اور توقع ہے کہ یہ فہرست ۱۹۶۳ء کے اختتام تک شائع ہو جائے گی۔ ایک اور مستحسن قدم حکومت پاکستان نے اٹھایا ہے جو پاکستان کاپی رائٹ ایکٹ کے نفاذ سے متعلق ہے۔ خیال ہے کہ اس قانون پر عمل درآمد ۱۹۶۳ء میں شروع ہو جائے گا۔ اس قانون کی رو سے پاکستان کے تین کتب خانوں میں (بشمول نیشنل لائبریری آف پاکستان) قومی مطبوعات کی ایک ایک جلد داخل کرنا ہر ناشر کے لئے قانونی طور پر ضروری ہوگا۔

HAVEMER, S. ABDUL HAQ AND TAUFIQ KHAN. PUBLISHING PRINTING AND BOOK SELLING IN WEST PAKISTAN. IN UNESCO BULLETIN ON READING MATERIALS 3:3, OCT. 1961. P 34-35.

[1] ایضاً۔

کتابوں کے اس طرح داخل کئے جانے سے مطبوعات کی قومی فہرست شائع کرنے میں آسانی ہوگی اور پھر کسی سال کی تصانیف کا اندازہ لگانے اور اس سے رفتارِ ادب کا جائزہ لینے میں اتنی دشواری نہ ہوگی جو اس وقت درپیش ہے۔

ان حالات میں صرف ایک سال (۱۹۶۲ء) کی مطبوعات کا جائزہ لینا خاصا وقت طلب تھا۔ کتابیں بہرحال شائع ہوتی رہتی ہیں اور ان پر تبصرے بھی آئے دن رسالوں میں چھپتے رہتے ہیں، یہ اندازہ لگانا البتہ دشوار ہوتا ہے کہ آیا کتاب ۱۹۶۲ء میں شائع ہوئی تھی یا ۱۹۶۱ء میں بیشتر کتابوں پر سنِ اشاعت سرے سے چھپتا ہی نہیں، رسالوں اور اخباروں میں شائع ہونے والے تبصروں میں بھی اکثر اس کا خیال نہیں رکھا جاتا، ناشروں سے رجوع کیجئے تو اول جواب ہی نہیں آتا اور اگر جواب بھی آتا ہے تو بیشتر ایسی مطبوعہ فہرستیں بھیج دیتے ہیں جو ماہ و سال سے بے نیاز ہوتی ہیں اب کتاب گھروں کے دروازے کھٹکھٹائیے تو وہاں سے بھی مناسب تعاون حاصل نہیں ہوتا، لیکن بعض ناشر ایسے بھی تھے جنھوں نے نہ صرف اپنی مطبوعات کے سلسلے میں ضروری مدد پہنچائی بلکہ دوسرے اداروں کی مطبوعات کی بھی نشان دہی کی اس سلسلے میں علاؤالدین خالد (اردو اکیڈمی سندھ) سلطان حسین اینڈ سنز اور خصوصیت کے ساتھ اکرام احمد (مشتاق بک ڈپو کراچی) کا تعاون قابلِ ذکر ہے ان حضرات کی کوششوں سے اس جائزہ کا مشکل کام بھی آسان بنتا گیا: "قومی زبان" کراچی کی اشاعتوں سے بھی اس مضمون کے لئے کافی مدد ملی جس میں ایک مستقل عنوان کے تحت اس سال سے نئی مطبوعات کی فہرست شائع کی جا رہی ہے۔ ۱۹۶۲ء کی مطبوعات کا جائزہ پیش کرنے سے پہلے ایک بات ناشرین کے گوش گذار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ کتابوں میں سن طباعت کا اندراج ایک اہم ضرورت ہے جس کی قدر و قیمت وقت کے گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

[illegible] ۱۹۶۲ء میں شائع ہونے والی اردو کی جو کتابیں [illegible] ان کی تعداد ۳ [illegible] قیاس ہے کہ [illegible] ممکن ہے بعض ایسی کتابیں [illegible] داخل رہ گئی ہوں [illegible] بہرحال میں نے اس بات کی حتی المقدور کوشش [illegible]

کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ نمائندہ کتابوں کا ذکر کیا جا سکے تاکہ پاکستان کے علمی، ادبی اور ثقافتی رجحانات کا پتہ لگانے میں آسانی ہو اور مستقبل کے بارے میں نتیجہ اخذ کرنے میں سہولت ہو۔

سال گزشتہ کی طرح اس سال شائع ہونے والی مطبوعات میں عام پسند کتابوں کی تعداد زیادہ ہے جو کاروباری نقطۂ نگاہ سے شائع کی جاتی ہیں۔ ان میں ایسے ناول سرفہرست ہیں جو فنی اعتبار سے معیاری قرار نہیں دئے جا سکتے۔ لیکن چونکہ عام پڑھنے والوں کے مذاق کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھے جاتے ہیں اس لئے زیادہ تعداد میں چھپتے ہیں اور اسی اعتبار سے فروخت بھی ہوتے ہیں یہ ناول تاریخی، جنسی، رومانی اور جاسوسی ہوتے ہیں، اس سال اس قسم کے شائع ہونے والے ناولوں میں بعض تو نئے ہیں اور بیشتر پرانے ناولوں کے نئے اڈیشن ہیں ان میں ایم۔ آر۔ خاتون، نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری، ایم اسلم۔ وحشی محمود آبادی، قیسی رامپوری، عادل رشید وغیرہ کے ناول شامل ہیں۔

ہمارے جائزے کے مطابق ۱۹۶۲ء میں جاسوسی ناولوں کی مقبولیت ۱۹۶۱ء کے مقابلے میں قدرے کم رہی ہے اس کی ایک وجہ ابن صفی کی مستقل علالت ہے، ابن صفی کے نام سے فائدہ اٹھانے کے لئے بعض لوگ ابن صفی جیسے ناموں سے جاسوسی ناول لکھ رہے ہیں نئے جاسوسی ناول نگاروں میں انوار صدیقی نے اپنے پڑھنے والوں کا حلقہ بنا لیا ہے اور مسعود جاوید اور اکرم الہ آبادی کے جاسوسی ناولوں کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع ہونے لگا ہے، خواتین گھریلو ماحول کے رومانی ناول زیادہ پسند کرتی ہیں بالخصوص ایسے ناول جن کا تعلق لکھنؤ اور دلّی کے معاشرتی ماحول سے ہو اور جن کے مصنف خود ان کی ہی صنف سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہمارے خیال میں ایم۔ آر خاتون کی مقبولیت کا راز یہی ہے، اس انداز کی ناول نگار خواتین میں عائشہ جمال، فاطمہ مبین اور زبیدہ خاتون نے بھی خاصی شہرت حاصل کر لی ہے۔

عام پسند ناولوں کے اس دور میں خدشہ تھا کہ بہتر اور اچھے ناولوں کی مقبولیت متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے گی اور یوں ناول کے فنی ارتقاء کی منزلیں مسدود ہو کر رہ جائیں گی، لیکن ۱۹۶۱ء میں جب دو چونکا دینے والے ناول "آگ کا دریا" (قرۃ العین حیدر) اور "خدا کی بستی" (شوکت صدیقی) کے بعد دیگرے شائع ہوئے تو اردو ادب میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا، اور عام طور پر نقادوں نے یوں

یوں محسوس کیا جیسے اردو ناول نے ایک ہی جست میں تاروں کو چھو لیا ہو، "خدا کی بستی" کو ۱۹۶۰ء کا آدم جی ادبی انعام بھی مل چکا ہے، اس سال اس ناول کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔ اس ناول پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا تھا کہ "یہ ناول گئو دان کی عظمت کو نہ پہنچ سکا لیکن اس کا مصنف یقیناً گئو دان سے بلندتر ناول لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے"[۱] لیکن زیر تبصرہ سال میں شائع ہونے والا شوکت کا نیا ناول "کوکا بیلی" (مطبوعہ ادارہ ادبیات نو لاہور) ان بجا توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ "خدا کی بستی" کے بعد ہمیں شوکت سے اس سے بہتر ناول کی امید تھی لیکن یہ ناول "خدا کی بستی" سے قدم آگے بڑھانا تو درکنار اس کی بلندی تک بھی نہ پہنچ سکا، بہرحال یہ ایک دلچسپ ناول ضرور ہے جس میں لکھنؤ کے اس دم توڑتے ہوئے سماج کا مرقع پیش کیا گیا ہے جسے نوابوں اور جاگیرداروں نے جنم دیا تھا، اس معاشرے کی زود اعتقادیوں توہمات، اور عیش کوشیوں کا نقشہ بھی خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے، "کوکا بیلی" کی کہانی انھیں قدروں کے نمائندہ کرداروں کے گرد بڑھتے پھیلتے جیسے یکبارگی ختم ہو جاتی ہے گردپوش دیدہ زیب ہے، طباعت بھی اچھی ہے،

زیر تبصرہ سال کے ناولوں میں، خدیجہ مستور کا پہلا ناول "آنگن" (مطبوعہ کتاب نما، لاہور) ایک قابل قدر اضافہ ہے اس ناول کو اس سال کا آدم جی ادبی انعام بھی مل چکا ہے۔ "آنگن" میں ایک متوسط مسلم گھرانے کی کہانی پیش کی گئی ہے جو برصغیر کی تحریک آزادی کے آخری بیس سال کے پس منظر میں ابھرتی ہے۔ "ایک گھر کے آنگن" میں اس ہنگامہ خیز دور کے سیاسی محرکات کو اس فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اس دور کی ایک محسوساتی تاریخ مرتب ہو جاتی ہے۔ ایک ہی آنگن میں رہنے بسنے والے اس ناول کے کردار آپس میں سیاسی نظریاتی اختلافات رکھتے ہیں، کوئی مسلم لیگ کا حامی ہے تو کوئی کانگریس کا، کوئی انگریزوں کے خلاف ہے تو کوئی ان کا مداح اور اس کشاکش میں محبت کے جذبات بھی پرورش پاتے ہیں اور نفرت کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ یوں یہ کہانی ہندوستان کے ایک آنگن سے نکل کر پاکستان کے دوسرے آنگن میں ختم ہو جاتی ہے، جو اپنے دامن میں آزادی کے نئے

---

[۱] ڈاکٹر قمر رئیس اردو افسانہ اردو ناول سالنامہ جامعہ (۱۹۶۱ء کے اردو ادب کا جائزہ) ص ۳۰۔

افق سے طلوع ہو چکا تھا۔ خدیجہ مستور نے جس خوب صورتی سے اس عہد کی تصویر کشی کی ہے وہ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

کرشن چندر کے ناول "میری یادوں کے چنار" اور گدھے کی واپسی" ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ "میری یادوں کے چنار" میں بڑے دلکش انداز میں یادوں کے تانے بانے سے کرشن چندر نے رومان اور حقیقت کو یکجا کیا ہے اور اپنے مخصوص رومانی انداز میں بچپن کی یادوں کے دھاگوں کو جوڑ کر ایک ایسا مرکزی خیال پیش کیا ہے جو "کسی ہندو کو مسلمان پر یا کسی مسلمان کو کسی ہندو پر اور کسی انسان کو دوسرے انسان پر ظلم کرنے کے خلاف آمادہ کرتا ہے"۔ یہ ناول بہت دلچسپ ہے لیکن تکنیک اور وسعت کے اعتبار سے اسے ناولٹ کہنا زیادہ مناسب ہوگا، دوسرا ناول ۱۹۱ صفحات پر مشتمل ہے جس میں ایک گدھے کے علامتی روپ میں طنز سے بھرپور سے وہ بات کہہ دی گئی ہے جو بظاہر آسان نہ تھی، اس طرح کرشن چندر نے فنی ابلاغ کے لئے راہ کشادہ کر دی ہے۔ دونوں کتابوں کے گرد پوش خوب صورت ہیں۔

کرشن چندر کے پرانے ناولوں میں اس سال آئینہ ادب لاہور سے "شکست" اور مکتبہ افکار سے "ایک عورت ہزار دیوانے" کے نئے ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔

عصمت چغتائی کا نیا اور تیسرا ناول "معصومہ" اس سال نیا ادارہ، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس ناول میں اعلیٰ سوسائٹی کی ایک ایسی لڑکی کا المیہ پیش کیا گیا ہے جو زوال حیدر آباد کے بعد ریاست سے نکل کر اپنی ماں کے ساتھ بمبئی میں رہنے پر مجبور ہوتی ہے۔ اس شہر کے گناہ پرست معاشرے میں اس کی ماں کو ایک نئی جنت کی تلاش تھی۔ معصومہ ابھی معصوم تھی اور عمر کی اس منزل میں بدکاریوں کا شکار ہو چکی تھی جب وہ گناہ کے لفظ اور تصور سے بھی نا آشنا تھی۔ یوں مسمار ہوتی ہوئی زندگی کا گھناؤنا پن جب اس پر واضح ہوا تو وہ بہت دور نکل چکی تھی اور نجات کی ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں عصمت نے زبان کا جادو معصومہ میں بھی اس طور پر جگایا ہے کہ بے اختیار انھیں اردو زبان کی سب سے بڑی ساحرہ کہنے کو جی چاہتا ہے لیکن فنی اعتبار سے یہ ناول "ٹیڑھی لکیر" سے بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ غالباً یہ ناول ہندوستان میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

اسی سال انتظار حسین کا ایک مختصر ناول "دن اور داستان" کے نام سے "ادارۂ ادبیاتِ نو" لاہور سے شائع کیا ہے۔ دراصل یہ ناول ان کی دو مختلف تحریروں کا مجموعہ ہے جسے موضوع اور ماحول کی یگانگت کی وجہ سے یکجا کر دیا گیا ہے۔ "دن" میں ایک ایسی کہانی پیش کی گئی ہے جس کے کردار ایک ہی کنبے کی تین نسلوں سے ترتیب پاتے ہیں۔ ان کا ماضی ان سے منقطع ہو چکا ہے اور حال میں ان کے لئے کوئی سہارا نظر نہیں آتا۔ دوسری تحریر "جل گرجے" ایک داستان ہے جو چہار درویش کی زبان میں لکھی گئی ہے اس میں علامتی کرداروں کے روپ میں مسلمانوں کی سولہ سالہ جد وجہد کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ ان دونوں کہانیوں کے آغاز اور انجام بظاہر الگ ہوتے ہوئے بھی ایک ہی زنجیر کے دو باب نظر آتے ہیں۔ گزشتہ دو تین برسوں میں انتظار حسین نے اردو داستانوں کی علامتی وسعتوں کو اپنی تحریروں کے ذریعے نئی زندگی بخشی ہے۔ زیرِ نظر ناول میں بھی داستان کا حصہ اس امر کی نشان دہی کرتا ہے۔

ان ناولوں کے علاوہ جمیلہ ہاشمی کے ناول "تلاشِ بہاراں" (جسے ۱۹۶۱ء کا آدم جی ادبی انعام ملا تھا) کا دوسرا ایڈیشن اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوا ہے۔ سلطان حسین اینڈ سنز نے عبدالحلیم شرر کا ناول "یوسف و نجمہ" پروفیسر حبیب اللہ غضنفر کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ مکتبہ افکار کراچی نے جیرالڈ کنڈی پیاری کا پہلا ناول "ایک بوند لہو کی" اسی سال شائع کیا ہے۔ عبدالحمید رضا حسین کے ناول "قطرہ سے گہر ہونے تک" کا پاکستانی ایڈیشن "آئینہ ادب" لاہور سے چھپا ہے۔ "مکتبہ ادبیاتِ نو لاہور کا سال تیسرہ کا دوسرا ناول "زخم کھلنے کے بعد" ہے جسے ریاض جاوید نے لکھا ہے۔ اس سال اے حمید کے بھی چار ناول شائع ہوئے ہیں۔ "پھول کی واپسی" ایوان پبلیکیشنز کراچی سے "چیتے کا پنجرہ" اور "پھول گرتے ہیں" خالد بک ڈپو لاہور سے اور "پیپل والی" رائٹرز ایمپوریم لاہور سے۔ اے حمید قیامِ پاکستان کے بعد ایک چمکتے ہوئے ستارے کی طرح آسمانِ ادب پر نمودار ہوئے تھے لیکن اب وہ اپنی اس بلندی سے تیزی کے ساتھ گر رہے ہیں۔

ناولوں کی اس بڑھتی ہوئی اشاعت اور عام مقبولیت سے مختصر افسانے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ سالِ گذشتہ کی طرح اس سال بھی افسانے لکھے گئے، ادبی رسائل میں شائع ہوئے۔ البتہ ان کے مجموعوں کی اشاعت اس سال بھی کم رہی۔ یہ رجحان بھی خاصا تشویشناک ہے کہ افسانوں کے

مجموعے اب بہت سست رفتاری سے فروخت ہوتے ہیں۔ یہ صورت حال صرف ہمارے یہاں ہی نہیں ہے بلکہ اس قسم کا رجحان امریکہ میں بھی عام ہوتا جا رہا ہے اور اب وہاں بھی خاصے معقول افسانہ نگاروں کو اپنی تصانیف کے لئے ناشر نہیں ملتے۔

اس سال افسانوں کا صرف ایک قابلِ ذکر مجموعہ نظر سے گزرا ہے جسے "میگھ ملہار" کے نام سے لارک پبلشرز، کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس میں ممتاز شیریں کے مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں۔

کفارہ، آندھی میں چراغ، بھارت ناٹیہ، آزاد نگارستان، دیپک راگ اور میگھ ملہار۔ ان میں ممتاز شیریں کا لکھا ہوا ۵۳ صفحات کا ایک جامع دیباچہ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے تکنیک اور اس کی تخلیق میں وحدت اور یکا نگت پر بحث کرتے ہوئے "اپنی نگریا" سے لے کر "میگھ ملہار" تک کے افسانوں کے فنی ابلاغ کا ذکر کیا ہے اور بعض افسانوں کے فنی پس منظر کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس میں ان کا وہ افسانہ (بھارت ناٹیہ) بھی شامل ہے جو اردو ادب میں فسادات کے موضوع پر کافی دنوں تک بحث کا موضوع بنا رہا۔ "دیپک راگ" "ایک قوس قزحی افسانہ ہے" جس میں ایک ہی موضوع سے سات مختلف افسانے یوں پھوٹے ہیں جیسے ایک ہی رنگ کی روشنی سے سات مختلف رنگ پھوٹتے ہیں"[1] یہ افسانہ فنی اعتبار سے ایک نیا اور اہم تجربہ ہے۔ "میگھ ملہار" میں بھی اسی طرح کے کئی تجربے کئے گئے ہیں۔ یہ کہانی بھی چار حصوں پر مشتمل ہے اس کا دوسرا اور تیسرا حصہ سرسوتی دیوی اور آرفیوس یوریڈس کی اساطیر سے ترتیب پاتا ہے۔ کہانی کا پہلا حصہ نیل کمل بہت خوب صورت ہے لیکن آخری حصہ اس حسن کو برقرار نہ رکھ سکا۔ اس مجموعے کی مکمل اور خوب صورت کہانی "کفارہ" ہے جسے ادارہ "ہم قلم" نے ۱۹۶۲ء کے بہترین افسانہ کا انعام بھی دیا ہے۔[2]

ہاجرہ مسرور کے افسانوں کا مجموعہ "چوری چھپے" کا نیا اڈیشن اس سال بک کارپوریشن کراچی نے خوب صورت گرد پوش کے ساتھ شائع کیا ہے۔

---

[1] ممتاز شیریں۔ میگھ ملہار (دیباچہ) ص ۳۷۔

[2] قومی زبان، ۲۲، ۴، ۱۶ر فروری ۱۳۶۳ء ص ۱۲۔

پرانے لکھنے والوں میں احمد ندیم قاسمی، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کے افسانے اس سال بھی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ نئی پود کے بعض لکھنے والوں کے فن میں زیادہ پختگی آ گئی ہے۔ ان میں صادق حسین اور جمیل الدین احمد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ خلیل احمد، ابن الحسن، غلام علی چودھری اور باقر علیم سے بھی اچھے اور بہتر افسانے لکھنے کی توقعات ہیں۔ بعض نئے لکھنے والوں نے مسلسل افسانے لکھ کر ہمیں اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ ان میں رضیہ فصیح احمد، حمید کاشمیری اور غلام ثقلین نقوی قابل ذکر ہیں۔

اسی سال لوک کہانیوں کے بھی دو مجموعے شائع ہوئے ہیں "چناب سے بدما تک" پاکستان کی عوامی کہانیوں کا تیسرا ایڈیشن ہے جسے ادارۂ مطبوعات پاکستان نے کراچی سے شائع کیا ہے کاغذ اور طباعت عمدہ ہے۔ دوسرا مجموعہ انجم قزلباش کی تصنیف ہے جسے "بلوچوں کے رومان، لوک کہانیاں اور شخصیات" کے نام سے فلات پبلشرز مستونگ نے شائع کیا ہے۔ رومان کا حصہ منظوم کہانیوں سے ماخوذ ہے۔

ڈرامہ کو کسی نے "اردو ادب کا سب سے ویران گوشہ کہا ہے"۔ اس بیان میں مبالغہ نہیں۔ "انارکلی" (امتیاز علی تاج) "باپ کا گناہ" (حکیم احمد شجاع) اور "نقش آخر" (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی) کے بعد جیسے مکمل ڈراموں کا دور گزر گیا ہو فلموں کی بڑھتی ہوئی عوامی مقبولیت نے برے بھلے اسٹیج کو ختم کر دیا ___ ریڈیو نے ڈرامہ کو نئے قالب میں ڈھال دیا اور "کان" حواس خمسہ کا بدل بن گئے ___ بدقسمتی سے پاکستان میں کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے طلبہ شوقیہ (امیچر) اسٹیج اور اداکاری کو مختلف حالات کے تحت اپنا نہ سکے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اردو ڈرامہ کے عہد حاضر کو بڑی حد تک رودار بنایا۔ لیکن اب وہ بھی اردو ڈرامہ سے روٹھ گئے ہیں۔ جاوید اقبال، ناصر شمسی نئے امکانات کی نوید بن کر آئے۔ لیکن نہ جانے کن دھندلکوں میں کھو گئے۔ قیام پاکستان کے بعد صرف مرزا ادیب نے اردو ڈرامہ کی خدمت تسلسل اور لگن کے ساتھ کی ہے، مگر ان کا دائرہ بھی بڑی حد تک یک بابی ڈراموں تک محدود رہا ہے۔

یک بابی ڈراموں کا ایک نیا مجموعہ اس سال "ہم لوگ" کے نام سے بک کارپوریشن کراچی نے شائع کیا ہے۔ یہ ہاجرہ مسرور کے چھ ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ لیکن پھر بھی ان میں بھرپور ڈرامائی قوت کا احساس

ہوتا ہے۔ عام روش پر لکھے جانے والے ڈراموں سے یہ کچھ مختلف ڈرامے ہیں اس لئے کہ نہ تو یہ ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں اور نہ ہی ان میں مغربی تصانیف کا چربہ ہے۔ ان ڈراموں میں نوری خالہ، دشنک تہہ خانہ، کھلی کھڑکیاں، وہ لوگ اور فاطمہ شامل ہیں۔ "وہ لوگ" اس مجموعہ کا سب سے کامیاب اور موثر ڈرامہ ہے جس میں ایک گورکن خاندان کی زندگی کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جو دوسروں کی موت پر خوش ہوتا ہے لیکن جب موت اس خاندان میں داخل ہوتی ہے تو موت پر خوش ہونے والا یہ گھرانہ اس المیہ سے روشناس ہوتا ہے جس سے اس کا اب تک دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان ڈراموں میں ادبی محاسن کے علاوہ اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ کھیلے جانے کی صلاحیتیں بھی موجود ہیں۔ ہمارے ادب میں یہ ڈرامے ہاجرہ کی تیسری منزل کے افسانوں کی طرح قابل قدر اضافہ ہیں۔ گردپوش خوبصورت ہے لیکن طباعت پر اور توجہ کی ضرورت تھی۔

مرزا ادیب کی تازہ ترین تمثیل "شیشے کی دیوار" بھی اسی سال الجدید لاہور سے شائع ہوئی ہے "شیشے کی دیوار" پہلے یک بابی تمثیل کی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہو چکی تھی۔ اسی مقبولیت کے پیش نظر اسے پھیلا کر تین بابی تمثیل کی شکل میں زیر نظر کتاب میں پیش کیا گیا ہے۔ اس وسعت کے باوجود ڈرامے کے تاثر اور دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اسٹیج پر کھیلے جانے سے اس ڈرامے کے فنی محاسن بہتر طور پر واضح ہو سکیں گے۔ کیونکہ زیر نظر کتاب میں اسٹیج ٹیکنک کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔

قیوم نظر جو ایک شاعر کی حیثیت سے اردو ادب میں متعارف ہیں، ان کے ڈراموں کا ایک مجموعہ "ہم صفیر" بھی اس سال اردو بک اسٹال، لاہور سے شائع ہوا ہے۔ یہ مجموعہ پانچ ریڈیائی ڈراموں پر مشتمل ہے یہ ڈرامے متعدد بار مختلف ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہو چکے ہیں۔ اور ان میں سے بعض (مرغی، اور من کی جیت) ادبی دنیا اور (خوش فکریے) ہمایوں میں شائع بھی ہو چکے ہیں بقیہ ڈراموں میں 'کوچ' اور 'ڈاکٹر منجھ' شامل ہیں۔ ہر چند یہ ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے گئے ہیں۔ لیکن ان میں اسٹیج ٹیکنک برتنے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

'کالا سورج'، عشرت رحمانی کی ایک تین بابی تمثیل ہے جسے آئینہ ادب لاہور نے ۱۹۶۲ء

میں شائع کیا ہے عشرت رحمانی پچھلے کئی سالوں سے اچھے ریڈیائی ڈرامے لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر تمثیل اسٹیج کی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے لکھی گئی ہے اور اس میں ہمارے قومی معاشرے کے جانے پہچانے کرداروں کی نمائندگی کی گئی ہے۔ مکالمے برجستہ اور دلچسپ ہیں کہیں کہیں البتہ بیت غیر واقعاتی معلوم ہوتے ہیں۔

منظوم تمثیلوں میں "برگ خزاں" عبدالعزیز خالد کی تین منظوم تمثیلوں کا مجموعہ ہے جسے اس سال مطبوعات مشرق، کراچی نے عمدہ ٹائپ میں، اچھے کاغذ پر چھاپا ہے۔ ادھر چند سالوں سے عبدالعزیز خالد اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ کر رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی ان کی ایک کامیاب کوشش ہے جس میں "قابیل"، "فلکناز" اور "آشور بنی پال" نامی تمثیلیں شامل ہیں پہلی تمثیل میں قابیل کی خدا سے بغاوت کو ایک نئے انداز میں پیش کیا گیا ہے اور تیسری تمثیل قدیم تاریخ کے واقعات سے ترتیب پائی ہے۔ ہر تمثیل اس طرح الگ الگ ہونے کے باوجود اپنے مرکزی خیال کی وحدت کی وجہ سے ایک دوسرے سے مربوط بھی ہو جاتی ہے۔ اور یہی کتاب کی بڑی خوبی ہے۔ ممکن ہے کہ بہت سے نقاد اور پڑھنے والے ان منظوم تمثیلوں کو تمثیلی نظمیں ہی قرار دیں اور مکمل تمثیل تسلیم نہ کریں۔

ڈراموں کے اس تبصرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۹۶۲ء میں اسٹیج ٹیکنک پر بھی خاصی توجہ دی گئی ہے۔ یک بابی اور منظوم تمثیلوں میں بھی نئے تجربوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ زیر نظر کتابوں کے علاوہ اردو رسائل میں بھی ڈرامے باقاعدگی سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں مرزا ادیب کا ڈرامہ "حیلہ" اس سال ادارۂ ہم قلم کا ادبی انعام پا چکا ہے[۱]۔ ادارۂ تعمیر نو پاکستان نے بھی مندرجہ ذیل ڈراموں پر انعامات دیئے ہیں[۲]۔

آغا ناصر - گھر کی رونق
انور عنایت اللہ - صبح کا بھولا
رحیم گل - خونی چٹان

---

[۱] قومی زبان ۲۲:۴ - ۱۶ فروری ۶۳ء ص ۱۲۔ [۲] قومی زبان: ۲۲: ۱ یکم جنوری ۶۳ء - ص ۲۱ -

اس سال طنز و مزاح کے باب میں کسی قابل قدر کتاب کا اضافہ نہیں ہوا۔ البتہ شوکت تھانوی کی دو کتابیں "بیوی بیگم" اور "سم زلف" لارک پبلشرز، کراچی سے شائع ہوئی ہیں ـــ اس کمی کے باوجود ۱۹۶۲ء میں چراغ تلے (مشتاق احمد یوسفی) ادبی مجلسوں اور رسالوں کا موضوع بحث بنا رہا ہے اور یہ باغ و بہار کتاب ۱۹۶۱ء کی مطبوعات میں شامل ہونے کے باوجود نئی نئی سی لگتی ہے۔

۱۹۶۲ء میں تنقیدی کتابوں کی اشاعت کو بھی خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ نئی مطبوعہ کتابوں میں فیض احمد فیض کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "میزان" "ناشرین، لاہور نے شائع کیا ہے، اس کتاب میں فیض کے ۳۱ مضامین شامل ہیں، جن میں بیشتر آج سے ۲۰، ۲۵ سال پہلے لکھے گئے تھے۔ کتاب کی ترتیب چار حصوں میں کی گئی ہے۔ پہلا حصہ "نظریہ" سے متعلق ہے۔ اس حصہ میں جو مضامین شامل ہیں، "انقلاب"، ادب کا ترقی پسند نظریہ، ادب اور جمہور، ہماری تنقیدی اصطلاحات، فنی تخلیق اور تخیل، اور "موضوع اور طرز ادا" قابل ذکر ہیں۔ دوسرا حصہ "مسائل" کے عنوان سے ذیل کے مضامین پر مشتمل ہے:

پاکستانی تہذیب کا مسئلہ، جہان نو ہو رہا ہے پیدا۔ اردو شاعری کی پرانی روایتیں اور نئے تجربے، جدید فکر و خیال کے تقاضے اور غزل، جدید اردو شاعری میں اشاریت اور ادب اور ثقافت، وغیرہ۔

تیسرا حصہ متقدمین کی شاعری اور ادب سے متعلق ہے جس میں یہ مضامین شامل ہیں:
نظیر اور حالی، غالب اور زندگی کا فلسفہ، اردو ناول، رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری، شرر اور پریم چند، آخری حصہ معاصرین کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں فیض کے وہ مضامین اور دیباچے شامل ہیں جو اقبال، جوش، مجاز، سیف الدین، میراجی، ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے فن اور ان کی کتابوں پر لکھے گئے ہیں۔ پطرس بخاری پر لکھا ہوا ایک خاکہ بھی اسی حصے میں شامل ہے۔

شعر اور غزل کے نام سے مجنوں گورکھپوری کے تنقیدی مضامین کا ایک انتخاب ادبی اکیڈمی، کراچی نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب میں یہ مضامین شامل ہیں، شعر اور غزل، غزل اور عصر جدید"

ادب اور ترقی، اور نیا ادب کیا ہے؟ جدید اردو تنقید میں مجنوں اپنی عالمانہ فکر اور ذہنی توازن کے لئے مشہور ہیں۔ یہ مضامین عملی اور نظریاتی تنقید کے اعلیٰ نمونے ہیں جن سے مجنوں کی وسعت نظر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی نے ڈاکٹر عبدالعلیم نامی کی کتاب اردو تھیٹر کے نام سے اسی سال شائع کی ہے۔ اردو ڈرامے پر یہ پہلی جامع اور مستند کتاب ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی دو جلدیں اب تک ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ڈاکٹر نامی نے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کو نظر ثانی کے بعد اس کتاب میں پیش کیا ہے۔ پہلی جلد میں ابتدائی ڈرامہ نگاری سے بحث کی گئی ہے اور دوسری جلد میں ۱۸۵۳ء سے ۱۹۲۰ء تک کے ڈراموں اور ڈرامہ نگاروں کا تذکرہ ہے اس طرح تیسری جلد کے شائع ہو جانے کے بعد ۱۹۶۰ء تک کے اردو ڈراموں کی ایک مکمل اور مستند تاریخ مرتب ہو جائے گی۔ تحقیقی اعتبار سے یہ کتاب انتہائی قابلِ قدر ہونے کے باوجود کسی واضح تنقیدی شعور اور نقطۂ نظر کا پتہ نہیں دیتی۔

اس سال اردو رباعی کے فنی اور تاریخی ارتقاء پر فرمان فتح پوری کی کتاب "اردو رباعی" مکتبۂ سنگ میل کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی مکمل اور تحقیقی تصنیف ہے جس میں رباعی کے فنی لوازم و خصوصیات، فارسی رباعی کا آغاز و ارتقاء، اردو رباعی کا آغاز اور اس کے ارتقاء کی مختلف منزلوں اور اردو رباعی کی اہمیت اور اس کے مستقبل پر بحث کی گئی ہے۔ اس موضوع پر مصنف کے کچھ مضامین ۱۹۵۸ء سے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں جو بالآخر زیرِ نظر کتاب کی بنیاد بنے۔ رباعی کے فنی لوازم پر جس وقتِ نظر سے بحث کی گئی ہے وہ ہماری عملی تنقید میں بڑی حد تک نظر نہیں آتی۔

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی کی کتاب "اردو کی ادبی تاریخ کا خاکہ" بھی اس سال اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوئی ہے اس مختصر جائزہ میں اردو ادب کی تحریکات اور رجحانات کا نقش واضح ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نے تاریخی ترتیب کے ساتھ مصنفین کے نام پیش نہیں کئے ہیں بلکہ ادبی تاریخ کو ایک وحدت کی طرح مرتب کیا ہے۔

پروفیسر اختر انصاری کی کتاب "حالی اور نیا تنقیدی شعور" بھی اسی ادارے سے شائع ہوئی ہے یہ ۱۹ صفحات پر مشتمل ہے جس میں حالی کے تنقیدی شعور کا تجزیہ بقول مصنف ایک نئے زاویے سے کیا گیا ہے یہ حصہ اختر انصاری کے تنقیدی مضامین کے زیر طبع مجموعہ "مطالعہ و تنقید" میں بھی شامل ہے لیکن مقالہ کی افادی حیثیت کے پیش نظر اسے ایک علیحدہ کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سید شاہ علی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ادب اور تنقید" بھی مکتبۂ اسلوب، کراچی سے شائع ہوا ہے جس میں پچھلے بیس سالوں میں لکھے ہوئے مصنف کے مضامین شامل ہیں اس مجموعہ کے چند مضامین یہ ہیں۔ سرسید کے ادبی مضامین، شرر کے انشائیوں پر ایک نظر، مشرق و مغرب میں سوانح نگاری، کنٹری ادب وغیرہ۔

تنقیدی مضامین کا ایک اور مجموعہ "نئی نظم اور پورا آدمی" ادبی اکیڈمی، کراچی نے شائع کیا ہے اس مجموعہ میں سلیم احمد کے یہ مضامین شامل ہیں، نئی نظم اور پورا آدمی، غزل مقلد اور ہندوستان، غالب اور نیا آدمی، عشق اور قحط دمشق، اس مجموعہ کا بنیادی مضمون "نئی نظم اور پورا آدمی" ہے اور باقی مضامین میں اسی مضمون کے مرکزِ خیال کو وسعت دی گئی ہے۔ صاحبِ کتاب نے یہ مضامین اختلاف کی توقع پر لکھے ہیں کیونکہ ان کے الفاظ میں "پڑھنے والا صرف مردہ خیال سے اختلاف نہیں کرتا" اور ان کی توقع پوری ہوگئی۔ کتاب کے ابتدائیہ میں سلیم احمد کی ذہنی الجھنوں کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے جس کا اظہار انھوں نے خود کیا ہے "میں نے خود بھی یہ مضامین بہت اضطراب کی حالت میں لکھے ہیں"[۱]۔

تاثرات و تعصبات کے نام سے نظیر صدیقی کے تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ شعبۂ تحقیق و اشاعت مدرسہ عالیہ، ڈھاکہ سے ٹائپ میں شائع ہوا ہے۔ ۲۱۶ صفحات پر پھیلی ہوئی بڑے سائز کی اس کتاب کے پہلے ۹ مضامین میں یگانہ چنگیزی، فراق گورکھپوری، فیض احمد فیض، جمیل الدین عالی، اجتبیٰ رضوی، جگر مرادآبادی، ناسخ، رشید احمد صدیقی کے فن اور ان کی تخلیقات پر تاثرات اور تعصبات کے انداز میں تنقید کی گئی ہے۔ آخری دو مضامین میں منٹو کی شخصیت نگاری (گنجے فرشتہ کی روشنی میں)

---

[۱] سلیم احمد نئی نظم اور پورا آدمی (ابتدائیہ) ص ۷۔

اور شہرت کی خاطر" انشائیہ سے متعلق تنقیدوں پر بحث کی گئی ہے نظیر صدیقی کے مضمون کچھ اپنی صفائی میں" کا بیشتر حصہ "ادبی دنیا" کے شمارہ نمبر ۹ میں بحث و نظر: انشائیہ کیا ہے ؟ کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ اس بحث میں غلام جیلانی اصغر اور ڈاکٹر وزیر آغا بھی شامل تھے۔ نظیر صدیقی اچھی نثر لکھنے کا گر جانتے ہیں کاش ان میں ذمہ داری کا احساس اور پیدا ہو جائے اور یہ احساس ان کے طرز تحریر کو متاثر بھی نہ کرے۔

محمد حسین آزاد کی مشہور تصنیف "نیرنگ خیال" کا ایک نیا ایڈیشن اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے ڈاکٹر اسلم فرخی کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اسلم فرخی نے اپنے مقدمے میں نیرنگ خیال" سے متعلق بعض نئے اور اہم نکات کا انکشاف کیا ہے۔ اس کتاب کا ایک سستا ایڈیشن بھی اسی ادارے نے شائع کیا ہے۔ اسی کتاب کا ایک سستا اور خوب صورت ایڈیشن بغیر مقدمے کے بیدا ینڈ بید کراچی سے شائع ہوا ہے۔

"تحریر اور تنقید" کے نام سے ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں کے ادبی اور تنقیدی مضامین کا ایک نیا مجموعہ حیدر آباد (پاکستان) سے حکیم محمود الزماں نے شائع کیا ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ، ڈاکٹر شوکت سبزواری کی نئی کتاب" لسانی مسائل" اسی سال مکتبہ اسلوب کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف لسانیات کے ماہر ہیں اور پچھلے کئی سال سے اردو کے لسانی مسائل پر تحقیقی مضامین لکھ رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں قواعد و لسانیات، زبان اور رسم الخط اور لفظی تحقیق سے متعلق ۲۰ مقالے شامل ہیں۔ ان مقالات میں نہ صرف اردو زبان کے مسائل پر بحث کی گئی ہے بلکہ اس کے اہم تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے موضوع کے اعتبار سے یہ ایک اہم تصنیف ہے۔

اس سال جو ادبی اور تنقیدی تصانیف منظر عام پر آئی ہیں ان میں چند ایسی بھی ہیں جن پر سن طباعت ۱۹۶۱ء درج ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ سال کے آخری مہینوں میں شائع ہونے والی کتابوں میں اکثر کی سیاہی بھی خشک ہونے نہیں پاتی کہ نیا سال شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی کتابوں میں ڈاکٹر شوکت سبزواری کی دو کتابیں" نئی پرانی قدریں" اور "معیار ادب" بھی شامل ہیں۔ دونوں کتابیں

مکتبۂ اسلوب کراچی سے شائع ہوئی ہیں۔ سید وقار عظیم کی کتاب "فن افسانہ نگاری" بھی اسی ضمن میں آتی ہے جس کا ترمیم و اضافہ شدہ اڈیشن اردو مرکز لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس طرح کی چوتھی کتاب ڈاکٹر عبادت بریلوی کے تنقیدی مضامین "تنقیدی زاویے" کا نیا اضافہ شدہ ایڈیشن ہے۔ یہ کتاب اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے چھپی ہے اور نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کی طرف سے حسن طباعت کی سند امتیاز بھی پا چکی ہے[۱]۔ پانچویں کتاب "ادب اور شعور" کے نام سے اردو اکیڈمی سندھ کراچی نے شائع کی ہے جس میں ممتاز حسین کے تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ ایک مختصر سی کتاب عبدالسلام کی ہے جو فن ڈرامہ نگاری: درانارکلی" کے نام سے مکتبۂ نظامیہ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ ان کتابوں کا سرسری تذکرہ تھا جو نظر سے گذر چکی ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہو سکتی ہیں جو حسن طباعت کی اس پیچیدگی کی وجہ سے یہاں تذکرے سے رہ گئی ہوں۔ ہمارے ناشر اگر معمولی توجہ فرمائیں تو یہ الجھنیں ختم ہو سکتی ہیں۔

بابائے اردو کی تصانیف میں اس سال ایک کتاب "مرحوم دہلی کالج" انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ مولوی صاحب کی مشہور اور اہم کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۵ء میں ہندوستان سے شائع ہوا تھا اور ایک عرصے سے کمیاب بلکہ نایاب تھا۔ مولوی صاحب کی دو اور کمیاب کتابیں "انتخاب داغ" اور "اردو صرف و نحو" بھی اسی سال اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوئی ہیں۔ ان کتابوں پر بھی سن طباعت ۱۹۶۱ء درج ہے۔ لیکن یہ کتابیں سال زیر تبصرہ میں بازار میں آئیں۔ اس سال بابائے اردو پر بھی دو کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ان میں ایک "افکار عبدالحق" ہے اور دوسری "بابائے اردو دادئ مہران میں"۔ اول الذکر کتاب میں آمنہ صدیقی نے مولوی صاحب کی تحریروں کا انتخاب اس محنت اور سلیقہ سے کیا ہے کہ ادب اور شعر، اسلوب بیان، تنقید و تحقیق، لسانیات، حیات و کائنات اور مذہب اور سائنس کے بارے میں ان کے افکار و خیالات کی بڑی حد تک نشان دہی ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ایک ایسا مجموعہ ہے

---

[۱] قومی زبان - ۲۲: ۴ - ۱۶ فروری ۱۹۶۳ء - ص ۱۲۔

جن سے مرحوم کی ہمہ گیر شخصیت کے ذہنی نقوش اجاگر ہو جاتے ہیں۔ یہ کتاب ٹائپ میں اردو اکیڈمی سندھ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتاب بابائے اردو کے غیر مطبوعہ خطبات (بسلسلہ اردو کانفرنس سندھ) اور خطوط کا مجموعہ ہے۔ جسے آفاق صدیقی نے مرتب کیا ہے اور ادارۂ مصنفین (ذیلی حلقہ سکھر) نے شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں خان رشید، مظہر جمیل اور مبارک حسین سرور کے مضامین بھی شامل ہیں۔ ادارۂ مصنفین کی شاخ سکھر نے ایک اور کتاب "ریگزار کے موتی" کے نام سے شائع کی ہے جس میں وادیٔ مہران کے ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کا انتخاب شامل ہے۔ اس مجموعے کو بھی آفاق صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو پاکستان) کا ایک خاص شمارہ "بابائے اردو نمبر" اسی سال شائع ہوا ہے جسے وقار عظیم نے مرتب کیا ہے۔ اس نمبر میں بابائے اردو کی شخصیت، ان کے فن اور ان کی تصانیف پر ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر اعجاز حسین، دیوان سنگھ مفتون، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ، ڈاکٹر عبادت بریلوی، حامد اللہ افسر میرٹھی اور دوسرے مشہور اہلِ قلم کے مضامین شامل ہیں۔ یہ نمبر ۳۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ بابائے اردو کے کچھ غیر مطبوعہ خطوط بھی اس میں شامل ہیں۔

اقبالیات پر اس سال کوئی نئی کتاب شائع نہیں ہوئی۔ البتہ "فلسفہ اقبال" (مرتبہ بزم اقبال، لاہور) اور "فکرِ اقبال" (ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم) کے نئے ایڈیشن بزم اقبال، لاہور نے شائع کئے ہیں۔ اس سال "نگار" کا اقبال نمبر (سالنامہ) بھی شائع ہوا ہے جس میں اقبال کی غنائی شاعری، حیات معاشقہ اور ان کے ذہنی ارتقا، سیاسی رجحانات اور فلسفۂ خودی پر نیاز فتحپوری، احتشام حسین، جگن ناتھ آزاد، ہنس راج رہبر، محمد عظیم فیروز آبادی، غلام ربانی عزیز، سید جعفری، اور فرمان فتحپوری وغیرہ کے مضامین شامل ہیں۔ علامہ اقبال کی دو تصانیف کے سندھی اور انگریزی ترجمے بھی اسی سال شائع ہوئے ہیں۔ "ارمغان حجاز" کا سندھی ترجمہ لطف اللہ بدوی نے کیا ہے، جسے اقبال اکیڈمی، کراچی نے شائع کیا ہے۔ جاوید نامہ منظوم انگریزی ترجمہ "پل گرمیج آف ایٹرنٹی" کے نام سے شیخ محمود احمد نے کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور سے شائع ہوا ہے۔

تحقیق و تنقید کی کتابوں کے ساتھ ہی ساتھ خطوط کے مجموعے اور خاکے بھی اس سال شائع ہوئے ہیں۔ "منٹو کے خطوط، ندیم کے نام" کتاب نما، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اور "مکتوب الیہ

احمد ندیم قاسمی نے مرتب کیا ہے۔ اس میں منٹو کے تقریباً ۹۲ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے احمد ندیم قاسمی کو ۱۹۳۷ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیان لکھے تھے۔ پہلا خط اختر شیرانی کے نام ہے جو آگے چل کر زیر نظر کتاب کے خطوط کی بنیاد بنا۔ ان خطوں کی زبان سیدھی سادی اور عام فہم ہے۔ ان میں ٹیگور، گوپی ناتھ، خوشیا اور بابو قانون کے سے عظیم فن کاروں کی جھلکیاں تو نہیں لیکن یہ خطوط منٹو کی داستان غم ضرور ہیں جن کے آئینہ میں منٹو کی شخصیت پوری طرح نکھر آتی ہے۔ "میں نے تمہیں اپنے ضمیر کی مسجد کا امام مقرر نہیں کیا ہے صرف دوست بنایا ہے۔"[۵] منٹو نے ۱۹۴۸ء میں ندیم سے کہا تھا۔ خود پسندی اس کی کمزوری تھی لیکن وہ ایک مخلص دوست بھی تھا اور یہی احساس اس کی خود پسندی کا باعث بھی تھا۔ ان خطوں میں اس کی شخصیت کے یہ مختلف رنگ قوس قزح کا روپ دھار لیتے ہیں۔ زیر نظر خطوط میں منٹو اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں کا ذکر بھی کرتا ہے اور بے ساختگی سے ان کے فن کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کرتا ہے۔

دوسرا مجموعہ فراق گورکھپوری کے خطوط کا ہے جس میں فراق کے ۹۱ خطوط شامل ہیں جو انھوں نے محمد طفیل، مدیر نقوش لاہور کے نام لکھے تھے۔ یہ ۱۹۵۳ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان لکھے ہوئے خطوں کے جواب ہیں، جن میں مدیر نقوش نے فراق کی شخصیت، شاعری اور نظریات کے متعلق کچھ سوالات کئے تھے۔ فراق کو علم نہ تھا کہ ان خطوں کی اشاعت ہوگی۔ اس لئے ان کا انداز بیان بے تکلف اور بے ساختہ ہے۔ اس طرح یہ خطوط ایک دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں جس کے مطالعہ سے فراق کی شخصیت بغیر نوک پلک کی درستگی کے واضح ہوتی ہے۔ ابتدائی خطوں میں بچپن کے واقعات اور شخصیت کا پرتو ہے۔ بقیہ خطوں میں فراق نے اپنی عشقیہ، جمالیاتی، ترقی پسند اور مزاج اور لہجہ کی شاعری اور تاثیراتی تنقید سے بحث کی ہے۔ جگہ جگہ اپنے اشعار کا انتخاب بھی درج کیا ہے۔ ان خطوط کے ساتھ ہی فراق کا وہ مضمون بھی شامل ہے جو اسلامی ادب کی بحث کے سلسلے میں "نقوش" میں پہلے ہی شائع ہو چکا تھا اور یہی مضمون زیر نظر کتاب کے آخری خطوں کی بنیاد بنا۔ کتاب کے

---

[۵] قاسمی احمد ندیم، مرتب۔ منٹو کے خطوط، ندیم کے نام (دیباچہ)، ص ۷۔

آخری حصے میں فراق کی شاعری پر محمود احمد کا ایک جامع اور سیر حاصل مضمون بھی شامل ہے۔

خطوں کا ایک تیسرا مجموعہ محمد عبید اللہ خاں خویشگی نے "بوستان قلم" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مکاتیب دو حصوں میں شائع کیے گئے ہیں۔ پہلے حصے میں داغ دہلوی، نظیر الحسن فوق، میر قطب الدین اشک، ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری کے خطوط شامل ہیں۔ جو مولانا مفتی حکیم محمد عبد الرحمٰن خاں فیروز کے نام ہیں۔ دوسرے حصے میں برصغیر کے مشہور اہل قلم کے تقریباً ۹۰ خطوط شامل ہیں جو عبید اللہ خاں خویشگی کے نام لکھے گئے تھے۔ بیشتر خطوط سوانحی ہیں جو مرتب نے اس خیال سے لکھوائے تھے۔ کہ ان تحریروں کے ذریعہ اردو زبان کے ارباب قلم کی ایک تاریخ مرتب کی جا سکے۔ زیر نظر کتاب میں خواجہ حسن نظامی، سر تیج بہادر سپرو اور غلام السیدین سے لے کر موجودہ دور کے مشہور ادیبوں اور فنکاروں (کرشن چندر، منٹو، پطرس وغیرہ) کے خطوط بھی شامل ہیں۔ سوانحی حالات کے ساتھ ہی ساتھ تصانیف کے حوالے بھی ان خطوں میں درج ہیں۔ مرزا داغ اور خواجہ حسن نظامی کے عکسی خطوط بھی اس میں شامل ہیں۔

شخصی خاکوں کی مقبولیت اب بڑھتی جا رہی ہے۔ پچھلے سال "عظمت رفتہ" (ضیاء الدین احمد برنی) کی غیر معمولی پذیرائی ہوئی۔ اس سال شاہد احمد دہلوی کے شخصی خاکوں کا مجموعہ "گنجینۂ گوہر" باغ و بہار بن کر آسمان ادب پر طلوع ہوا ہے۔ اس میں جہاں مولوی نذیر احمد دہلوی، میر ناصر علی، استاد بخود دہلوی، خواجہ حسن نظامی، بشیر الدین احمد دہلوی، مولانا عنایت اللہ، مرزا عظیم بیگ چغتائی، میراجی، منٹو، جگر مراد آبادی، حکیم کیف دہلوی، پروفیسر مرزا محمد سعید، استاد بندو خاں، ایم۔ اسلم، جوش ملیح آبادی اور جمیل جالبی کے دلچسپ اور اثر انگیز خاکے موجود ہیں، وہیں شاہد احمد دہلوی پر ان کا اپنا لکھا ہوا خاکہ بھی شامل ہے۔ شاہد احمد کی نثر میں دلی کے بانکوں کا سا بانکپن بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ اور پھر جانے پہچانے لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات کو دلی کی ٹکسالی زبان کے جادو سے جگایا تو یہ خاکے جیتی جاگتی تصویریں بن گئے۔ کہیں کہیں البتہ اثر اور تاثر کا جادو جگاتے جگاتے شاہد اپنے ہی جادو کا شکار ہو گئے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی، عظیم بیگ چغتائی، بیخود دہلوی وغیرہ ایسے خاکے ہیں جو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھے جائیں گے۔ جمیل جالبی کا ایک جامع مقدمہ بھی اس کتاب میں شامل ہے جو فن خاکہ نگاری پر ایک بصیرت افروز تبصرہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت پر بھی ایک کتاب "مولانا محمد علی بحیثیت تاریخ ساز" کے نام سے محمد سرور مرحوم نے مرتب کی ہے۔ یہ کتاب سندھ ساگر اکادمی، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں مولانا مرحوم کے مضامین، خطوط اور ان کی ایک نامکمل آپ بیتی سے انتخاب کئے گئے ہیں۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے مولانا کے کلام کا ایک مجموعہ "دیوان جوہر" کے نام سے اسی سال شائع کیا ہے۔ اس مجموعے کے مرتب نور الرحمن ہیں۔ زیر نظر کتاب میں مولانا مرحوم کا ابتدائی کلام شامل ہے اور وہ کلام بھی جو چھنڈواڑہ، کراچی اور بیجاپور کی قید کے زمانے میں لکھا گیا تھا۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی کا آخری مشورہ" کے نام سے مرحوم کا آخری خط جو انھوں نے وزیر اعظم انگلستان کو گول میز کانفرنس کے موقع پر لکھا تھا، کتابی مرکز لمیٹڈ کراچی سے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ مولانا شوکت مرحوم کا دیباچہ بھی اس کتابچہ میں شامل ہے۔ اس سال رئیس احمد جعفری نے محمد علی اکیڈمی قائم کی ہے اس ادارہ کا مقصد علی برادران اور تحریک آزادی کے رہنماؤں کی حیات و افکار کو پیش کرنا ہے۔

قائد اعظم محمد علی جناح کی زندگی پر بھی دو کتابیں اس سال شائع ہوئی ہیں۔ حیات محمد علی جناح کا ترمیم و اضافہ شدہ پاکستانی ایڈیشن "قائد اعظم اور ان کا عہد" کے نام سے رئیس احمد جعفری نے مقبول اکیڈیمی لاہور سے شائع کیا ہے۔ دوسری کتاب چودھری سردار محمد خاں عزیز کی تصنیف ہے جو "حیات قائد اعظم" کے نام سے، حسن برادرز، لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

آزاد ریسرچ انسٹیٹیوٹ (پاکستان) کے سلسلے کی پہلی کتاب امام الہند (تعمیر افکار) کے نام سے مکتبہ اسلوب، کراچی نے شائع کی ہے۔ ابو سلمان الہندی نے اس کتاب میں مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی کے حالات و واقعات کو مستند مآخذ کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ جگہ جگہ کتابوں کے حوالے بھی دیئے ہوئے ہیں۔ مولانا کے قریبی اعزا، اساتذہ اور دوسرے متعلقین کے حالات بھی اس کتاب میں درج ہیں۔ آخری حصہ میں مولانا موصوف کے ابتدائی دور کی منتخب تصانیف اور مضامین کی ایک فہرست بھی شامل ہے۔ اس سال مولانا آزاد کی تصانیف کے نئے ایڈیشن بھی شائع ہوئے ہیں۔ "ام الکتاب (سورہ فاتحہ کی تفسیر) شعاع ادب، لاہور اور "غبار خاطر" اور "تذکرہ" میری لائبریری، لاہور سے شائع ہوئی ہیں۔

مولانا ظفر علی خاں کی زندگی پر بھی ایک کتاب مکتبہ کارواں، لاہور سے شائع ہوئی ہے جسے اشرف عطا نے لکھا ہے۔ "مولانا ظفر علی خاں" ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ مشاہیر اسلام صوفیائے کرام اور اولیاء کے کئی تذکرے بھی اس سال شائع ہوئے ہیں ان میں عبدالرحمن طارق کی کتاب "مشاہیر اسلام موت کے آغوش میں" (دار البلاغ لاہور) حمید عسکری کی دو کتابیں "نامور مسلم سائنس داں" اور نامور مغربی سائنس داں" (مجلس ترقی ادب اردو، لاہور) اعجاز الحق قدوسی کی کتاب "تذکرہ صوفیائے پنجاب (سلمان اکیڈمی کراچی) سید نصیر احمد جامعی کی کتاب "بابا فرید شکر گنج" (ناشرین لاہور) محمد لطیف ملک کی کتاب "اولیائے لاہور" (سنگ میل پبلیکشنز، لاہور) علامہ مناظر حسن گیلانی کی کتاب "حضرت ابوذر غفاری کی سوانح عمری" کا نیا ایڈیشن نفیس اکیڈمی کراچی)، محمد ایوب قادری کی مرتب کی ہوئی مولوی محمد جعفر تھا۔ سینسری کی کتاب "تواریخ عجیب" (سلمان اکیڈمی، کراچی) اور فہیم الدین فہمی کی کتاب "سوانح حیات رستم زماں گاماں" (ادارہ تعمیر نو پاکستان، کراچی) شامل ہیں۔

اس سال جو سفر نامے شائع ہوئے ہیں ان میں رازق الخیری کی کتاب "دو ہفتے مشرقی پاکستان میں" (عصمت بک ڈپو کراچی) عرش تیموری کی کتاب "ایک سانولا گوروں کے دیس میں" (جاوید پبلیشرز کراچی) اور بیگم محمودہ عثمان حیدر کی کتاب "مشاہدات بلاد اسلامیہ" (ادارہ علم مجلسی کراچی) شامل ہیں۔ "دو ہفتے مشرقی پاکستان میں" قسط وار رسالہ عصمت میں (اگست ۱۹۶۱ تا جنوری ۱۹۶۲) شائع ہو چکا ہے۔ دوسری کتاب سفر نامہ امریکہ ہے۔ آخر الذکر سفر نامہ آج سے تیس سال قبل رسالہ تہذیب نسواں لاہور میں بالاقساط شائع ہو چکا ہے۔ اور اب دو حصوں میں کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ پہلے حصے میں سفر نامہ ہے اور دوسرے حصے میں حضرت ابو سلمان فارسی، حضرت حذیفہ الیمانی، حضرت جابر بن عبداللہ انصاری اور غوث الثقلین شاہ محی الدین عبدالقادر الحسنی الحسینی کے سوانحی خاکے بھی شامل ہیں "طلوع آفتاب کی سرزمین میں" کے عنوان سے اختر ریاض کا ایک نہایت خیال افروز سفر نامہ ادبی دنیا کے شمارہ نمبر ۹ میں شائع ہوا ہے۔ اس سفر نامے میں موصوفہ نے اپنے جاپان کے سفر کے مشاہدات اور تاثرات کو خوب صورتی کے ساتھ

قلم بند کیا ہے۔ یہ سفر نامہ ان تمام نکات و لطائف سے سر بسر معمور ہے جنھیں ایک عورت اور ذہین عورت کی دیدہ وری ہی قابو میں لا سکتی ہے" (صلاح الدین احمد)۔

گزشتہ کئی سال سے اُن کلاسیکی کتابوں کی از سرِ نو اشاعت کی طرف توجہ دی جا رہی ہے جو اب تقریباً نایاب ہو چکی ہیں۔ اس اشاعتی پروگرام میں مجلس ترقی ادب لاہور، ترقی اردو بورڈ کراچی اور انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی پیش پیش ہیں۔ کچھ تجارتی ادارے بھی اس کام کو فروغ دے رہے ہیں مگر ان کی توجہ ایسی کتابوں پر زیادہ ہوتی ہے جو یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہیں۔ بہرحال نو لکھنؤ کی علمی اور ادبی روایتوں کی تجدید اس طرح ہوتی جا رہی ہے ـــــ سرسید کے ادبی کارناموں میں ان کے بیش بہا مضامین اور بلند پایہ مقالات کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے یہ مضامین مختلف اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ لیکن اُن کی عام نایابی کی وجہ سے اب ان مضامین کے نقوش بھی ذہن سے مٹتے جا رہے تھے۔ ان مضامین کے جو مجموعے اب تک شائع ہوئے ہیں وہ بھی نامکمل اور تشنہ ہیں۔

مجلس ترقی ادب لاہور نے اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے ان مضامین اور مقالات کو مکمل صورت میں شائع کرنے کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ اس منصوبہ کے تحت مقالات سرسید کی دس جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں۔ جلد دوم اور سوم جن میں تفسیری مضامین اور فلسفیانہ مضامین شامل ہیں ۱۹۶۱ء میں شائع ہو چکی تھیں اس سال بقیہ آٹھ جلدیں شائع ہوئی ہیں جن میں مضامین کی ترتیب حسب ذیل ہے:

جلد اوّل ـــــ مذہبی اور اسلامی مضامین

جلد چہارم ـــــ علمی اور تحقیقی مضامین

جلد پنجم ـــــ اخلاقی اور اصلاحی مضامین

جلد ششم ـــــ تاریخی مضامین

جلد ہفتم ـــــ مضامین متعلق سوانح و سیر، ادبی مضامین اور مضامین متعلق تنقید و تبصرہ۔

جلد ہشتم ـــــ تعلیمی، تربیتی اور معاشرتی مضامین۔

جلد نہم ——— ملکی اور سیاسی مضامین

جلد دہم ——— اخبارات پر تنقیدی مضامین، مضامین متعلق تہذیب الاخلاق
مضامین متعلق مدرسۃ العلوم مسلمانان۔

ان جلدوں کو مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے جلد اول میں مولانا موصوف کا ایک فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے، اس طرح کی اور کتابیں بھی اس ادارے نے شائع کی ہیں۔ ان میں دیوان درد (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی) "مہتاب داغ" (مرتبہ سید سبط حسن اور کلب علی خاں فائق رامپوری) نذیر احمد دہلوی کا ناول "فسانۂ مبتلا (مرتبہ افتخار احمد صدیقی) رسالۂ قواعد اردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ" (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی) محمد بخش مہجور کی کتاب نورتن (مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی)، شامل ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ نصیر احمد ناصر کی کتاب تاریخ جمالیات بھی اسی سال مجلس ترقی ادب نے شائع کی ہے" تاریخ اقوام عالم (حصہ اول اور دوم۔ مصنفہ مرتضیٰ احمد خاں میکش) کا دوسرا ایڈیشن بھی اسی سال شائع ہوا ہے۔ یہ ساری کتابیں عمدہ ٹائپ میں نہایت احتیاط کے ساتھ شائع کی گئی ہیں۔

ترقی اردو بورڈ، کراچی نے اس سال جامع اردو لغت کے نمونے کی قسطیں شائع کی ہیں نایاب کتابوں کی اشاعت کی طرف بھی بورڈ نے توجہ کی ہے۔ پچھلے سال "جذبات نادر" شائع ہوئی تھی۔ اس سال مولوی سید احمد دہلوی کی کتاب رسوم دہلی" بورڈ کے زیر اہتمام اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ یہ کتاب ۱۹۰۵ء میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اور اس کے بعد نایاب ہو چکی تھی۔ اس کی اشاعت سے ہماری تہذیبی اور سماجی زندگی کی ایک اہم داستان جو تقریباً بھلائی جا رہی تھی، سامنے آجاتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں فرہنگ کا اضافہ کیا گیا ہے جسے سید یوسف بخاری نے مرتب کیا ہے۔ مرتب کا مفید اور مفصل مقدمہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔

اردو نثر کی اولین کتاب "معراج العاشقین (مصنفہ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز) تحسین سروری نے مرتب کی ہے اور ایک مقدمے کے ساتھ دکن دارالاشاعت کراچی سے شائع کی ہے زیر نظر کتاب میں خواجہ گیسو دراز کے مختصر حالات درج ہیں۔ اور آخر میں قدیم الفاظ کی ایک فرہنگ بھی شامل

کی گئی ہے۔

علمی اور حوالہ جاتی کتابوں کے باب میں بھی اس سال خاصا کام ہوا ہے۔ مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور نے سال رواں میں سائنسی اصلاحات کی ایک ضخیم قاموس شیخ منہاج الدین کی ادارت میں مرتب کرلی ہے۔ تنزیل الرحمن کی "بغاوت قانونی" بھی اسی ادارے کے تحت مرتب ہوچکی ہے۔ اردو اکیڈمی نے انٹرمیجیٹ اور ڈگری کے معیار پر طبیعیات کیمیا اور حیاتیات پر دو علیحدہ علیحدہ انسائیکلو پیڈیا مرتب کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے اور اس پر تیزی سے کام بھی شروع کردیا ہے اس انسائیکلوپیڈیا کے نمونے کا ایک جزو شائع ہوچکا ہے۔ اس کے علاوہ "تذکرۃ المشاہیر" (عالمی سوانحی قاموس) مختصر لغات اردو" اور "فرہنگ ادبی وفنی" کی تدوین و ترتیب کا کام بھی شروع ہوچکا ہے۔

کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ نے بھی اس سال اپنے اشاعتی پروگرام کی رفتار بڑھادی ہے مختلف علوم و فنون کی اُردو اصطلاحات پر مفید اور قابل قدر کام اس شعبہ کی نگرانی میں کئی سال سے جاری ہے۔ اس شعبہ کے سال رواں کے مجلّہ "جریدہ" نمبر ۲ سے اس اہم کام کی وسعت اور رفتار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس جریدہ میں تاریخ سیاسیات، عمرانیات، فلسفہ معاشیات وتجارت، نفسیات، جغرافیہ و ارضیات، حیاتیات، کیمیا اور صنائع کیمیا، طبِ لیبارٹری سائنس کی فرہنگ کے نمونے شامل ہیں"۔ فرہنگ اصطلاحات فلسفہ (انگریزی۔ اردو) بھی اس سال شائع ہوچکی ہے۔ یہ فرہنگ ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ اس میں منطق، اخلاقیات جمالیات اور مابعد الطبیعیات کی دو ہزار سے زیادہ اصطلاحات شامل ہیں۔ زیرِ نظر فرہنگ علوم متعلقہ کے ماہرین کی نگرانی میں تیار کی گئی ہے۔ اب جبکہ کراچی یونیورسٹی نے ایک تاریخی اور جرأت مندانہ فیصلہ کرکے اردو زبان میں تدریس و تعلیم کا ایک تدریجی منصوبہ بنالیا ہے، اس شعبے سے مزید توقعات وابستہ ہوچکی ہیں۔ امید ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں یہ شعبہ ملک میں اہم خدمات انجام دے گا۔

پنجاب یونیورسٹی سے "اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" کے چھ کراسے اس سال شائع ہوچکے ہیں۔ اب تک چوتھی جلد جو سترہ کراسوں پر مشتمل ہے مکمل ہوچکی ہے اور پہلی جلد کے پانچ کراسے

شائع ہو چکے ہیں۔

اردو اکیڈمی بھاولپور نے اس سال "مخطوطات گیلانی لائبریری" (مرتبہ ڈاکٹر غلام سرور) شائع کی ہے۔ اس فہرست میں محمد غوث گیلانی کے سجادہ نشین مخدوم شمس الدین ثامن کی لائبریری (واقع اچ) کے ۳۹ مخطوطات کا جائزہ لیا گیا ہے جن میں ۹۵ عربی اور ۲۹۵ فارسی مخطوطات ہیں۔ ادارہ علم مجلسی کراچی نے عزیز الرحمٰن کی مرتبہ "علم مجلسی یا شعروں کی ڈکشنری" کا نیا ایڈیشن آٹھ جلدوں میں اسی سال شائع کیا ہے۔

علم و ادب کی ان کی تخلیقات نے جہاں ہمارے ذہنی اور فکری رجحانات پر چھائی ہوئی گرانی شب میں کمی کے امکانات روشن کر دیے ہیں، وہیں ہماری شاعری نے داغ داغ اجالے اور شب گزیدہ سحر کے دھندلکوں میں بھی منزل کے نشانات کو پا لیا ہے۔

ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے ادھر
ان کو شعلوں کے رجز اپنا پتہ تو دیں گے
خیر ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دور کتنی ہے ابھی صبح بتا تو دیں گے (فیض)

یہ فیض کی آواز تھی اور اسی آواز نے ہماری شاعری کے نئے دور میں سنگ منزل کی نشان دہی کی ہے ہمارے نئے شاعروں نے بھی مختلف سمتوں میں آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے اور اسالیب کے نت نئے تجربے کرنے کے ساتھ ہی ساتھ موضوع کی اہمیت اور انتخاب پر بھی خاص توجہ دی ہے۔ ۱۹۳۶ء اور اس کے بعد کی نسل کے بہت سے شاعروں نے نئی شاعری کے امکانات کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے اور ان کے بعد یہ تجربے رسائل اور شعری مجموعے میں ہمارے سامنے آتے رہے ہیں۔

اس سال جو شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کی تعداد خاصی ہے۔ ان میں ہمارے جانے پہچانے شاعر ہیں اور نئے لکھنے والے بھی۔

سال رواں میں شائع ہونے والے شعری مجموعوں میں سب سے اہم "چشم نگراں" (عزیز حامد مدنی)

اور "ہفت کشور" (جعفر طاہر) ہیں۔ یہ دو مختلف الطبع شاعروں کے نتائجِ فکر و نظر کی نشان دہی کرتے ہیں۔

عزیز حامد مدنی ہمارے ان شاعروں میں سے ہیں جو کم کہتے ہیں مگر خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے ہیں۔ "چشمِ نگراں" ان کے ابتدائی دور کے کلام پر مشتمل ہے جس میں پہلی اور آخری نظم کے علاوہ ساری نظمیں ۱۹۴۸ء تک کی لکھی ہوئی ہیں۔ اس مجموعہ کو بیان پبلیکیشنز کراچی نے شائع کیا ہے مدنی کی موجودہ شاعری کے پیشِ نظر اس مجموعے کی حیثیت ایک تعارف کی سی ہے۔ مگر یہ تعارف بھی خاکستر میں چھپی ہوئی چنگاری کے امکانات کو اجاگر کرتا ہے۔ مدنی کی شاعری میں ان کے عہد کے خارجی اور داخلی دکھ درد اور سماجی رشتوں کا واضح تصور عیاں ہوتا ہے۔ یہ مجموعہ مدنی کے ذہنی سفر کی داستان بھی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کی پہلی (انتساب) اور آخری (دستِ حنائی تک) نظم اس سفر کی منزلیں ہیں جو ایک دوسرے سے ملتی ہوئی نظر آتی ہیں۔

"کہ دستِ شوق سے دامن تھا نارسیدہ بہت" (انتساب)

اور "سحر کی لاگ چشمِ خوں فشاں بھی نارسائی تک
پہنچنے ہی کو ہے دستِ جنوں۔ دستِ حنائی تک" (دستِ حنائی تک)

مدنی کی شاعری علامتوں کی شاعری ہونے کے باوجود مبہم نہیں، اس میں تخیل کی رفعت اور فکری عناصر شاعرانہ حسن کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ اس مجموعے کی مکمل اور خوب صورت نظم "دستِ حنائی تک" ہے۔

"ہفت کشور" جعفر طاہر کی سات طویل نظموں کا مجموعہ ہے یہ ترکی، مصر، عرب، عراق، ایران، پاکستان اور الجزائر کی منظوم داستان بیداری ہے۔ زیرِ نظر کتاب گلڈ پبلشنگ ہاؤس کراچی نے شائع کی ہے اور اسے سالِ رواں کا آدم جی ادبی انعام بھی مل چکا ہے۔ یہ کتاب اس لحاظ سے اہم ہے کہ ایک مربوط فکر کے تحت ایک بڑے موضوع کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کامیاب اور خوبصورت کوشش کی گئی ہے۔ شاعرانہ اسلوب کے اعتبار سے جعفر طاہر جوش سے متاثر نظر آتے ہیں۔ ان نظموں میں جعفر طاہر نے "نئی دنیا کو سلام" (علی سردار جعفری) کی طرح مختلف بحروں کا انتخاب کیا ہے علاقائی مناسبت سے ان نظموں میں کہیں کہیں فارسی اور عربی کے اشعار بھی موتی کی طرح پروئے ہوئے نظر آتے ہیں۔ گلڈ پبلشنگ ہاؤس نے ایک اور مجموعہ کلام "جلتے جزیرے" کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ مجموعہ

دبستان کے اردو شاعر احسن احمد اشک کی ۳۴ نظموں اور ۱۲ غزلوں کا مجموعہ ہے جو ان کی طنزیہ اور غنائی شاعری کی نمائندگی کرتا ہے۔ "جاگتے جزیرے" کی پہلی نظم "آئینہ" ایک تعارف ہے۔ اشک کی طنزیہ نظموں میں "موصوف"، "مجھے تسلیم کرو"، "میں مگر چپ ہی رہا"، "یہ میرا شہر" اور "کتبہ" قابل ذکر ہیں۔ "کوئی فریاد سننے (دیدما)"، "جاگتے جزیرے" غنائی نظموں کی خوب صورت مثالیں ہیں۔ کتاب کے آخر میں احوال شاعر کے عنوان سے مصنف کی زندگی کے واقعات درج ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں کا مجموعہ کلام "انداز بیاں اور" اکادمی پنجاب، لاہور نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے۔ مہدی علی خاں کی طنزیہ شاعری میں گزشتہ چند برسوں سے بڑی گہرائی پیدا ہو گئی ہے، ان کی طنزیہ شاعری میں شاد عارفی کے اسلوب کی جھلک ایک نئے انداز میں ملتی ہے۔ اکادمی پنجاب نے ایک مختصر کتاب "۱۹۶۰ء کی بہترین نظمیں" شائع کی ہے جس میں برصغیر کے ۳۱ شاعروں کی جدید نظموں کا انتخاب شامل ہے۔ انتخاب ڈاکٹر وزیر آغا نے کیا ہے، مگر نقطۂ نظر کے اختلاف اور انتخابی معیار کے حدود غیر واضح ہونے کے باعث اکثر اچھی نظمیں شامل ہونے سے رہ گئی ہیں۔

مصطفیٰ زیدی (جو پہلے تیغ الہ آبادی کے نام سے لکھا کرتے تھے) ہمارے جانے پہچانے شاعر ہیں۔ اس سال ان کا ایک خوب صورت شعری مجموعہ "گریباں" مکتبۂ ادب جدید، لاہور سے شائع ہوا ہے، جس میں ۱۲ غزلیں اور ۲۵ نظمیں شامل ہیں۔ ان میں لوئی میک نیس کی نظموں کے منظوم ترجمے بھی ہیں جن سے ان کے شعری رجحان کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مکتبۂ ادب جدید نے اس سال چار نئے شاعروں کے مجموعے صوری خوبیوں کے ساتھ شائع کئے ہیں۔ "نقش کف پا" جیلانی کامران کی ایک طویل نظم ہے۔ "شام کی دہلیز" سلیم الرحمٰن کی نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ دونوں کتابیں ٹائپ میں شائع ہوئی ہیں۔ تیسری کتاب جعفر شیرازی کی غزلوں کا مجموعہ "ہوا کے رنگ" ہے۔ آخری کتاب جواں مرگ شاعر فخر الاسلام کی غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "نقش ناتمام" ہے جسے رابعہ خاتون نہال نے مرتب کیا ہے۔ اس کتاب کا تعارف عبدالمجید سالک مرحوم نے لکھا ہے۔

اس سال شائع ہونے والی کتابوں میں ایک خاص رجحان کے تحت دو شاعروں نے اپنے مجموعے شائع کئے ہیں۔ ان میں یوسف ظفر کا مجموعہ "نوائے ساز" (مکتبۂ نو، راولپنڈی) اور

عارف عبدالمتین کا مجموعہ "آتش سیال" (ایک ورلڈ لاہور) شامل ہیں۔ یہ خاص رجحان ان اصناف کی طرف توجہ ہے جن سے اب تک ان شاعروں نے بے توجہی برتی تھی۔ یوسف ظفر ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں لیکن "نوائے ساز" میں انھوں نے صرف غزلیں پیش کی ہیں۔ ہر غزل کے نیچے اس کی تاریخ درج ہے جس سے یوسف ظفر کے فنی اور ذہنی ارتقاء کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مصنف کا پیش لفظ بھی شامل ہے، جس میں یوسف ظفر نے اپنی غزل میں انچ اور ندرت کے موضوع پر بحث کی ہے "آتش سیال" میں عارف عبدالمتین نے "فراز کوہ" "نذر دو جہاں" کے نام سے قطعات اور "شعلہ فروزاں" اور "وادی رنگ و بو" کے نام سے رباعیات پیش کی ہیں۔ مصنف نے مقدمہ میں قطعات، اور رباعیات کی ہیئت سے بحث کی ہے۔

سرشار صدیقی اگرچہ جواں سال شاعر ہیں۔ کی عمر کم و بیش بیس سال ہے۔ "پتھر کی لکیر" ان کی ۱۹۴۷ء سے ۱۹۶۲ء تک کی شاعری کا انتخاب ہے جس میں ۳۲ نظمیں اور ۱۳ غزلیں شامل ہیں۔ یہ کتاب ہمارا ادارہ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ سرشار کے اسلوب پر اردو کی شعری روایات کا گہرا اثر ہے لیکن وہ اپنا انفرادی لہجہ تخلیق کرنے میں بڑی حد تک کامیاب ہو گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب کی نظمیں "درد کا سورج" اور "نیا افق" ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کی نشان دہی کرتی ہیں۔

سال زیر تبصرہ میں ایک بزرگ اور پرانے شاعر ثاقب کانپوری کی غزلوں کا مجموعہ "روح جاوداں" اردو اکیڈمی سندھ، کراچی سے شائع ہوا ہے۔ روح جاوداں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ شاعر نے ایک طرف تغزل کے روایتی معیار میں انفرادیت کے نقوش پیدا کئے ہیں اور دوسری طرف عہد حاضر کے تقاضوں کو بنائے غزل میں ڈھال دیا ہے۔ اس کتاب کی پرنٹ لائن بھی سال اشاعت کے سلسلے میں صحیح نشان دہی نہیں کرتی۔ ایک اور بزرگ شاعر نواب واجد علی خاں اشک رامپوری (اچھن صاحب) کا منتخب کلام "رنگ اشک" لفٹننٹ کرنل نذیر احمد اور بیگم اختر نذیر نے مرتب کر کے اس سال کراچی سے شائع کیا ہے۔ اشک داغ اسکول کے ایک صاحب طرز غزل گو تھے۔ زیر نظر کتاب میں ان کی ڈیڑھ سو غزلیں شامل ہیں۔

محشر بدایونی ایک اچھے غزل گو شاعر ہیں اور بچوں کے لئے بھی خوب صورت نظمیں لکھتے ہیں۔

اسی سال ان کا ایک منظوم تذکرہ "شاعر نامہ" ریپلیکا پبلی کیشنز، کراچی نے ایک دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب دو رنگوں میں دبیز کاغذ پر چھپی ہے اور اس میں پچاس شاعروں (حضرت امیر خسروؒ سے مجازؔ تک) کے خاکے شامل ہیں۔ ان خاکوں میں ہر شاعر کی افتادِ طبع، فنی خصوصیات اور سالِ پیدائش و سالِ وفات کو آسان اور عام فہم زبان میں خوبصورتی سے نظم کیا گیا ہے۔ پاکستان کے مشہور مصور آذر زوبی کا بنایا ہوا ہر شاعر کا اسکیچ بھی کتاب میں شامل ہے۔ آخری حصے میں "تاریخی جائزہ" کے عنوان سے شاعروں کی تصنیفات و تالیفات کی ایک فہرست بھی درج ہے۔ یہ کتاب اسکول اور کالجوں کے طالب علموں کے لئے لکھی گئی ہے۔ اور ہمارے شعری ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

ہمارے جدید شاعروں میں عبد العزیز خالد ایک نمایاں حیثیت رکھتے ہیں خالد نے منظوم ترجموں میں بھی شاعرانہ حسن برقرار رکھنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ اس سال انھوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کی شہرۂ آفاق تصنیف "گیتان جلی" کا منظوم ترجمہ "گل نغمہ" کے نام سے پیش کیا ہے۔ یہ ترجمہ ادبی محاسن سے سر بسر معمور ہے۔ اس ترجمہ میں شاعرانہ حسن اور معنوی تسلسل کو برقرار رکھنے کی بھی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ زیرِ نظر کتاب کے ابتدائی حصے میں ٹیگور کی شخصیت اور ان کی شاعری پر ڈاکٹر عبد الرحمٰن بجنوری، ڈبلیو بی ایٹس، راما نند چٹرجی اور ابو الکلام آزاد کے مضامین بھی شامل ہیں۔ "ٹیگور۔ ایک نظر" کے عنوان سے ان کے حالات و واقعات کا ایک سن وار خاکہ بھی زیرِ نظر کتاب میں شامل ہے یہ کتاب خوبصورت ٹائپ میں مطبوعات مشرق، کراچی سے شائع ہوئی ہے نیاز فتح پوری کا اسی کتاب کا مشہور نثری ترجمہ اس سال "عرض نغمہ" کے نام سے ادارہ لگار پاکستان کراچی نے شائع کیا ہے۔ مترجم کا ایک بسیط مقدمہ اس کتاب میں شامل ہے۔

نیا ادارہ لاہور نے بھی اس سال دو شعری مجموعے شائع کئے ہیں، "آبِ رواں" ظفر اقبال کی غزلوں کا مجموعہ ہے جو ٹائپ میں خوبصورت گرد پوش کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کو نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کی طرف سے دیدہ زیبی اور تزئین طباعت کا پہلا انعام بھی مل چکا ہے۔ ان کی تجرباتی غزلوں میں جو اس مجموعہ میں شامل ہیں بعض اچھے اشعار بھی ہیں جن سے ان کے اچھے مستقبل

بشارت ہوتی ہے۔ دوسری کتاب "گجر" قتیل شفائی کے مجموعہ کلام کا تیسرا ایڈیشن ہے جسے اضافہ کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔ قتیل شفائی کا ایک اور مجموعہ کلام "جلترنگ" ترمیم و اضافہ کے ساتھ مکتبہ جدید، لاہور سے شائع ہوا ہے۔

اس سال شائع ہونے والے دوسرے شعری مجموعے یہ ہیں: حسن بخت کی نظموں کا مجموعہ "شکست شب" (مکتبہ المستاز، لاہور) شاعرہ وجید کی نظموں کا مجموعہ "شکست ساز سے پہلے" (زمانہ پبلی کیشنز، لاہور)، ساغر صدیقی کا مجموعہ کلام "زہر آرزو" (ظفر برادرز، لاہور) صادق مصور کا مجموعہ کلام "شب چراغاں" (ادارۂ فکر و فن، ملتان)، ع۔س۔مسلم کا مجموعہ کلام "اوس اور کرمیں" (مکتبہ نیا راہی کراچی) اور مرکز ادب کوئٹہ کا مرتب کردہ قلات کے اردو شعراء کا انتخاب کلام "دھنک" (قلات پبلشرز، مستونگ)۔ سلطان حسین اینڈ سنز، کراچی نے بھی دو مجموعے شائع کئے ہیں۔ ان میں عقیل احمد جعفری کی نظموں کا مجموعہ "جوش و ہوش" اور رعبرت الہ آبادی کا دیوان "بیت الصنم" شامل ہیں۔ نیاز فتح پوری کی کتاب "مشکلات غالب" بھی اسی سال ادارۂ نگار پاکستان، کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں غالب کی ۲۳۴ غزلوں کے صرف مشکل اشعار کی تشریح کی گئی ہے۔

سالِ رواں میں مختلف موضوعات پر بھی خاصی کتابیں شائع ہوئی ہیں ــــ فلسفہ اور تصوف میں سید محمد تقی کی کتاب "روح اور فلسفہ" (اردو اکیڈمی سندھ کراچی)، ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کی دو تصانیف "تاریخ تصوف" (بشیر احمد ڈار) اور "تعلیمات غزالی" (محمد حنیف ندوی)، لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید کی تصنیف "معارف النفس" (مجلس اخوان الصفا، کراچی) (مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب "تجدید تصوف و سلوک" (نفیس اکیڈمی، کراچی) اور تقی محمد خاں خورجوی کی کتاب "اعجوبۂ اسرار" کا نیا ایڈیشن (ادارۂ علم مجلسی، کراچی) قابل ذکر ہیں۔ اسلامیات پر قاضی محمد سلیمان منصور پوری کی "الجمال والکمال" (تفسیر سورۂ یوسف) غلام رسول مہر کے مقدمے کے ساتھ المکتبۃ الرحمانیہ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ المکتبۃ السلفیہ لاہور سے سید احمد حسن محدث دہلوی کی "احسن التفاسیر" کی جلد دوم اسی سال شائع ہوئی ہے۔ دوسری کتابوں میں

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی کتابیں "تفہیم القرآن" جز ثالث (مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور) "الجہاد فی الاسلام" "اسلامی نظام زندگی اور اس کے بنیادی تصورات" اور "اسلامی ریاست" مرتبہ خورشید احمد (اسلامک پبلیکیشنز لاہور) "تاریخ اشاعت اسلام" مصنفہ محمد اسمٰعیل پانی پتی (غلام علی اینڈ سنز لاہور) مناظر احسن گیلانی کی کتاب "اسلامی معاشیات" (شیخ شوکت علی اینڈ سنز کراچی) مولانا عبدالباری ندوی کی دو کتابیں "تجدید دین کامل" اور "تجدید تعلیم و تبلیغ" (نفیس اکیڈمی کراچی) رئیس احمد جعفری کی کتاب "امامت و سیاست" (شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور) ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی کتاب "تاریخ تدوین حدیث" (پاک اکیڈمی کراچی) مولانا صدر الدین اصلاحی کی کتاب "اسلام ایک نظر میں" (اسلامک پبلیکیشنز لاہور) سلیم الدین قسمی کی کتاب "تعارف مضامین قرآن" (مکتبہ مدحی کراچی) اور عبدالقیوم ندوی کی کتاب "رحمت کا تصور قرآن میں" (سلطان حسین اینڈ سنز کراچی) قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ سید سلیمان ندوی کی مشہور کتاب "رحمت عالم" کا نیا ایڈیشن (لاہور اکیڈمی لاہور) سے شائع ہوا ہے۔ محمد مظہر الدین کی کتاب "اسلام کا نظریہ تاریخ" (ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور) مفتی محمد شفیع کی "سیرت خاتم الانبیاء" (دارالاشاعت، کراچی) کے نئے ایڈیشن بھی اسی سال شائع ہوئے ہیں۔ تاریخی کتابوں میں سر سید احمد خاں کی کتاب "سرکشی ضلع بجنور" اور سعادت یار خاں رنگین کی تاریخی کتاب "اخبار رنگین" (شاہ عالم اور اکبر ثانی کی دلّی) قابل ذکر ہیں۔ اول الذکر کتاب سلمان اکیڈمی، کراچی سے شائع ہوئی ہے، جسے ڈاکٹر معین الحق نے مرتب کیا ہے۔ آخر الذکر کتاب پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی نے ڈاکٹر سید معین الحق کے مقدمہ اور تعلیقات کے ساتھ شائع کی ہے۔ ڈاکٹر خان محمد خاں کی کتاب "مشرقی و مغربی تہذیب" آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ تعلیم و تدریس پر بھی دو کتابیں مکتبہ جامعہ تعلیم ملی کراچی سے شائع ہوئی ہیں۔ ان میں فرمان فتح پوری کی "تدریس اردو" اور برکت علی کی کتاب "تدریس حساب" شامل ہیں۔ سلیم فارانی کی کتاب "اردو زبان اور اس کی تعلیم" کا نیا ایڈیشن اردو مرکز لاہور سے شائع ہوا ہے، موسیقی پر بھی ایک کتاب "ہماری موسیقی۔ ایک تعارف" کے نام سے خوب صورت ٹائپ میں ادارۂ مطبوعات پاکستان کراچی نے شائع کی ہے جو نیّر خاور

کا ایک مفید اور مفصل مقدمہ "پیش آہنگ" کے عنوان سے اس کتاب میں شامل ہے۔

سال زیر تبصرہ میں تراجم بھی کثرت سے شائع ہوئے ہیں۔ مکتبہ فرینکلن نے مختلف ناشروں کے تعاون سے اس سال بھی امریکی تصانیف کے اردو ترجمے شائع کروائے ہیں، ان میں "سائنس داں کیسے بنتے ہیں" (مترجم سید ناصر علی زیدی)، "جوہر کے کرشمے" (مترجم محمد سعید) "طائر اور طیارے" (مترجم محمد سعید) "آسمان کی سیر" (مترجم محمد سعید) "سورج کی پیدائش اور موت" (مترجم فاروق احمد) "جڑی بوٹیوں سے علاج" (مترجم حبیب اشعر)، "آدمی کی انسانیت" (مترجم محمد بخش مسلم)، "جنگ میکاویلی سے ہٹلر تک" (مترجم بریگیڈیر گلزار احمد) "سکندر اعظم" (مترجم غلام رسول مہر) "سلطان صلاح الدین ایوبی" (مترجم محمد یوسف عباسی) "ظہیر الدین بابر اور ان کا عہد" (مترجم حسین انور) "بار شیر بر" (مترجم ہاشمی فرید آبادی) "قدیم تہذیب اور جدید انسان" (مترجم سید قاسم محمود) "جریہ اور اسلام" (مترجم غلام رسول مہر) "اسلام صراط مستقیم" (مترجم غلام رسول مہر) "بنی آدم اعضائے یک دیگر اند" (مترجم ہادی حسین)، "تاریخ شام" (مترجم غلام رسول مہر) "مشرق و مغرب کو ملنا ہی پڑے گا" (مترجم ہاشمی فرید آبادی) "تعلیم کا عمل" (مترجم سید عابد علی عابد) "فلسفہ کا نیا آہنگ" (مترجم بشیر احمد ڈار) "وقت کا آسمان" (مترجم ن۔م۔ راشد) "موسم اور ہم" (مترجم علی ناصر زیدی) "وہ بیضوی تصویر"، "چہ دلاور است دزدے" اور "سائنس کی پھانس" (مترجم ابن انشا)، "خوراک کی کہانی" (مترجم شوکت تھانوی) قابل ذکر ہیں۔ نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ کے مشہور فارسی تذکرے "گلشن بے خار" کا اردو ترجمہ پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی نے شائع کیا ہے۔ مترجم محمد احسان الحق فاروقی ہیں جن کا مقدمہ بھی اس کتاب میں شامل ہے۔ محمد قاسم فرشتہ کی مشہور تصنیف "تاریخ فرشتہ" کا فارسی زبان سے اردو ترجمہ عبدالحی خواجہ نے کیا ہے۔ کتاب شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے شائع کی ہے۔ مجبوب العالم کی خود نوشت بنگالی سوانح عمری "مومنیر زبان بندی" کا اردو ترجمہ "مجھے اعتراف ہے" کے نام سے بنگالی اکیڈمی ڈھاکہ نے خوب صورت ٹائپ میں شائع کیا ہے۔ ترجمہ سعد منیر نے کیا ہے۔ اس کتاب کو نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کی طرف سے حسن طباعت کا انعام بھی ملا ہے۔ بنگالی اکیڈمی نے

نذرالاسلام کی نظموں کا ترجمہ "جامِ کوثر" کے نام سے شائع کیا ہے۔ بھگوتی چرن ورما کا ہندی زبان کا ناول "چترلیکھا" بھی اسی سال الجدید لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس ناول کا ترجمہ سوم آنند نے کیا ہے۔ خلیل جبران کی کتابوں کے ترجمے بھی اس سال شائع ہوئے ہیں۔ آئینۂ ادب لاہور نے "شیطان" اور "دلہن کی سیج" (مترجم حبیب اشعر) کے نئے ایڈیشن شائع کئے ہیں۔ "خدا اور دیوتا" (مترجم انور عارف) مکتبہ ماحول کراچی سے شائع ہوئی ہے۔ ڈی۔ ایچ۔ لارنس اور بورس پیسٹرناک کے مشہور ناول "لیڈی چیٹرلے" اور "ڈاکٹر زواگو" کے اردو ترجمے ادبیات نو لاہور اور لارک پبلشرز کراچی سے شائع ہوئے ہیں۔ الف لیلیٰ کا مشہور اردو ترجمہ (مترجم رتن ناتھ سرشار، مرتبہ وقار عظیم اور انتظار حسین) اس سال غلام علی اینڈ سنز، لاہور نے شائع کیا ہے۔ مجلس ترقی ادب لاہور نے آر۔ سی۔ ٹمپل کی "حکایاتِ پنجاب" کا ترجمہ (مترجم میاں عبدالرشید) ۴ جلدوں میں شائع کیا ہے۔ "نظام معاشرہ اور تعلیم" (مصنفہ رسل۔ مترجمہ سی۔ آر۔ عزیز) اور "فلسفہ شریعت اسلام" (مصنفہ صبحی محمصانی (مترجمہ محمد احمد رضوی) کے نئے ایڈیشن بھی اس سال مجلس ترقی ادب لاہور نے شائع کئے ہیں۔ مولوی عنایت اللہ کا اردو ترجمہ "عبرت نامہ اندلس" (مصنفہ ڈوزی) خوب صورت گرد پوش کے ساتھ مقبول اکیڈمی لاہور سے شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کو شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے۔ لیبان کی کتاب "تمدن ہند" (مترجم سید علی بلگرامی) کے بھی دو ایڈیشن اس سال شائع ہوئے ہیں۔ مقبول اکیڈمی لاہور نے اس ترجمہ کو رئیس احمد جعفری کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اور اسی ترجمہ کا دوسرا ایڈیشن بغیر کسی مقدمے کے بک لینڈ کراچی نے بڑے سائز کی خوب صورت جلد میں عمدہ طباعت کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بک لینڈ کراچی نے اس سال دو اور ترجمے شائع کئے ہیں۔ ان میں "سفر نامہ ابن جبیر اندلسی" (مترجم احمد علی، ترتیب عبید اللہ قدسی) "بابر نامہ" (مترجم نصیر الدین حیدر، ترتیب عبید اللہ قدسی) شامل ہیں۔ نفیس اکیڈمی کراچی نے اس سال جو ترجمے شائع کئے ہیں، ان میں قابلِ ذکر یہ ہیں "انسان کامل" (مصنفہ سید عبدالکریم ابن ابراہیم جیلانی، مترجمہ مولوی فضل میراں) "فقہ الاسلام" (مصنفہ حسین احمد الخطیب مترجمہ

سید وحید احمد رشید" عہد لارڈ ماؤنٹ بیٹن (مصنفہ ایلن کیمبل جانسن - مترجمہ یونس احمر)
"سفرنامہ ابن بطوطہ" (مترجم رئیس احمد جعفری) "زاد المعاد" (۲ جلد) (مصنفہ حافظ
ابن قیم مترجم رئیس احمد جعفری)۔ شیخ علی اینڈ سنز لاہور نے بھی کئی ترجمے شائع کئے ہیں
ان میں "سیرت النبیؐ" (مرتبہ ابن ہشام مترجمہ عبد الجلیل صدیقی و غلام رسول مہر) "امام
اعظم ابو حنیفہ" (مصنفہ محمد ابو زہرہ مترجم رئیس احمد جعفری) "صحیح بخاری" (تالیف امام محمد
ابو عبد اللہ بخاری مترجم نائب نقوی) "عوارف المعارف" (مصنفہ عمر بن محمد شہاب الدین
سہروردی مترجم رشید احمد ارشد) "غزالی نامہ" (مصنفہ جلالی ہمائی مترجم جلالی ہمائی)
"منتخب التواریخ" (مصنفہ ملا عبد القادر ملوک شاہ بدایونی مترجم محمود احمد فاروقی) شامل ہیں۔
نور محمد کارخانہ تجارت، کراچی نے بھی عربی کتابوں کے ترجمے شائع کئے ہیں۔ "الاتقان
فی علوم القرآن" (مصنفہ جلال الدین سیوطی، مترجم یار علیم چشتی) "مشارق الانوار" مترجمہ
مولانا خرم علی)، "صحیح ترمذی شریف" (مؤلفہ امام ابو عیسیٰ محمد ترمذی مترجم معراج احمد)
"موطا امام مالک" (مترجمہ وحید الزماں) "حصن حصین" (مؤلفہ علامہ محمد ابن جزری مترجمہ
عبد العلیم ندوی) "مقدمہ تاریخ ابن خلدون" (مترجمہ سعد حسن خاں یوسفی) "تلبیس ابلیس"
(مصنفہ ابن جوزی مترجمہ ابو محمد عبد الحق) ان میں شامل ہیں۔ شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ
کراچی یونیورسٹی نے اس سال ابن ابی الربیع کی شہرہ آفاق تصنیف "سلوک المالک
فی تدبیر الممالک" کا ترجمہ شائع کیا ہے۔ مولانا مظہر علی کامل نے اس نایاب کتاب
کا ترجمہ نہایت شگفتہ زبان میں کیا ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر الیاس احمد کا پیش لفظ
بھی شامل ہے جس میں کتاب پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے۔

بچوں کی کتابوں پر بھی اب خاصی توجہ دی جا رہی ہے، موضوع، طباعت،
سرورق اور تصاویر کے باب میں اس سال کامیاب تجربے کئے گئے ہیں۔ اس سال
کی نمائندہ کتابوں میں فیروز سنز لاہور کی دو مطبوعات "ہنسی کی کہانیاں" اور "کشمیر کی بیٹی"
نیشنل بک سنٹر آف پاکستان کی طرف سے حسن طباعت کا انعام پا چکی ہیں۔ الائنز بک

کارپوریشن کی رنگین کتاب "لال بندر" (مصنفہ عبدالواحد سندھی جامعی) بھی اس سال انعام پا چکی ہے۔ قومی کتب خانہ لاہور نے بھی ایک خوب صورت کتاب "دلچسپ معلومات" (علی ناصر زیدی) کے نام سے چھاپی ہے۔ درسی کتابوں میں "ہماری مصوری" مصنفہ خواجہ منظور احمد (مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ کراچی) ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ کتاب اچھے ٹائپ کی طباعت، جاذب نظر تصاویر اور مشہور خطاط منشی محمد یوسف دہلوی کے کتابت کی وجہ سے اس سال کی خوبصورت کتابوں میں ایک اہم اضافہ ہے۔

اس تذکرے میں عموماً وہ کتابیں شامل ہیں جن کی قیمتیں اوسط درجے کے لوگوں کے لئے بارگزرتی ہیں۔ کتابوں کے عام پھیلاؤ کے خیال سے، ہمارے بعض ناشرین اب اچھی کتابوں کے سستے ایڈیشن بھی شائع کرنے لگے ہیں۔ ان ناشرین میں مکتبہ جدید لاہور اردو اکیڈمی سندھ کراچی، نیا ادارہ، لاہور، مجلس ترقی ادب، لاہور، شعاع ادب لاہور، سید اینڈ سید، کراچی، لارک پبلشرز، کراچی قابل ذکر ہیں۔ ان اداروں نے جہاں کلاسیکی ادب کی کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ دی، وہیں عہد حاضر کے صف اول کے فن کار، منشی پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ہاجرہ مسرور، علی عباس حسینی کی بہترین کتابوں کو عام کرنے میں بھی خاصا کام کیا ہے۔ سستے ایڈیشن کی کتابوں کی اشاعت سے اب عام پڑھنے والوں کے مذاق میں بھی صحت مند تبدیلی کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

پاکستان کی اردو مطبوعات کے اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے لکھنے والوں نے کن سمتوں میں آگے بڑھنے کی کوشش کی ہے۔ "آنگن" سے "ہفت کشور" تک کی یہ کتابیں آسمان ادب پر کہکشاں کی صورت پھیل کر اپنی جھلملاتی ہوئی روشنیوں سے ہمارے ادبی کارواں کے نئے موڑ کا پتہ بتاتی ہیں۔ ؎

گماں مبر کہ بپایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

تحقیقی ادب

(الف) ——— عبداللطیف اعظمی

(ب) ——— جناب قاضی عبدالودود

(تحقیقی ادب کے جائزے کے لئے ہم نے اردو کے مشہور محقق قاضی عبدالودود صاحب سے درخواست کی تھی موصوف نے لکھنے کا وعدہ کیا تھا اور جو کتابیں ہمیں موصول ہوئی تھیں ان پر تبصرہ فرمایا بھی، مگر یہ تبصرے اتنی تاخیر سے موصول ہوئے کہ ان سب کی کتابت کے لئے وقت نہیں رہا۔ دوسرے آپ نے موصولہ کتابوں پر الگ الگ تبصرہ کیا ہے۔ تحقیقی ادب کے متعلق بحیثیت مجموعی کوئی رائے ظاہر نہیں کی ہے۔ اس لئے اپنی طرف سے تمہید کا اور چند کتابوں پر مختصر تبصرہ کا اضافہ کرکے موصوف کے دو تبصرے جو نسبتاً مختصر تھے ذیل میں شائع کئے جا رہے ہیں)

(الف)

آزادی کے بعد تحقیقی ادب میں بہت کافی اضافہ ہوا ہے اور تحقیق کی طرف توجہ دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں مثلاً قومی حکومت، اپنی پیش رو حکومت کے مقابلہ میں علمی کاموں کے لئے کافی امداد دے رہی ہے، یونیورسٹیوں میں ریسرچ کے طالب علموں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ بہت سے نئے تحقیقی ادارے قائم ہو گئے ہیں، تحقیق و تفتیش کی آسانیوں میں معتد بہ اضافہ ہوا ہے، وغیرہ۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ تحقیق کا معیار عام طور پر پست ہوا ایک ریسرچ اسکالر کے الفاظ میں تحقیق کم ہوتی ہے، گورکنی زیادہ بقول پروفیسر آل احمد سرور تحقیق کے لئے کسی ذوق یا ادبی حس کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ تحقیق کے نام پر رائی کے پہاڑ کھڑے کئے جا رہے ہیں اور ایسے پودے کہ ہوا کا جھونکا نہ سہار سکیں۔[1]

---

[1] ہماری زبان۔ ۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء

زیرتبصرہ سال میں جو تحقیقی کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ایسی بھی ہیں جو تعداد میں تو اضافہ کرتی ہیں۔ مگر تحقیق کے اعلیٰ معیار کو پورا نہیں کرتیں اور ایسی بھی ہیں جو ایک منصوبے کے ماتحت تیار کی گئی ہیں اور تمام ذرائع کو استعمال کیا گیا ہے۔ زیر بحث موضوع پر جہاں تک مجھے معلوم ہے، حسب ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں۔

علی گڑھ تاریخ ادب اردو (پہلی جلد) شائع کردہ شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی۔

لغات گجری، مرتبہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی

دیوان عزلت، مرتبہ عبدالرزاق قریشی

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں۔ مولفہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

غالب نام آورم، مرتبہ نادم سیتاپوری

تذکرۂ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت، مولفہ سخاوت مرزا۔

شکارنامہ، مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت

مثنوی لطف " " "

سام نامہ از لحن کول بلبل

اردو میں ابھی یہ روایت قائم نہیں ہوئی ہے کہ کسی کتاب کے مرتبین اور مضمون نگاروں میں متعلقہ موضوع کے چوٹی کے اصحاب شامل ہوں۔ جہاں تک میری واقفیت ہے "تاریخ ادب اُردو" پہلی کتاب ہے جس کے مرتبین اور مضمون نگار دونوں پایہ کے لوگ ہیں مجلس ادارت میں ڈاکٹر تاراچند، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، پروفیسر مسعود حسن رضوی، ڈاکٹر سید عابد حسین، پروفیسر رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر یوسف حسین خاں شامل ہیں اور پروفیسر آل احمد سرور جیسے ادیب اس کے ڈائرکٹر ہیں۔ مضمون نگاروں اور مختلف ابواب کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

۱۔ تمہید پروفیسر آل احمد سرور

۲۔ لسانیاتی مقدمہ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خاں

۳۔ پہلا باب سیاسی اور تمدنی پس منظر پروفیسر محمد حبیب

(۴) دوسرا باب - گجرات میں اردو   پروفیسر نجیب اشرف ندوی

(۵) تیسرا باب - اردو ادب بہمنی دور میں   پروفیسر عبدالقادر سروری

(۶) چوتھا باب - اردو ادب عادل شاہی دور میں

(الف) ڈاکٹر نذیر احمد

(ب) جناب نصیرالدین ہاشمی

(۷) پانچواں باب - اردو قطب شاہی دور میں - ڈاکٹر محی الدین قادری زور

(۸) چھٹا باب - ولی اور اس کا عہد - { ڈاکٹر ظہیرالدین مدنی
جناب سخاوت مرزا

(۹) ساتواں باب - شمالی ہند میں اردو ادب کے نمونے ۱۷۰۰ء تک

جس کتاب کے مرتب اور مضمون نگار اتنے بلند پایہ ہوں ظاہر ہے وہ کتاب کتنی اونچی ہوگی قاضی عبدالودود صاحب اس پر تفصیل سے تبصرہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، دراصل موصوف کا بے لاگ قلم ہی اس کی خوبیوں اور خامیوں پر صحیح طور پر روشنی ڈال سکے گا۔ البتہ ایک بات ہم یہاں پر ضرور عرض کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ اشاریہ کی ترتیب کسی اصول کے مطابق نہیں ہے۔ مثلاً "الف" میں پہلا لفظ "البیرونی" ہے، اس کے بعد "اکبر"، اورنگ زیب افضل اور آبرو۔ اسی طرح "ب" کے تحت بدھ، پھر بختیار، بابر باجن اور براہمن معلوم ہوتا ہے اس کی ترتیب اناڑی طالب علم کے سپرد کردی گئی تھی اور کسی ذمہ دار شخص کو اس پر نظر ڈالنے کی فرصت نہیں ملی۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کی کتاب "ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں" جسے مکتبہ جامعہ نے شائع کیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ اردو کے تحقیقی ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ موصوف نے اردو مثنویوں کا ایک نئے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے، یعنی ہندوستان کے تاریخی اور معاشرتی پس منظر کے ساتھ ان کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ہندوستانی روایات اور مقامی اثرات کی نشان دہی کی ہے۔ اس کتاب میں ان مثنویوں سے بحث کی گئی ہے، جن میں ہندوستانی قصوں کو موضوع بنایا گیا ہے

یا کسی ہندوستانی قصے پر مبنی ہیں یا جن کی بنیاد ہندوستانی لوک کہانیاں ہیں یا ایسی مثنویاں جن میں ہندوستان کے موسم اور تہوار وغیرہ بیان کئے گئے ہیں یا ایسی جن میں ہندوستان کے معاشرتی کوائف و آثار کی تفصیل ملتی ہے۔" موصوف نے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "اردو مثنوی کا دامن مقامی موضوعات سے کبھی خالی نہیں رہا، ان موضوعات سے ہمارے شاعروں کی وابستگی سطحی یا رسمی نہیں۔"

سرور صاحب کا شروع میں میں نے جو اقتباس نقل کیا ہے، اس میں انھوں نے بجا طور پر کہا ہے کہ تحقیق کے لئے ادبی حسن کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ مگر نارنگ صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جن کی زبان شگفتہ اور اسلوب نگارش سلیس ہے، اس لئے جب وہ کوئی مشکل اور غیر معروف لفظ استعمال کرتے ہیں تو ذوق پر بہت گراں گزرتا ہے۔ مثلاً "بقمی کے کلام میں وہ شگفتگی، جزالت اور زور نہیں" (ص ۱۷۹) یا "اس کے قلم میں بلا کی روانی اور برش ہے" (ص ۲۱۴) یا "ان کے لباس، پوشاک، نشست و برخاست اور آداب و اوضاع مغلیہ محلات کی اس معاشرت کی یاد دلاتے ہیں" (ص ۲۲۰) یا "مور نامہ میں مور حیات و کائنات کے بنیادی جذبۂ عشق کی تجسیم ہے (ص ۲۸۵) کہیں بیان میں الجھاؤ اور بے ربطی بھی پیدا ہو گئی ہے مثلاً

"نرنگ لال چمن نے کہانیوں کو بے جا طول نہیں دیا۔ گو کلام اسقام سے خالی نہیں، لیکن زبان صاف اور سلیس ہے اور قصے کی دلچسپی میں مزاحم نہیں ہوتی۔" (ص ۱۰۰)

کیا چیز مزاحم نہیں ہوتی؟ کیا صاف اور سلیس زبان؟ اسی طرح ایک جگہ ہے "اس کا قصہ غیر فطری اور سیدھا سادا ہے جس میں ایک رانی کا مور سے عشق کرنا اور اس پر جان دینا دکھایا گیا ہے" اس عبارت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولف کے نزدیک مور نامہ کا قصہ غیر فطری ہے۔ (ص ۲۷۸) آگے چل کر لکھتے ہیں "بظاہر اس مثنوی کا قصہ غیر فطری معلوم ہوتا ہے" لیکن ہمارے نزدیک مصنف نے اسے تمثیل (ALLEGORY) کے انداز پر نظم کیا ہے۔" (ص ۲۸۰) کچھ ہی دور آگے چل کر دوسرے بیان کی تردید کر دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں "ایک انسان سے مور کا عشق غیر عقلی بات ہے۔" (ص ۲۸۶)

کتاب کا نام محل نظر ہے۔ مولف نے کتاب کے اندر اکثر ماخوذ کی جگہ "مبنی" استعمال کیا ہے۔ یہی صحیح ہے یعنی "ہندوستانی قصوں پر مبنی اردو مثنویاں"۔

"دیوانِ عزلت" گجرات کے ایک قدیم اور مایہ ناز اردو شاعر کا نایاب دیوان ہے۔ جسے قریشی صاحب نے بڑی محنت سے مرتب کیا ہے اور اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بمبئی نے شائع کیا ہے۔ تذکرہ جناب سید جلال الدین بخاری ملقب بہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے سوانح حیات اور ان کی سماجی وسیاسی خدمات پر مشتمل ہے جسے سخاوت مرزا صاحب نے مرتب کیا ہے اور انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ اس ادارہ کے صدر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے پیش نظر کتاب کے بارے میں لکھا ہے کہ "لائق مولف نے کافی محنت اور کوشش سے مواد جمع کیا ہے اور ابھی مزید تحقیق وتدقیق کی گنجائش ہے"۔ ان دونوں کتابوں پر قاضی عبدالودود صاحب نے تفصیل سے تبصرہ فرمایا ہے، جسے ہم کسی اور موقع پر شائع کریں گے۔ "سام نامہ" کشمیری زبان کے ایک معروف شاعر بلبل ناگامی کی مثنوی ہے، جو اب تک شائع نہیں ہوئی تھی جموں وکشمیر اکیڈمی نے غلام نبی خیال کے مقدمہ کے ساتھ اسے شائع کیا ہے۔ "مثنوی لطف" دلی کے مشہور شاعر اور "تذکرۂ گلشن ہند" کے مولف مرزا علی لطف کی کمیاب مثنوی کو ڈاکٹر ثمینہ شوکت نے مختلف نسخوں سے مقابلہ کرکے مرتب کیا ہے اور مجلس تحقیقاتِ اردو حیدرآباد نے شائع کیا ہے۔ ان دونوں کتابوں پر کسی اور موقع پر تفصیل سے تبصرہ کیا جائے گا۔ نادم سیتاپوری صاحب کی کتاب "غالب نام آورم" مجھے نہیں مل سکی بقیہ دو کتابوں، لغات گجری اور تنکارنامہ پر قاضی عبدالودود صاحب کا تبصرہ ملاحظہ ہو۔

(ب)

لغات گجری (؟ لگج) مرتبہ جناب سید نجیب اشرف ندوی، سلسلۂ مطبوعات انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی۔ قیمت ۱۰ روپے۔

جناب سید نجیب اشرف ندوی کے پاس ایک مجہول المولف قلمی نسخہ ہے جس کی کتابت ۱۱۵۱ھ میں ایک گمنام شخص عطاء اللہ نے کسی نامعلوم جگہ میں کی تھی۔ اس کا کوئی دوسرا نسخہ باوجود تلاش انھیں اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ یہ گجرات میں ملا تھا، اور اس میں گجراتی الفاظ کی تعداد [illegible] (ممدوح) نے اس کا نام لغات گجری رکھ دیا ہے۔ اور اسے اپنے مختصر مقدمے

کے ساتھ جس کا تکملہ وہ آئندہ لکھنا چاہتے ہیں، شائع کر دیا ہے۔ لگج میں ایک سطر میں تین ہم معنی الفاظ عربی، فارسی اور ہندوستانی کے اسی ترتیب کے ساتھ ہیں: "الال دودمان کنیا"۔ الفاظ ابواب و فصول میں منقسم ہیں، اور ان کا مدار ہندوستانی الفاظ کے حرف آخر اور حرف ماقبل آخر پر ہے، مگر مولف بعض اوقات اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتا ہے، مثلاً نولہارا کے بعد ایک ہی فصل میں کسنا ہے۔ ایسے ہندوستانی الفاظ جن کے ہم معنی عربی فارسی الفاظ لگج میں درج ہیں، نثرہ چودہ سو سے زیادہ نہیں ان سے کہیں زیادہ جگہ حواشی نے لی ہے جن میں عہد عالمگیری تک کی کتابوں کے حوالے یقیناً ملتے ہیں اور اس کا امکان ہے کہ ان کے مآخذ میں ایک آدھ بعد کی کتاب بھی ہو۔

جناب مرتب کا خیال ہے کہ حواشی گیارھویں صدی ہجری کے اواخر سے قبل کے نہیں ہو سکتے، اس سے اختلاف ناممکن ہے۔ ان کے نزدیک لگج کا مولف اس کے محشی سے مختلف شخص ہے، جس کی وجہ سے وہ یہ بتلاتے ہیں کہ لگج گیارھویں صدی سے بہت قبل کی تالیف ہے۔ انھوں نے خالقباری سے اس کا مقابلہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ لگج اس سے قدیم تر ہے۔ ان کا بیان ہے کہ خالق باری کا جو نسخہ حفظ اللسان کے نام سے "مرتب" ہوا اس کی تاریخ "نصف آخر (= ۱۰۳۱) سے معلوم ہوتی ہے، مگر خود ان کے یہاں ایک نسخہ ہے جس کے خاتمے کی نظم[1] اس پر مشعر ہے کہ اسے ۷۳۶ھ میں خسرو پہلوی نے "مرتب" کیا تھا، اور ایک نسخہ اور ہے جس میں یہی نظم اس فرق کے ساتھ موجود ہے کہ اس میں پہلوی کی جگہ دہلوی ہے۔ انھوں نے صراحتہً کچھ نہیں کہا، لیکن ان کا میلان اسے قبول کرنے کی طرف ہے کہ خالق باری کا جو زمانہ ان نسخوں سے معلوم ہوتا ہے وہی ٹھیک ہے۔ اس صورت میں عہد جہانگیری میں مرتب ہونے کا جس نے دعویٰ کیا ہے اور مادۂ تاریخ نکالا ہے، وہ فریب دینا چاہتا ہے، یا خود فریب خوردہ ہے۔ جناب مرتب نے لگج اور خالقباری کے الفاظ ذیل نقل کر کے یہ فیصلہ صادر کیا ہے کہ لگج کی شکلیں "تاریخی ارتقاء کے لحاظ سے خالقباری کے الفاظ کی شکلوں سے

---

[1] اس نظم میں مرتب یا ترتیب کا لفظ نہیں آیا، تصنیف آیا ہے اس سلسلے میں ترتیب یا مرتب کے لفظ کا استعمال ٹھیک نہیں، یا اس پر مشعر ہے کہ یہ کتاب کسی اور کی ہے، خسرو صرف اسے مرتب کرنے والا ہے۔

قدیم تر ہیں؟

نگج: چناں، چھر، بیچھو، چوچی،[1] ڈاڈھی، کھاٹا، کاگ، اوکھلا، ہاٹھ، باڑھی، جگادل،[2] باندر[2]

خالقباری: چینا، چھرا، بچھو۔ چوچی،[1] داڑھی، کھٹا، کوا، اوکھلی، ہاٹ، بڑھی، چمگاڈر، بندر۔

انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ "بعض وقت اس لغت کے الفاظ اور ان کے معنی خالقباری کے مصرعوں کے ساتھ مل جاتے ہیں، مثلاً لغت "الصعوہ سرچپہ مولا" خالقباری "صعوہ سرچپہ مولا (جان) بالغت" المکنہ جاروب سوہنی، الموسی استرہ چھر" خالقباری۔

جاروب سوہنی کہ سیداست ڈوکرا (کذا) مقراض کترنی کہ بود استرا چھرا

بالغت "الثعلب یروباہ لونگڑی" خالق باری" فارسی روباہ ہندی لونگڑای" لغت الوعظ پند سکھ خالقباری نصیحت دیگر (کذا) وعظ اند از پند۔ ہندی بود سیکھ درکار بند" مثالیں لازماً قدامت نگج کی دلیل نہیں، اور لغت کی کتابوں میں الفاظ کا اشتراک ناگزیر ہے۔ جناب مرتب کا یہ عقیدہ بھی ہے کہ نگج" اردو کا قدیم ترین لغت ہے اور اس کے قریبی عہد میں جو نصاب نامے وغیرہ لکھے گئے ہیں وہ بڑی حد تک اس سے متاثر ہیں" یہ ناممکن نہیں کہ نگج ان سب سے قدیم تر ہو، لیکن یہ بات بہت مستبعد ہے کہ دوسرے اس سے متاثر ہوئے ہیں، ایسا ہوتا تو کتاب گمنام نہ ہوتی اور اس کے بکثرت نسخے ملتے۔ جناب مرتب کے دعاوی سے بحث کا مناسب وقت تکملہ کی اشاعت کے بعد آئے گا۔ مجھے توقع ہے کہ وہ ہر ہندوستانی لفظ سے متعلق مفصل معلومات پیش کریں گے کہ اصلاً ہندوستان کی کسی زبان کا ہے، گجراتی اور دکنی اردو میں ہے یا نہیں اور ہے تو کس شکل میں ہے۔ شمالی اردو میں اگر ہے تو مختلف اوقات میں اس کی کیا صورت رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اختلاف معانی رونما ہوا ہے تو اس سے بحث بھی ضروری ہے۔ خالقباری کے جن نسخوں کا انھوں نے ذکر کیا ہے ان کا مفصل حال بھی تکملے میں ہونا چاہیئے کہ پڑھنے والے بطور خود فیصلہ کر سکیں کہ ان کے خاتمے میں جو نظم ہے، وہ کسی جعلساز کی تصنیف تو نہیں۔

---

[1] [2] یہ شکلیں اب بھی ملتی ہیں۔

مقدمے میں لغات ناصری کے متعلق مرقوم ہے کہ اس کے "مدون" نے لغتوں کی یہ فہرست دی ہے" اور اس کے بعد فرہنگ جہانگیری، قانون شیخ اور شرع الشعرا وغیرہ کے نام ہیں۔ 'مدون' نے اپنے مآخذ کو لغت نہیں کہا اور وہ قانون شیخ اور شرع الشعرا کو لغت کہ بھی نہیں سکتا تھا۔ فہرست بالا میں سراج اللغات اور مصطلحات الشعرا ہے، صحیح نام سراج اللغۃ اور مصطلحات شعرا ہیں۔

" بعض الفاظ کے لغت نویس نے غلط معنی دیئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مفہوم ادا کرنے کے لئے دیسی میں صحیح مترادف سرے سے موجود ہی نہ تھے" مثال میں "الاعور کو رکانا" بھی ہے۔ ایک جگہ گنج میں یوں ہے، لیکن دوسری جگہ الاعور کے معنی اندھلا، درج ہیں۔ الاعور ہرگز ان الفاظ میں نہیں جن کا مترادف ہندوستانی زبانوں میں نہیں۔

تحفۃ الہند کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے: "یہ ایک عام لغت ہی نہیں ہے بلکہ ہندوستانی علوم وفنون اور زبان وادب کا دائرۃ المعارف ہے . . اس میں اس عہد (عہد عالمگیر) کی ادبی زبان برج بھاشا کے لغات و قواعد اور رسم خط کے علاوہ عروض قافیہ، صنائع و بدائع، موسیقی، جنسیات، علم قیافہ اور محاورات پر الگ الگ ابواب ہیں" ص ۳۲۳ اس میں شک نہیں کہ یہ ایک قابل قدر کتاب ہے لیکن، اسے ہندوستانی علوم وفنون اور زبان وادب کا دائرۃ المعارف" کہنا بڑا مبالغہ ہے۔ ہندوستان میں جن علوم وفنون کا انھوں نے ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ بھی علوم و فنون تھے، اور برج بھاشا ملک کی تنہا ادبی زبان نہ تھی۔ یہ بھی محل نظر ہے کہ تحفۃ الہند میں لغات کے علاوہ محاورات کا ایک باب ہے۔

مقدمے میں ایک جگہ رودکی کی تاج المصادر کا ذکر ہے۔ قدیم ترین کتاب جس میں رودکی کی طرف مصادر سے متعلق ایک کتاب منسوب کی گئی ہے، کشف الظنون ہے، اور اسے قبول کرنے کے لئے اس سے بہت قدیم تر سند درکار ہے۔ میرا خیال ہے کہ رودکی زوزنی کا مصحف ہے، موخر الذکر کی ایک کتاب مصادر سے متعلق موجود ہے۔

مقدمے میں شیخ واحدی اور شہاب الدین حکیم کرمانی کے بارے میں مرقوم ہے کہ حواشی میں ان کے نام کئی جگہ ہیں" ہمارا خیال ہے کہ ان کی طرف منسوب محشی میں جو کچھ لکھا ہے وہ دوسرے لغتوں سے

ماخوذ ہے"۔ ص ۴۲۔ ان دونوں سے مولف شرفنامہ نے استفادہ کیا تھا۔

ص ۴۳ میں 'ک نفی' کا ذکر ہے، 'ک' 'بن' کا مقابل ہے "مقدم الذکر بد اور موخر الذکر خوب کے لیے ہے" 'کپیچ'، 'کڈول'، 'کڈھب'، 'کراہ' وغیرہ اردو میں ملتی ہیں۔

ایک جگہ مقدمے میں کاگل = کاغذ ہے، 'کاگل' عجب نہیں اگر کاگد ہو، یہ لفظ اب بھی بعض لوگوں کی زبان پر ہے۔

ص ۴۱ میں ہے "ہمارے لغت نویس نے یہ معقول۔۔طریقہ اختیار کیا ہے کہ وہ ہر لفظ پر بڑے اہتمام سے اعراب لگاتا ہے"۔ (اس کے متعلق حاشیہ: اس سلسلے میں بعض مشکلات کی وجہ سے الفاظ پر اصل نسخے کی طرح اعراب نہ دے جاسکے۔ ۔ تکملے میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے گی)۔ واقعی یہ بڑے افسوس کی بات ہے اور اس سے اس نسخے کی سودمندی میں کمی ہوگئی ہے۔ اگر مشکلات کا سبب ٹائپ ہے تو تکملہ ہرگز ٹائپ میں نہ چھپوایا جائے اور اس جلی ٹائپ سے جو لغات کے لیے استعمال ہوا ہے (حواشی میں دوسرا ٹائپ) کسی صورت میں بھی کام نہ لیا جائے۔ اگر ادارے کو ضعیف البصر اصحاب کی رعایت ہی منظور تھی تو حواشی میں انھیں اس سے کیوں محروم کیا گیا ہے لغات کے حرکات کہیں کہیں دیے گئے ہیں، اور ان سے جابجا غلط شکلیں بھی پیدا ہوگئی ہیں لگچ کا پہلا لفظ 'الالہ'، الاُلہ چھپا ہے۔

لگچ میں اغلاط طباعت موجود ہیں مثلاً ص ا میں ستودہ کی جگہ ستدودہ ہے، ص ۷ میں کنکالش کے عوض کنکاش، ص ۵۹ میں کزچشم ہے، یہ کنرچشم ہے۔ ص ۸۹ میں پیدائش، یہ صحیح املا نہیں لغت نگار نے پیدائیں لکھا ہوگا۔ ص ۱۱۵ میں آرائش، یہ بھی آرایش ہوگا۔

حواشی میں قم مخفف قاموس ہے، مگر ص ۲۱ میں یہ عبارت "استینہ یاسین موقوف۔۔ آنرا تخم مرغ گویند" بحوالۂ قم درج ہے، قاموس میں فارسی عبارت کہاں سے آگئی؟

کتاب اردو کا قدیم ترین لغت ہو یا نہ ہو، اس کی اہمیت میں شک نہیں، آخر میں مجھے ادارے سے شکایت ہے کہ اے آر داؤد صاحب کا جو پیش لفظ لگچ اور دیوان عزلت کے ساتھ ہے اور غالباً ادارے کی دوسرے مطبوعات کے ساتھ بھی ہوگا جن کی اشاعت میں سرکار کی مدد شامل ہے

صوری کی جگہ صوروی اور تقاضا، کے عوض "تقاضہ" آیا ہے۔ انھیں اختیار ہے کہ اردو میں بھی اپنا نام اے آر داؤد لکھیں، لیکن برائے خدا اردو الفاظ میں اس طرح اصلاح نہ فرمائیں۔

اضافہ: میں نے لکھا ہے کہ جناب مرتب کا میلان خالقباری کے سنہ تالیف کو جوان کے نسخے میں ہے قبول کرنے کا ہے، اور ص ۵۴ کی عبارت سے یہی مترشح بھی ہوتا ہے، لیکن ص ۸ میں انھوں نے لکھا ہے "جہانگیر کے عہد میں .. نصابنات کی ابتدا ہوتی ہے اور اس سلسلے کی پہلی کتاب خالقباری یا حفظ اللسان ہے" وہ خود ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کی اصلی رائے کیا ہے۔

شکارنامہ: شکارنامہ حضرت گیسو دراز اور مماثل مثالیے دجنوبیہ (کذا) مرتبہ ڈاکٹر ثمینہ شوکت سلسلہ مطبوعات مجلس تحقیقات اردو حیدرآباد دکن۔ قیمت ۲ روپے۔

شکارنامہ حضرت گیسو دراز اور مماثل مثالیے دجنوبیہ کا مقدمہ ۹۰ صفحوں کا ہے اور اس میں حسب ذیل ابواب ہیں: حضرت گیسو دراز اور ان کا عہد، حضرت گیسو دراز، تصانیف، شکارنامہ اور اس کی اہمیت، شکارنامہ کے نسخے۔ میں پہلے اور دوسرے ابواب سے بالکل قطع نظر کرتے ہوئے، باقی ابواب کے بعض مباحث کے متعلق کچھ کہوں گا۔

ص ۵۶ + میں ہے "حضرت .. کی اردو تصانیف کی جانب سب سے پہلے حکیم شمس اللہ قادری نے ہماری توجہ منعطف کرائی تھی۔ عبدالحق مرحوم نے معراج العاشقین کے دیباچے میں لکھا تھا کہ میرے پاس حضرت کے متعدد رسالے اس زبان (دکنی اردو) میں .. موجود ہیں ... اس وقت ان کی دسترس میں وہ سارا تحقیقی مواد .. نہیں تھا جو آج .. منظر عام پر آچکا ہے معراج العاشقین کے مزید نسخوں کی عدم موجودگی اور حضرت .. کے دوسرے رسالوں کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے .. مرحوم نے معراج العاشقین کو حضرت .. سے منسوب کرتے ہوئے نہایت محتاط انداز اختیار کیا تھا تاہم ایک بات انھوں نے پورے ایقان کے ساتھ یہ لکھی تھی کہ حضرت ... اردو میں بھی ارشاد فرمایا کرتے تھے"۔ اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے (صوفیہ چاہیے) کرام کا کام کی ترتیب کے وقت .. مرحوم کا شبہ دور ہو چکا تھا، چنانچہ انھوں نے حضرت .. کے کئی اردو رسالوں کے نام بھی گنوائے ہیں جو ان کے کتب خانے میں موجود تھے۔ حضرت .. کی اردو مصنف کی حیثیت اب متعین اور مشخص ہو چکی ہے .. معراج العاشقین کے بیک وقت دو مختلف ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں جن

یں سے ایک آپ کا اردو کلام بھی.. اکٹھا کر کے شائع کر دیا گیا ہے۔ یہ سلسلہ یہیں ختم نہیں ہوتا، بلکہ بعض علماء کی توجہ برابر جاری رہی یہاں تک کہ ڈاکٹر نذیر احمد.. نے.. ایک کل نسخے کا پتا چلایا اور اسے.. مرتب کر لیا ہے.. حضرت سے منسوب تقریباً بیس اکیس تصانیف دستیاب ہوئی ہیں (ان کے تفاصیل).. میرے پیش نظر شکار نامہ کے تو نسخے ہیں.. شکار نامے کے مطالب پر مشتمل ایک فارسی رسالہ بھی آپ نے لکھایا تھا.. اس.. کے ہماری دسترس میں آجانے سے اردو شکار نامے کے استناد کے بارے میں ایک اور شہادت فراہم ہو جاتی ہے.. یہ بتایا جا چکا ہے کہ آپ فارسی میں جو ارشاد فرماتے تھے.. اردو میں بھی بیان کیا کرتے تھے.. آپ کے اردو اور فارسی اور عربی ارشادات کو لکھ لیا کرتے تھے۔ جس طرح برہان العاشقین کی کئی شرحیں لکھی گئیں اسی طرح اردو شکار نامے کی بھی کئی لوگوں نے اردو میں شرحیں لکھیں.. شکار نامہ کے متن کو میں نے نو مختلف نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے مخطوطوں کی تفصیل اوپر دی جا چکی ہے"

(۱) ڈاکٹر تمینہ شوکت نے حضرت گیسو دراز کے تصانیف عربی و فارسی کے سلسلے میں معاصرین کے اقوال پیش کئے ہیں، لیکن اس امر کے ثبوت میں کہ اردو میں بھی ان کی کتابیں ہیں حکیم شمس اللہ قادری وغیرہ عہد حاضر کے مصنفین کی سند دینے پر قناعت کی ہے۔

(۲) ایک شرح کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ شاہ برہان الدین جانم کی ہے، لیکن اس کا ثبوت اس سے زیادہ ان کے پاس نہیں کہ اس کا ایک نسخہ یہ ان کے کئی رسالوں کے ساتھ منسلک ہے" اس کی جو اہمیت ہے ظاہر ہے۔ دوسری شرحوں کے متعلق انھوں نے کچھ لکھا ہی نہیں۔

(۳) انھوں نے لکھا تو ہے کہ شکار نامہ کے نو نسخوں سے متعلق تفاصیل اوپر دیئے جا چکے ہیں لیکن یہ صحیح نہیں۔ باب پنجم کے آخر میں انھوں نے یہ البتہ بتایا ہے کہ یہ نو نسخے کہاں کہاں ہیں؛ یہ کس زمانے کے ہیں اور ان کا کاتب کون ہے، ان امور کے متعلق وہ اس جگہ بھی قطعاً خاموش ہیں ایک قلمی نسخے کی بحث آگے آئے گی۔

(۴) معراج العاشقین کا تین بار طبع ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ یہ حضرت گیسو دراز کی ہے، اور نہ اس کے یا شکار نامہ کے متعدد نسخوں کا دستیاب ہونا اس کا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کریما سیکڑوں

یا حضرت سعدی کے نام سے طبع ہوئی ہے اس کے سینکڑوں قلمی نسخے ملتے ہیں۔ اور تراجم میں بھی انھیں اس کا مصنف قرار دیا ہے، لیکن، ان امور کی بنا پر سعدی کی تصنیف تسلیم نہیں کی جا سکتی ڈاکٹر ثمینہ شوکت یہ ثابت کرنے سے قاصر رہی ہیں کہ اردو کی وہ کتابیں جو حضرت گیسو دراز کی طرف منسوب ہیں، واقعی ان کی ہیں۔

(۵) ڈاکٹر نذیر احمد صاحب سے جن کا قول اس معاملے میں مستند سمجھا جا سکتا ہے، اس سلسلے میں گفتگو ہوئی۔ ان کی رائے ہے کہ کوئی ایک بھی واقعی ان کا نہیں، ان رسائل (ہر رسالے کے بارے میں فرداً فرداً گفتگو نہیں ہوئی) کے مطالب ان کی فارسی کتابوں سے لیے گئے ہیں۔ مختلف نسخوں کے متون بہت مختلف ہیں، اور یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ کون سا رسالہ کس شخص کا لکھا ہوا ہے۔

رسالہ بیس پچیس سطروں میں ہے، اور ان کی شرح کم و بیش ۶۰ سطروں میں آئی ہے، یہ سب مع اختلافات نسخ ص ۹۱ تا ص ۱۰۰ میں درج ہیں اور ص ۱۰۰ کے آخر میں ایک قلمی نسخے کے کاتب کا نام اور اس کا زمانۂ کتابت ۱۱۶۹ھ مرقوم ہے۔

رسالہ شکار نامہ کی ابتدا کے اردو الفاظ یہ ہیں: "تو یا پال ہواسات مانواں کے ہمیں جایا فرزنداں تین ننگے یکس کوں کپڑ تیج ہیں جسے کپڑ تیج نہیں اس کی آستین میں پیکے تھے۔"

ڈاکٹر ثمینہ شوکت کا بیان ہے کہ حضرت گیسو دراز اہل علم کے لیے فارسی اور کم علم لوگوں کے لیے اردو میں باتیں کیا کرتے تھے۔ یہ رسالہ کم علم لوگوں کی سمجھ میں شرح کے بعد بھی بآسانی نہیں آسکتا۔ رسالۂ جنونیہ مقدمے میں شامل ہے اور ضمیمہ میں "سنت گیا نیشور کا بھارو ڈے" (ص ۱۰۱ تا ص ۱۰۳) درج ہے۔

۵۱

اُردو افسانہ ـــــ ایک تاثّراتی جائزہ

جناب ظفر پیامی

ایک افسانہ نگار کے لئے افسانے ہی پر لکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ اسے یقیناً ایسے ہی افسانے پسند آئیں گے جیسے کہ وہ خود لکھنا چاہتا ہے۔ میں اس لئے اپنے اس مختصر سے جائزے کو ان تمام ذہنی تعصبات سے مبرا نہیں کر سکا جو کسی بھی فنکار کو اپنی صنف فن کے بارے میں ہو سکتے ہیں۔

اس جائزے کے متعلق میری دوسری معذرت یہ ہے کہ اسے پچھلے سال کے افسانوی ادب کا جائزہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں گذشتہ سال میں چھاپی جانے والی کچھ کہانیوں کا ذکر ضرور آ گیا ہے لیکن بنیادی طور پر یہ ان چند تاثرات سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا جو پچھلے کئی برسوں سے افسانوی ادب کے بارے میں میرے ذہن میں آتے رہے ہیں۔ اس جائزے میں مثالیں بھی عموماً "بڑے" افسانہ نگاروں تک محدود رہی ہیں اس لئے ہم اپنے ہمعصروں سے معذرت خواہ ہیں۔

جدید افسانہ ایک غیر ملکی صنف ہے جسے اصل میں انھیں معیاروں سے ناپنا چاہیے جنھیں موپاساں، او ہنری، چیخوف، گورکی، ماہم، اور اسٹیفن زویگ وغیرہ نے قائم کیا ہے۔ میرے نزدیک ایک اچھے یا بُرے افسانے کے معیار کا ایک اہم پیمانہ یہی ہے کہ ہم اُسے کس حد تک دنیا کے افسانوی ادب کے معیار پر ناپ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو مجھے بہت حد تک سعادت حسن منٹو اور کچھ حد تک پریم چند کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام نظر نہیں آتا۔ یہی ہمارے افسانوی ادب کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم جس دور سے گزر چکے ہیں اور اب تک گزر رہے ہیں اس میں فنی قدروں کی اہمیت کم اور سیاسی ضرورتوں کا خیال زیادہ تھا۔ ہمارے افسانہ نگار تقریباً مجبور تھے کہ فنی لوازم کی پروا نہ کرتے ہوئے بھی وہ سب کچھ لکھیں جسے وہ عوام کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ اس سے بحث نہیں ہے کہ یہ بات اچھی ہے یا بُری لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طرح افسانوی تکنیک کا کوئی شعور پیدا نہیں ہو سکا۔ ستم تو یہ ہے کہ ہمارے

اکثر بڑے نقادوں نے بھی لکھتے وقت اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ ترقی پسند تنقید کے عروجی دور
میں تو دوسری اصناف سخن کی طرح افسانوں پر بھی بحث محض اس بنا پر ہوتی رہی ہے کہ ان میں سماجی
سیاسی قدروں کو صحیح شعور (بزعم خود) ہے یا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تمیز ہی مٹ گئی کہ کونسی تحریر
افسانہ ہے اور کونسی افسانہ نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ یارانِ تیز گام نے ہر اس تحریر کو افسانے میں جگہ
دینی شروع کر دی جو کسی اہم افسانہ نگار کے قلم سے نکلی ہوئی ہو۔ یوں تو گورکی نے بھی افسانہ نگاری
کے علاوہ طنزیہ مضامین لکھے ہیں، اسی طرح ماہم نے اخباری رپورٹیں اور ہمنگ وے نے جغرافیہ
کے رسالوں کے لئے واقعاتی سفرنامے تک لکھے ہیں لیکن وہاں پر کبھی ان چیزوں کو ادبی حیثیت
نہیں دی گئی۔ ہمارے ہاں پیروڈی، طنزیہ مضامین، سفرناموں، کرداری خاکوں اور انشائیوں
تک کو بڑے بڑے نقاد افسانے ہی میں شامل کرتے ہوئے نہیں ہچکچاتے مثال کے طور پر اردو کے
دو صاحب طرز اور صاحب کمال ادیبوں کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس نے پچھلے دنوں بہت
کچھ لکھا ہے جو قابل قدر ہے لیکن افسوس کہ ان کی اکثر تحریروں کو افسانے نہیں کیا جا سکتا۔

عصمت چغتائی کے بعض کیریکٹر اسکیچ مثلاً "چار بڑے" وغیرہ خاصے کی چیزیں ہیں۔ مگر انھیں
افسانوں میں شمار کرنا زیادتی ہو گی۔ غیر افسانوی اچھی تحریروں کی ایک اور مثال بیدی کا ناولٹ
"ایک چادر میلی سی" ہے۔ جو ناولٹ نگاری کی صنف میں یقیناً ایک شاندار اضافہ ہے لیکن
اردو افسانہ اس پر فخر نہیں کر سکتا کیونکہ وہ افسانہ ہی نہیں ہے۔ قرۃ العین حیدر کی ماضی
کی یادیں (خزاں کی ایک رات)، عزیز احمد کے امریکی سفرنامے، شفیق الرحمٰن کے طنزیے اور
اے حمید کے انشائیے بھی قابلِ توجہ تحریریں ہونے کے باوجود افسانے نہیں کہے جا سکتے۔ افسانوی
تیکنیک سے اسی لاپرواہی کا ایک اظہار یہ بھی ہے۔ ہمارے یہاں اب تک ایک کتاب تو کجا
ایک بھی قابلِ ذکر مضمون ہمارے کسی بڑے نقاد نے ایسا نہیں لکھا جس میں افسانے کے فنی لوازمات
یا کسی افسانہ نگار کے فنی پہلوؤں پر بات چیت کی گئی ہو۔ وقار عظیم کے بعض مضامین سے یہ امید
ضرور پیدا ہوتی تھی کہ وہ اس طرف زیادہ توجہ دیں گے لیکن یہ توقعات بھی پوری نہ ہو سکیں۔
ہمارے افسانے کی ایک خرابی تو یہی ہے کہ ان حدود ہی کا تعین نہیں ہو سکا جو افسانے کو

دوسری اصناف سے جدا کرتی ہیں۔ اسی خرابی نے کئی دوسری خامیاں بھی پیدا کر دی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ وہ تحریریں بھی جو اکثر و بیشتر افسانوی
شاہکار ملتی ہیں تکنیکل اعتبار سے انتہائی خام رہتی ہیں۔ مثلاً ہمارے اکثر افسانہ نگار یہ سمجھنے سے قاصر رہے ہیں کہ اچھی
کہانی کے بغیر اچھی کہانی نہیں لکھی جا سکتی۔ اچھی کہانی سے مراد واقعات کی بھرمار نہیں ہے۔ یہ بھی ضروری
نہیں ہے کہ اس کے کلائمکس میں "او ہنری" کی طرح کوئی ان دیکھا موڑ آ جائے ایڈگر ایلن پو کی طرح
خوف اور وہم کی کہانیاں لکھنا بھی ضروری نہیں ہے لیکن یہ ضرور سمجھنا چاہیئے کہ ذہن میں چند موڑ
آتے ہیں۔ یہ موڑ اگر نہ آئیں تو کہانی نہیں لکھی جا سکتی۔ کہانی یہ نہیں ہوتی کہ ایک نیک آدمی مرتے دم
تک نیکی پر گامزن رہا اور برا آدمی بھی آخر کار نیک بن گیا۔ لیکن یہ ضرور ہو سکتی کہ ایک نیک آدمی بظاہر
چند نیک مقاصد ہی کو پورا کرتے کرتے انتہائی خلوص کے ساتھ مجسم بدی بن گیا۔ سپاٹ اور بے جان
پلاٹ کا یہ رجحان ان ادیبوں کے ہاں خاص طور پر ہے جو پریم چند سے اثر لئے ہوئے ہیں۔ یہ
لوگ اب تک "منتر" "کفن" اور "شہیدِ وطن" کے دور کی باتیں کچھ اس طرح سے کرتے ہیں کہ
یقین ہی نہیں ہوتا کہ ہم ۱۹۶۲ء کی کوئی کہانی پڑھ رہے ہیں یا ۱۹۳۲ء کی۔

چینی حملے سے متعلق لکھی جانے والی کہانیوں میں بھی یہ رجحان خاص طور پر ابھرا ہے کہ
کہانی لکھنے کے لئے بس اتنا کافی ہے کہ اپنا ہیرو (یا ہیروئن) ہر طرح سے نیک بہادر، جری اور
تنومند ہو اور دشمن بدی کا مجسمہ۔ ہیروئن کا فرض ہے کہ وہ دلہن بننے سے پہلے شادی کے لئے
بنایا گیا زیور نیشنل ڈیفنس فنڈ میں دے ڈالے اور ہیرو صاحب سب کام چھوڑ کر محاذ جنگ پر چلے
جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ جذبے قابلِ قدر ہی نہیں قابلِ احترام بھی ہیں۔ لیکن ان قابلِ احترام جذبوں
کو فنی شکل دینے کے لئے فن کا احترام بھی ضروری ہے۔ ان فنی قدروں سے دوری ہی کا یہ نتیجہ
ہے کہ اب تک چینی حملے کے بارے میں لکھا تو ہر قابلِ ذکر افسانہ نگار نے، لیکن ایسا کوئی
افسانہ میری نظر سے نہیں گزرا جسے واقعی قابلِ ذکر کہا جا سکے۔

انہی دنوں ایک دوسری ہوا یہ چلی ہے کہ افسانے کے لئے ضرورت ہی نہیں کہ اس کی
بنیاد کسی کہانی پر ہو۔ اس کے علمبردار عموماً وہ لوگ ہیں جو اپنے آپ کو کافکا اور اسی قسم
کے دوسرے مغربی ادیبوں کا نام لیوا کہتے ہیں۔ یہ افسانے چونکہ انہی کا چربہ ہوتے ہیں اس لئے

ان میں نہ کسی قسم کی جدت کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی قابل لحاظ محنت کا۔ اہم لکھنے والوں میں ممتاز مفتی کے اکثر تازہ افسانے اسی المیئے کا شکار ہیں کہ وہ اچھی خاصی تحلیل نفسی کرتے کرتے خلا میں بھٹک جاتے ہیں۔ ایک اور قابل ذکر افسانہ نگار جو بڑی تیزی کے ساتھ اس بے معنی طرز تحریر کا شکار ہو رہا ہے غلام عباس ہیں۔ غلام عباس سے اردو افسانے کو بڑی توقعات وابستہ تھیں۔ ان کے "آنندی"، "کتبہ" اور چند دوسرے افسانے اردو افسانوی ادب کا مایہ ناز سرمایہ ہیں۔ لیکن ان کے تازہ مجموعے "جاڑے کی چاندنی" کے اکثر افسانوں کو ایک موڈ اور ماحول کے اظہار سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ موڈ اور ماحول کے اظہار کے لئے بھی افسانہ لکھا جا سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں کسی ذہنی ارتقا ریا سماج کے کسی نسبتاً غیر مانوس گوشے کی طرف اشارہ کیا جا سکے۔ افسوس ہے کہ غلام عباس کے بیشتر تازہ افسانے ان میں سے کوئی بھی شرط پوری نہیں کرتے۔

ہمارے ہاں جدید افسانے کی ایک اور خامی یہ بھی ہے کہ اگر اتفاقاً آغاز اچھا ہو بھی گیا تو انجام انتہائی پھسپھسا بے مزہ اور سپاٹ ہوگا۔ اچھے افسانہ نگار کے ذہن میں انجام ہی پہلے آنا چاہیئے آغاز بعد میں۔ ہمارے ہاں بات جہاں سے شروع ہوتی ہے وہیں پر ختم ہو جاتی ہے مثلاً ہیرو صاحب پہلے بھی تباہ حال تھے اب بھی تباہ حال ہیں۔ ٹھیکیدار شروع میں بھی برے تھے اور انجام تک برے ہی رہے۔ بہت سے فنی لوازمات کی طرح ہمارے ہاں بڑے افسانہ نگاروں میں اچھے انجام کا صحیح شعور صرف منٹو ہی کو تھا جس نے اپنے کمزور ترین افسانوں میں بھی یہ اہتمام رکھا کہ ان کا انجام ان کے آغاز سے بہتر ضرور ہو۔

موجودہ دور کے اہم افسانہ نگاروں میں قاسمی ہی غالباً واحد افسانہ نگار ہیں جو اس بات کا احساس رکھتے ہیں کہ انجام میں کوئی قطعیت ہونی چاہیئے۔ لیکن اپنے تازہ افسانے "نیتر" میں وہ بھی انجام کو نہایت ہی معمولی ہونے سے نہیں بچا سکے۔ کافی دن ہوئے خواجہ احمد عباس کا ایک افسانہ "ٹپ" پڑھا تھا۔ اسے بھی ایک عمدہ انجام کی اچھی مثال کہا جا سکتا ہے۔ رام لال کے حالیہ دو تین افسانے "ایک شہری پاکستان کا"، "دادی اماں" اور "کھیل" میں بھی اچھے انجام کا ٹیکنیکل شعور جھلکتا تھا۔ راجندر سنگھ بیدی کا "اپنے دکھ مجھے دے دو" میں جہاں دوسری خوبیاں تھیں

وہاں اسے اس لحاظ سے بھی ایک عمدہ افسانہ کہہ سکتے ہیں۔ نسبتاً خاموشی کے ساتھ لکھنے والوں میں
پریم ناتھ در کے تازہ افسانے "نیلی آنکھیں" میں بھی اس حقیقت کی مثال مل جائے گی کہ اچھے
انجام کا مطلب یہی نہیں ہوتا کہ ٹوپی میں سے خرگوش نکالا جائے بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے ایک
ایسی حقیقت آشکارا ہو جائے جو افسانے کا محرک بننے کے باوجود پڑھنے والے کے ذہن سے
دور رہی تھی۔

افسانے کے بنیادی لوازمات سے انکار کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے افسانہ نگار بحیثیت
مجموعی کوئی اہم کردار پیش نہیں کر سکے۔ منٹو نے موذیل یا لوگ بی ناتھ، تنکر ا، خوشیا، ٹوبہ ٹیک سنگھ
رادھا اور ایسے کئی ان گنت کردار ہمارے افسانے کو دیئے تھے۔ قاسمی کے بھی چند مثلاً "فجر" اور
"کنجری" کئی سال گزرنے کے بعد بھی ذہن میں تازہ ہیں۔ لیکن حال میں مشکل ہی سے کوئی افسانہ
ایسا پڑھا ہے جس کا کوئی بھی کردار ایک فنی تخلیق کی شکل میں ذہن میں سما سکا ہو۔ غالباً اس
[illegible] افسانہ لکھتے وقت یہ خیال نہیں رہتا کہ ایک سماجی تقاضے اور ادبی تقاضے
[illegible] مثلاً سماج میں ایک آدمی یکسر بُرا دکھایا جا سکتا ہے لیکن ادب میں
[illegible] کہ بُرے بہت برائی کرتے ہیں، بلکہ یہ ہوتا ہے کہ اچھے
[illegible] سے بن جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس نازک نکتے کا شعور
[illegible] نہیں ہے۔ کرشن چندر نے حال ہی میں "نئی ہیروئن"
[illegible] ظالم شوہر کو دکھایا گیا جو شروع میں بھی بیوی کو پیٹتا تھا تاکہ
[illegible] بعد میں بھی وہ اُسے مارتا رہا تاکہ وہ فلم کے ڈائریکٹر اور
[illegible] ایک اچھا افسانہ یوں بن سکتا تھا کہ یہی شخص شروع میں ذرا
[illegible] سے بات میں گوارا نہیں کرتا لیکن دھیرے دھیرے اس کا دماغ اس قدر
[illegible] بڑے سے بڑے گناہ کی پروا نہیں رہتی۔ یہ لنگڑے لولے اور بے جان
[illegible] کی صرف ایک مثال تھی ایسی مثالیں افسانوی ادب کے کسی بھی رسالے میں

وقتی تقاضوں کو پورا کرنے میں ہمارے افسانہ نگار اس قدر پُر خلوص واقع ہوئے ہیں کہ مقصدی جوش میں اکثر ان کے اکثر فنی مرقعے "اوٹ آف فوکس" تصویر کی طرح دھندلے ہو جاتے ہیں۔ کسی بھی بڑے واقعے کے بارے میں کہانیاں لکھتے وقت اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کے سماجی پہلو اس طرح آشکارا کئے جائیں کہ وہ کسی سیاسی پارٹی کا کیس محسوس ہو۔ مثلاً ایک سیٹھ جو ہر چیز میں بے ایمانی کرتا ہے جو اپنی بہو بیٹیوں کی عزت تک کی پروا نہیں کرتا اگر وہی جعلی دوائیں بیچ کر لوگوں کو موت کے منہ میں پہنچائے تو یہ ایک بڑا سماجی جرم ضرور ہوگا لیکن ادب اس سے متاثر نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر یہ دکھایا جا سکے کہ یہ دوا فروش واقعی ایک پُر خلوص انسان ہے وہ عبادت نیک نیتی کے ساتھ کرتا ہے وہ غریبوں کو روٹی محض دکھاوے کے لئے نہیں کھلاتا بلکہ اپنی آخرت سنوارنے کے لئے کھلاتا ہے۔ "بزنس" میں "بزنس اِز بزنس" کے اصول کے تحت بدترین قسم کی بے ایمانی سے گریز نہیں کرتا تو یہ واقعی ایک سماجی کہانی ہو سکتی ہے۔ مکمل کرداروں کو اس طرح پیش کرنے کی مثالیں ہماری تازہ افسانہ نگاری میں قریب قریب ناپید ہیں۔ البتہ اس کے برعکس مثالیں ہر جگہ مل جائیں گی اور تقریباً ہر اہم افسانہ نگار کے ہاں ملیں گی اس لئے یہاں پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

مقصدی جوش کے ساتھ ملتی ہوئی ایک اور بیماری جس کا شکار ہمارے اکثر بڑے افسانہ نگار ہیں مطالعے اور مشاہدے کی کمی ہے۔ افسانہ نگاری کے اس بنیادی لازمے کا فقدان ان افسانوں میں خاص طور پر نظر آئے گا جو غیر ملکوں کے بارے میں لکھے جاتے ہیں۔ ہمارے ان بزرگوں نے فرض کر لیا ہے کہ کسی بھی ملک کے بارے میں افسانہ لکھنے کے لئے فقط اتنا ہی کافی ہے کہ وہاں کے چند سُنے سنائے نام کرداروں کے طور پر استعمال ہو جائیں۔ اور کچھ کرداروں کو کسی بڑے واقعے میں پرو دیا جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے افسانہ نگار بڑی بے تکلفی کے ساتھ کوریا اور کونگو کے مسائل پر لکھ لیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب کچھ دیر بعد اپنی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو لوممبا کی موت پر لکھے ہوئے افسانے اور مارلن منرو کے مرثیے میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

ہم لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی غیر ملکی کردار کو اپنانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہمیں

نہ صرف وہاں کے سماجی محرکات اور تہذیبی ماحول کا پورا علم ہو بلکہ یہ بھی ہم جانتے ہوں کہ ایک خاص پوزیشن میں کسی ملک کا کوئی شوہر یا کوئی بیوی کو فسا ردعمل ظاہر کرے گی۔ مثلاً ہمارے ہاں ایک غیر محرم مرد کا کسی عورت سے یہ کہنا کہ تم بہت خوب صورت ہو" شاید کسی فساد کا باعث بن جائے لیکن مغربی تہذیب میں خوبی کی بات ہے کہ مرد عورت کی تعریف میں کچھ کہے شاید یہی وجہ تھی کہ دنیا کے بڑے افسانہ نگار سومرسٹ ماہم گورکی، ہیمنگ وے وغیرہ دنیا بھر گھومنے کے باوجود غیر ملکی کرداروں کو اپنے ہاں کوئی اہم جگہ نہیں دے سکے۔ میرا اپنا یہ حال ہے کہ میں آج تک کسی بھی غیر ملکی کردار کو (سوائے ایک میجر سوناکو کے جسے ایک عالمی کہا جا سکتا ہے) کو اپنانے کی ہمت نہیں کر سکا حالانکہ انہی ملکوں کے بارے میں سفرنامے یا مضامین وغیرہ لکھنا چنداں مشکل معلوم نہیں ہوتا۔

ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ گھر میں بیٹھ کر دنیا بھر کے ماحول کی عکاسی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ جن ملکوں کے بارے میں یہ افسانے لکھے جاتے ہیں وہاں پر اگر انھیں کبھی بھی پیش کیا گیا تو وہ انھیں پہچان بھی نہ سکیں گے۔ یہ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے بھی "آفاقی" درد اپنانے کے زعم میں شاعروں کی طرح" اجنتا، ایلورا، مونالیزا، روم اور پیرس وغیرہ کے چند نام رٹ لئے ہیں جنھیں وہ ہر افسانے میں استعمال کر کے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جذبات نگاری کا فرض پورا ہو گیا ـــــ اگر یہ احساس نہ ہوتا اور واقعی محنت کی جاتی تو عالمی امن فرقہ وارانہ فسادات (منٹو کے چند افسانوں، عباس کے "سردار جی" اور قاسمی کے پرمیشر سنگھ" وغیرہ کے علاوہ) اور حملہ چین پر کچھ اچھے افسانے لکھے جا سکتے تھے۔

مطالعے اور مشاہدے کی کمی ہی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں عموماً اوپر کے طبقے اور دیہات کی انتہائی کمزور تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ جہاں تک دیہاتی ماحول کی عکاسی کا سوال ہے قاسمی، بیدی، بلونت سنگھ، حیات اللہ انصاری اور سہیل عظیم آبادی کے اکثر و بیشتر افسانے کامیاب کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن اوپر کے طبقے کی عکاسی کرنے میں قرۃ العین حیدر اور کچھ حد تک غلام عباس کے سوا اور کوئی اہم افسانہ نگار کامیاب نہیں ہو سکا لیکن

قرۃ العین حیدر کی شکل یہ ہے کہ ان کے ہاں "عکاسی" اس قدر زیادہ ہو جاتی ہے کہ افسانہ نظر ہی نہیں آتا۔

بڑے طبقے پر سنی سنائی باتوں کے ذریعے لکھنے کا رجحان کس قدر خطرناک ہے اس کی ایک مثال قاسمی ایسے اچھے افسانہ نگار کا حالیہ افسانہ "بندگی بیچارگی" ہے۔ یہ افسانہ ایک ایسے شخص کے بارے میں ہے جو گاؤں سے شہر میں آیا ہے، ترقی کرتے کرتے افسر بن جاتا ہے اور پھر اسی ماحول کا شکار ہو کر اپنی بنیادی اخلاقی قدروں کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ یہ افسانہ جب تک گاؤں میں رہا، انتہائی کامیاب معلوم ہوا لیکن جونہی اسے افسروں اور ان کی بیویوں کی جھرمٹ میں لے جایا گیا تو انتہائی بچکانا دکھائی دینے لگا۔ اگر قاسمی ایسے محتاط افسانہ نگار کا حال یہ ہے تو دوسروں کا تو پوچھنا ہی کیا۔ چونکہ ہم میں سے بیشتر متوسط طبقے کی نچلی درمیانی یا اوپری تہوں ہی سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اس طبقے کی اچھی خاصی عکاسی ہم کر لیتے ہیں لیکن یہاں پر ہم لوگ اپنے آپ کے اس قدر قریب ہوتے ہیں کہ ایک عجیب قسم کے جذبہ "خود رحمی" کا شکار ہو کر سارے افسانے ہی کو مسخ کر ڈالتے ہیں۔ ہماری نئی لکھنے والی نامور خواتین کے فن میں یہ کمزوری خاص طور پر نمایاں ہے۔

اردو افسانہ نگاروں کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ان کے پاس لکھنے کو کوئی ایسا موضوع نہیں رہا ہو کہ وہ واقعی نیا کہہ سکیں۔ مثلاً پریم چند کے وقت میں سماجی ناانصافی کا مسئلہ ایک بڑا سوال تھا۔ یہ سوال اب بھی ختم نہیں ہوا۔ لیکن اب اس پر رائے عامہ تیار ہو چکی ہے کہ اسے ختم ہونا چاہیئے۔ اب سوشلزم چند سرپھروں کا ایک خواب نہیں رہا بلکہ ہندوستان کا نصب العین بن چکا ہے۔ گویا اب یہ کہنا کوئی معرکے کی بات نہیں رہا کہ سرمایہ دار غریبوں کا خون نچوڑتا ہے۔

یہی صورت جنس اور متعلقہ مسائل کی ہے۔ "انگارے" کی اشاعت سے بھڑکنے والے شعلے اب دوبارہ بھڑکائے نہیں جا سکتے۔ صرف اس لئے کہ ان شعلوں کی حدت سے ہمارے دماغ محفوظ ہو چکے ہیں۔ سیاسی مسائل پر لکھنا اس لئے دشوار ہے کہ سیاست کے

بارے میں نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی مسئلہ کب پیدا ہوگا اور کب پرانا ہو جائے گا (حالانکہ ہمارے ہاں اکثر سیاسی افسانے تو متعلقہ مسائل کے پرانے ہونے سے پہلے بذاتِ خود مر گئے تھے۔ ملاحظہ ہوں عالمی امن اور فرقہ وارانہ فسادات پر کہانیاں)

ایک اچھے ادیب اور ایک اچھے سیاست داں میں بنیادی فرق بھی ہوتا ہے کہ ایک اچھا سیاست داں آج کے مسائل پر عوامی رائے کو متاثر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک اچھا ادیب اس سے بھی دو قدم آگے جا کر کل کی بات آج سمجھاتا ہے۔ مثلاً جنگِ آزادی کے دوران میں سیاست داں جنگِ آزادی میں مصروف تھے۔ ہمارے ادیبوں نے جنگ آزادی کی حمایت کی، لیکن اسے ہی کافی نہیں سمجھا بلکہ اس سے آگے جا کر سماجی انصاف اور ذہنی آزادی کے لئے آواز اٹھائی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس وقت قوم پرست سیاست داں عوام میں خاصے مقبول تھے وہاں اتنے ہی آزادی پرست ادیب کئی بار عوامی رائے عامہ کے معتوب بھی بنے، صرف اس لئے کہ وہ سیاست سے دو قدم آگے تھے۔ آج ہمارے وہی ادیب آگے ہونے کے بجائے دو قدم پیچھے ہو گئے ہیں۔ ان کا کام ان بتوں کی قصیدہ خوانی رہ گیا ہے جنھیں کل ٹوٹ جانا ہے۔ ہم لوگ اپنے طور سمجھنے کی صلاحیت کو ترک کرتے جا رہے ہیں۔ ورنہ ہم دیکھ سکتے تھے کہ آج کا ایک بڑا مسئلہ فرد کی آزادی ہے۔ وہ آزادی جسے سرمایہ دارانہ سماج سے بھی اتنا ہی بڑا خطرہ ہے جتنا کہ کلیت پسند نظام سے ہے۔ محض اس بنا پر کوئی فیصلہ بذاتِ خود نیک نہیں کہلایا جا سکتا اس کی پشت پناہی جبر و سلطان کا جبر نہیں بلکہ وقتی طور پر رائے عامہ کر رکھا ہے۔ نہ ہی اس بات کی کوئی گارنٹی ہے کہ ایک حساس ذہن کے لئے "سوشلسٹ جبر" (حالانکہ میں خود سیاسی طور پر اپنے آپ کو سوشلسٹ کہنا پسند کروں گا) کسی آمرانہ جبر کے مقابلے میں کم تکلیف دہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ فرد کی آزادی اور سماجی انصاف میں توازن اور ربط وغیرہ کے مسئلے ایسے ہیں جن کا کوئی بھی خاطر خواہ حل اب تک دنیا میں کہیں بھی پیش نہیں کیا جا سکا لیکن ادیب کو اس سے غرض نہیں ہو سکتی کہ اس کی مانگ قبول ہوگی یا نہیں ـــــ بلکہ جس دن یہ حل نکل آیا اس دن شاید ادیب

کے لیے اس موضوع کی اہمیت ہی بڑی حد تک ختم ہو جائے۔ شک کی شمعوں کو خونِ جگر سے روشن کئے رکھنے ہی سے یقین کی منزلیں قریب آسکتی ہیں۔ مجھے اپنے ہم عصروں میں اِسی شک کی مقدس تلاش رہی ہے۔ وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ غالباً اسی کا نہ ہونا اس بات کے لئے ذمہ دار ہے کہ آج عالمی کیا، ایشیائی ادب میں اردو افسانے کی (پریم چند اور منٹو کے علاوہ) کوئی جگہ نظر نہیں آتی۔

ایک اچھے ادیب کے ارتقا کے لئے محض یہی کافی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آغاز کی روایتوں کو برقرار رکھے یا ان کے مقابلے میں کچھ حد تک ترقی کرے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس کا ارتقاء اس رفتار کے مطابق ہو جس کی امیدیں شروع میں اس سے وابستہ ہو چکی تھیں۔ اردو افسانے کو اگر اس نظر سے دیکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ ہمارے ماضی کی روایتیں بری بھلی جو تھیں وقت کے مطابق بہت شاندار اور جاندار تھیں۔ ان سے اس بچے کی ذہانت کا خیال آتا تھا جس نے بچپن ہی میں لڑکپن کے رنگ ڈھنگ دکھلانے شروع کر دیئے ہوں۔ لیکن اس وقت ہماری افسانہ نگاری کی حالت اس بگڑے رئیس زادے ایسی ہے جو سن بلوغ کو پہنچ کو بھی لڑکپن کے حدود سے آگے نہ بڑھا ہو۔ یہی ہمارے افسانے کی سب سے مایوس کن حقیقت ہے۔

(بقیہ وفیات (بہ سلسلہ صفحہ ۸۲))

لکھنؤ کے کہنہ مشق شاعر ابوالفضل شمسؔ لکھنوی کا ۱۵ ردسمبر کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ مرحوم نے عمر بھر اردو شعر و ادب کی خدمت کی اور ان کے فیض سخن سے سینکڑوں تلامذہ مستفیض ہوئے مرحوم لکھنوی زبان اور انداز بیان کے جوہری تھے۔

(فروغ اردو۔ جنوری ۱۹۶۳ء)

۱۹۶۲ء کے شعری ادب پر ایک نظر

جناب علی جواد زیدی

کسی زبان کے شعر و ادب کا جائزہ لینے کے لئے ایک سال کی مدت ویسے بھی نا کافی ہے اور جب یہ جائزہ ایک سالانہ تقریب بن جائے تو دشواری کچھ بڑھ ہی جاتی ہے۔ اگر اس سال کچھ نئے رجحانات ابھرے ہوں تو مسئلہ آسان ہوتا ہے لیکن جب یہ صورت بھی نہ ہو تو چلتا ہوا قلم رکنے لگتا ہے۔ ۱۹۶۲ء کچھ ایسا ہی حسبِ دستور قدیم قسم کا سال رہا ہے۔ کم از کم شعر و نظم کی فضا میں کوئی غیر معمولی تموج نظر نہیں آتا۔ البتہ مطبوعات کی تعداد اس سال غیر معمولی طور پر زیادہ رہی ہے۔ جو کتابیں صرف میرے علم میں آئی ہیں ان کی تعداد ۲۲ کے قریب پہنچتی ہے یقیناً کچھ ایسے مجموعے بھی ہوں گے جن تک میری رسائی نہیں ہو پائی ہے۔ ایک سال میں اتنے شعری مجموعوں کی اشاعت، جہاں یہ خوش آیند خیال پیدا کرتی ہے کہ غالباً پڑھنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، وہاں یہ دیکھ کر دکھ بھی ہوتا ہے کہ اردو کے اشاعتی پروگرام میں ایک واضح عدم توازن آتا جا رہا ہے شعر و شاعری کے مجموعے اور زیادہ بھی چھپیں تو برا نہیں ہے، لیکن جہاں چشم بد دور اردو میں شعری مجموعوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے، وہاں علوم و فنون پر کتابیں عنقا ہوتی جا رہی ہیں نثر پر بھی پوری کتابیں شاذ ہی دیکھنے میں آتی ہیں۔ تحقیق کے میدان میں جو کام ہو رہا ہے وہ دو چار مستثنیات کو چھوڑ کر بنیادی نوعیت کا کم ہے اور وہاں بھی گونہ سہل پسندی نمایاں ہے۔

یہاں اس عدم توازن کے اسباب و علل پر گفتگو کا محل نہیں ہے لیکن شعری مجموعوں کی یہ بہتات خوش آیند نتائج کی حامل نہیں ہو سکتی۔ اگر پوری نسل کا مزاج عاشقانہ، رومانی، رندانہ بن گیا تو وہ موجودہ عہدِ ٹکنالوجی کے مقتضیات سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا شعری مجموعوں کی اشاعت پر کوئی اخلاقی پابندی عاید کر دی جائے، لیکن وقت آگیا ہے کہ شعرائے کرام کمیت سے زیادہ کیفیت پر دھیان دیں اور مجموعے کی ترتیب میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ناقدین نے بھی جو کوری تقریظ نگاری اور

معرفت رساں مصلحت شناسی اختیار کرلی ہے۔ اسے ترک کریں اور لغزشوں اور خامیوں پر کڑی نظر رکھیں تاکہ شعر و نظم کے سانچے میں جو کچھ ڈھل کر آئے وہ فنی صلاحیتوں اور موضوعاتی اہمیت کے اعتبار سے اہم ہو۔

۱۹۶۲ء میں شائع ہونے والی کتابوں میں سے تین نو پرانی کتابوں کے دوسرے ایڈیشن ہیں غلام ربانی تاباں کی "حدیثِ دل"، عزیز وارثی کی "سفینہ و ساحل" اور عرش صہبائی کی "شگفتِ گل"۔ ان تینوں ہی کتابوں کے پہلے ایڈیشن ابھی مشکل سے دو برس پہلے شائع ہوتے ہوں گے۔ اتنی سرعت سے پہلے ایڈیشن کا بک جانا، فالِ نیک ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکال لینا مناسب نہ ہوگا کہ ایڈیشنوں کا تواتر ہی معیارِ شعر ہے۔ تاباں کے تغزل میں بڑی جان ہے کیونکہ اس کا عشق خود دار اور اس کی وفا دو طرفہ ہے۔ اس کا محبوب خود درد آشنا ہے مگر بھکینت نہیں ہے۔ اس کی "ادا ادا میں احتیاط" کا عالم ہے لیکن جس چیز نے تاباں کی غزل کو ایک نیا آہنگ دیا ہے وہ عروج فکر و فروغ نظر کے ساتھ سوز آرزو مندی کا حسین امتزاج ہے۔ اگرچہ تاباں کے یہاں بعض اوقات کھلے سیاسی افکار مکیدے کی اصطلاح میں بیان ہوئے ہیں، لیکن اس کا جو جواز انھوں نے دیا ہے مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ جو لوگ تشبیہ و استعارہ کچھ کہنا چاہتے ہیں ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ عزیز وارثی جو نوح ناروی کے شاگرد ہیں، صاف ستھری اور اسقام سے پاک زبان لکھتے ہیں اور مزے سے کہتے ہیں مقبول شاعر ہیں۔ انھوں نے غزلوں کے ساتھ نظمیں بھی لکھی ہیں۔ عرش صہبائی نسبتاً دونوں سے جوان تر ہیں، جوش ملسیانی کے شاگرد اور جموں کے رہنے والے ہیں۔ ہلکی پھلکی زبان میں مترنم غزلیں لکھتے ہیں، "شگفت گل" میں مصوری کے جو نمونے دیئے گئے ہیں وہ نہ ہوتے تو اچھا تھا۔

"انجمن ترقی اردو" نے کئی برس سے "اردو شاعروں کا انتخابی سلسلہ" قائم کر رکھا ہے۔ اس سال اس سلسلے میں شفیق جونپوری، نشور واحدی، شمیم کرہانی اور جوہر نظامی کے انتخابات شائع ہوئے ہیں۔ ان میں سے شفیق اور نشور کے یہاں صرف غزلوں کا انتخاب ہے اور شمیم اور جوہر کے یہاں نظمیں اور غزلیں دونوں ہیں۔ پتہ نہیں انتخاب کن اصحاب نے کیا ہے۔ کم از کم انجمن جو انتخابات شائع کرے ان کا ایک معیار ہونا چاہیئے اور ان کو صرف ایک شخص کی پسند و ناپسند پر مبنی نہ ہونا چاہیئے شفیق کے

انتخاب کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ان کے بہت سے بہتر اشعار رہ گئے اور ایسے اشعار شامل کر لئے گئے جو نہ ہوتے تو بُرا نہ ہوتا۔

جوہر نظامی کے کلام میں بعض ناہمواریاں کھٹکتی ہیں۔ مثلاً ان کا ایک مصرع ہے ؎

"زمانے کی تجھے ان ہنبہ درگوشی سے کیا مطلب؟"

اس میں تعقیدِ بیّن کے علاوہ 'اِن' کے ساتھ "پنبہ درگوشی" غلط ہے۔ ممکن ہے کہ یہ غلطی کتابت کی ہو اور اصل میں 'اس' ہو لیکن 'اِن' اور 'اس' دونوں ہی حشو و زوائد ہیں۔ کسی خاص پنبہ درگوشی کا ذکر نہیں ہے۔ اسی طرح اتاترک کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ ؎

جانتا تھا خوب ہی تو جادہ پیمائی کا فن

پتہ نہیں کہ جادہ پیمائی کو فن کیوں کہا گیا ہے اور اگر کوئی فن ہو بھی تو اس میں اتاترک کے لئے عظمت کا کیا پہلو نکلتا ہے! اسی طرح ایک مصرعہ ہے ؎

تیری نظر میں ہے تمام رازِ حیات قوم کا

انتخاب کنندہ نے یہ تو دیکھ لیا ہوتا کہ روانی کی تیز رفتاری میں کہیں کوئی مسلّم حرف پس کر تو نہیں رہ گیا۔ ایک اور شعر ہے ؎

ہائے وہ تالاب ہاں جس کے کنارے پر کبھی ۔۔۔ چاندنی راتوں میں باندھا تو نے عہدِ دوستی

'ہائے' کے فوراً بعد "ہاں" بے محل ہے۔ 'کنارے' کے ساتھ "پر" لگانے کی بھی چنداں ضرورت نہ تھی۔ اور باندھا کی بجائے "باندھا تھا" ہونا چاہیئے تھا۔ ایک جگہ کہا گیا ہے کہ ؎

وہ عرضِ صبح و شام کی وہ التجا گئی

ظاہر ہے کہ یہاں صبح اور شام کے مابین واؤ کی نہیں بلکہ "اور" کی حاجت تھی۔ ایک اور مصرعہ ہے ؎

چند دنوں کے واسطے ہونا نہ نواندوہ گیں

اگر 'دنوں' کی بجائے صرف 'دن' کہا گیا ہوتا تو کوئی حرف نہ گرتا۔ غزل کا ایک شعر ہے ؎

بخشا کسی نے آنکھ کو وہ کیفِ سرمدی ۔۔۔ آئینہ میں خود اپنی نظر دیکھتے رہے

'دیکھتے رہے' فاعل کا محتاج ہے 'وہ' دیکھتے رہے یا 'ہم'؟ اسی غزل کا شعر ہے ؎

اپنی نظر کے سامنے جلتا رہا چمن   جلتے ہوئے ہم آنکھوں سے گھر دیکھتے رہے

انتخاب کرنے والے کی نظر سے غالباً مشہور شعر تو گزرا ہی ہوگا ؎

زور ہی کیا تھا جفائے باغباں دیکھا کئے   آشیاں اجڑا کیا ہم ناتواں دیکھا کئے

جو سحر نظامی کے یہاں فکری حسن موجود ہے "کنارے کنارے" اور "ہنگام ناؤ نوش" لکھنے والے فنکار سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ فن کی طرف خصوصی توجہ کریں گے، اور انجمن سے یہ مطالبہ کہ وہ انتخاب کے وقت زیادہ دقت نظر سے کام لیں گے۔

نشور واحدی نے اپنی غزل کے بارے میں کہا ہے کہ "تخیل پاک ——— بازانہ مگر انداز رندانہ" معلوم نہیں کہ انھیں پاکبازی کے اظہار کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ عشق کے معاملات خام کی عکاسی انھوں نے جس لطافت اور فنکارانہ چابکدستی سے کی ہے وہ آپ اپنا جواز ہے۔ شروع میں اُن کے یہاں واردات قلبیہ اور خمریات کا عنصر زیادہ ہے، لیکن پھر وہ رموز کائنات کی وسعتوں سے آشنا ہو کر ایک نئی سادگی و پرکاری کے خالق بنے۔ انتخاب میں ان کی چند نظمیں بھی شامل ہیں، جو کہیں کہیں تو غزل مسلسل کا مزا دیتی ہیں۔ نشور کے شعروں میں ایک لرسیلا پن اور انداز بیان میں البیلا پن ہے خدا کرے کہ وہ ندرت ادا کو اپنی حدوں میں رکھنے پر اسی طرح جمے رہیں۔

شمیم فی الحقیقت نظموں کے شاعر ہیں اور انھوں نے کئی نظمیں بہت اچھی کہی ہیں۔ معمولی معمولی واقعات و واردات سے لے کر بڑے بڑے سیاسی معاملات تک ان کی نظموں میں بیان ہوئے ہیں اور فنی دلکشی کے ساتھ۔ شمیم کو تلخیوں کا پورا احساس ہے لیکن وہ بڑا رجائی ہے ؏

زہر ہی زہر نہیں دہر میں پینے کے لئے

اس کی غزلوں میں تفکر کے ساتھ ساتھ خوشگوار حلاوت بھی ہے۔ نشور ہی کی طرح شمیم کے کلام میں بھی تازگی کا احساس ہوتا ہے اور دونوں کی شاعری اسقام سے پاک ہے۔

یہاں تک وہ نظمیں اور غزلیں تھیں جو تند کرہ کے طور پر ۱۹۶۲ء میں پیش ہوئیں۔ لیکن مظہر امام کا مجموعہ "زخم تمنا" اسی سال کا تحفہ ہے۔ اگرچہ مظہر امام نے غزلیں بھی کہی ہیں اور ان میں کچھ بانکے شعر بھی نکالے ہیں لیکن وہ نظموں ہی کے بھرپور شاعر ہیں۔ تشکیک اور کشمکش۔ محرومی اور یادیں۔ ان عناصر سے

تسکین پانے والی شاعری میں تضاد بھی ہوتا ہے اور وہ مظہر امام کے یہاں پایا جاتا ہے لیکن ان کی نظموں میں ایک سنبھلا ہوا انداز، ایک متحرک شعور، ایک بیدار مشاہدہ ضرور ملتا ہے اور یہ بات خلوص کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ غزلوں میں بھی ایک کیفیت ہے ؎

میرے روکے نہ رکا وقت کا طوفاں، لیکن
اک دیا میں نے سرِ راہ جلایا تو سہی

اردو منظومات کی طباعت کے سلسلے میں جو اہتمام خاص برتا جانے لگا ہے "دل ناداں" اس کا نمائندہ ہے۔ کرشن موہن کا "شبنم شبنم" بھی بہت خوب چھپا تھا اور "دل ناداں" یقیناً خوب تر ہے۔ طباعت کے اعتبار سے "حدیث دل" اور "زمزمہ" بھی اچھے ہیں۔ کرشن موہن کی شاعری بعض خصوصی اوصاف کی حامل ہے اور اس لئے علیحدہ تذکرہ چاہتی ہے۔ کرشن موہن کا عشق لمسِ حُسن سے آشنا ہے لیکن اس کے حُسن و عشق میں ایک ماورائیت بھی ہے جو دونوں ہی کو ایک تقدس بھی عطا کر دیتی ہے اور شاعر کو رندانہ پاکبازی کا مظہر بنا دیتی ہے۔ کرشن موہن کی نظموں اور غزلوں میں ہندوستانی پن ہے اور اس کا رشتہ ہماری قدیم ثقافتی روایتوں اور سنسکرت کے اسالیب اظہار سے جا ملتا ہے۔ ان کے یہاں نئی راہیں ڈھونڈھنے کا ذوق بھی ہے اور مزاجِ زبان سے قریب رہنے کا شوق بھی۔ یہی سبب ہے کہ ان کی جدت پسندی متوازن بھی ہے اور خوش آیند بھی۔

خالص غزلوں کے چار مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ حیرت شملوی کا "آئینہ حیرت"، رشید کوثر فاروقی کا "زمزمہ"، ساحر بھوپالی کا "یدِ بیضا" اور خاور نوری کا "شب چراغ"، اور تین مجموعے مخلوط ہیں یعنی ان میں غزلیں اور نظمیں دونوں پائی جاتی ہیں۔ موخر الذکر مجموعوں میں بانو طاہرہ سعید کا "برگ سبز" مہندر رینہ کا "خرام صبا" اور سنتوش کمار سکسینہ سورج رام پوری کا "اشک و تبسم" ہیں۔ خالص نظموں کا مجموعہ اس سال صرف ایک شائع ہوا ہے اور وہ ہے حضرت اثر لکھنوی کا "عروس فطرت"۔ اس میں بھی دو ایک غزلیں ہیں مگر وہ مسلسل ہیں اور معنویت کے اعتبار سے نظم ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی سال رام کرشن مضطر اور دوار کا داس شعلہ کے مجموعے بھی نکلے ہیں، مگر میرے دیکھنے میں نہیں آئے باقی مجموعوں کے دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غزل کا از سر نو احیاء ہو رہا ہے۔ یہ احساس کچھ دنوں پہلے سے ہونے لگا

تھا اور بعض ناقدین نے اس کی جانب اشارے بھی کئے تھے لیکن یہ رفتار تیز تر ہی ہوتی جا رہی ہے۔ جذبی اور تاباں کے سے غزل گو تو اب بھول کر بھی نظموں کی طرف نہیں بھٹکتے، لیکن یہ لوگ تو بنیادی طور پر تھے ہی غزل گو ادھر کچھ دنوں سے بہت سے نظم گو بھی غزل کی شاعری میں مصروف ہیں۔ غزل کو یہ تازہ مقبولیت مبارک، لیکن نظم کی پسپائی ضرور کھٹک رہی ہے۔ مظہر امام، کرشن موہن، سلام مچھلی شہری اور رفعت سروش کی صفوں میں اضافے کی ضرورت ہے اب تو اس ایران میں بھی، جس نے ہمیں غزلوں کی طرف راغب کیا، غزلوں کی یہ بھرمار نہیں رہ گئی ہے اور نظموں کو وہاں قبول عام کا مرتبہ حاصل ہو چکا ہے۔ اردو والوں کی رفتار کب سنبھلے گی۔ ؟

نئے ابھرنے والے غزل گویوں میں خاور نوری اور رشید کوثر فاروقی کی خوش سلیقگی جاذب توجہ ہے۔ کلام بے عیب اور بے داغ ہے۔ خاور زاہد خشک تو نہیں ہے لیکن وہ گناہ سے ڈرتا اور گناہ گار کو بہر حال "گناہ بدوش" مانتا ہے اور اسے "اہل دنیا کی نئی کوشش رفتار" میں "طرز گمراہی انسان" نظر آتا ہے۔ غزل کی آواز میں بعض اوقات ایسی عمومیت ہوتی ہے کہ کم شعور رکھنے والے غلط نتائج بھی اخذ کر سکتے ہیں مثلاً یہی "نئی کوشش رفتار" سے مراد اگر انسان کا "ذوق بربادی" ہے تو اس عمل سے کسی کو دلچسپی نہیں ہو سکتی لیکن اگر اس "کوشش رفتار" کا دائرہ ترقی جدید تمام ضروری عناصر کو محیط ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسا رجحان غیر صالح ہوگا۔ غیر صالح رجحانات کی بات ہیں رشید کوثر تک سلے جاتی ہے۔ انھوں نے ایک اسلامی غزل کا نعرہ دے کر غزل کے ماضی وحال کے علاوہ پوری شاعری کی تاریخ کو قاضی شہر کے دربار میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ وہ "حرم اور جنت کے استہزاء" سے ہی بیزار نہیں ہیں بلکہ تصوف سے بھی خفا ہیں اور وحدت وجود و وحدت شہود دونوں کی گنجائش غزل میں نہیں رکھتے۔ وہ "مادیتین کے فلسفہ عقلیت" سے بھی برسر پیکار ہیں۔ اگر ہم نے اس بات کو زیادہ پھیلایا تو وہ دن دور نہیں جب "ہند و غزل" "اور مسلم غزل" کی سی چیزیں سامنے آنے لگیں گی۔ جہاں تک معتقدات کے استہزا و استخفاف کا تعلق ہے یہ امر لازمہ تغزل کبھی نہیں تھا، لیکن کہنے والوں پر روک ٹوک بھی نہ تھی اور ہو بھی نہیں سکتی تھی، کیونکہ غزل گویوں کے مذہبی، سیاسی اور سماجی معتقدات مختلف رہے ہیں۔ اور رہا کریں گے۔ لیکن کوثر کی غزل کا سب سے دلچسپ پہلو ان کے لفظوں میں یہ ہے :۔

"میں نے صنف نازک کی دلآویزیوں سے اپنی غزلوں کی تزئین کی ہے لیکن میرے ان اشعار

کا تعلق جلوہ طرازانِ سربام وعشوہ فروشانِ سرِ راہ سے نہیں بیری اپنی رفیقۂ حیات سے ہو"
ایک توغزل میں اپنی رفیقۂ حیات کی دلآویزیوں کا تذکرہ اور اس کی اشاعت کس مقصد کے تحت کی جاتی ہے؟ دوسرے، اگر یہ سچ ہے تو ان اشعار کے بارے میں وہ کیا فرمائیں گے؟

جس وقت انجمن میں تیری نگاہ اٹھی ۔۔۔ حلقہ بنا کے گزرے سر بار ماہ و انجم
ہر سینہ آفتاب تھا ہر چہرہ ماہتاب ۔۔۔ معصومی نگاہ نے دیکھا جہاں کہیں

حقیقت یہ ہے کہ جو حسن ساری کائنات میں بکھرا پڑا ہے، اس کو کوئی ایک ہستی میں محصور کیسے کر سکتا ہے اور جو عشق کا جذبہ جبلّت و فطرت ہے، اس پر فلسفیانہ پابندیاں کوئی عاید کر سکتا ہے۔ ہاں خود سماج ہی نے اس سلسلے میں بھی کچھ اخلاقی اقدار ابھارے ہیں اور ان کا احترام ضروری ہے۔

مختصر یہ کہ "اسلامی غزل" کا تصور ناسائنسی ہے اور اس کے برتنے میں خود کوثر صاحب بھی کامیاب نہیں رہے ہیں۔ البتہ ان کے یہاں عزم و ہمت، عمل و حرکت، شوق و ذوق کی جھلک بڑے شاعرانہ انداز میں دکھائی دیتی ہے اور ان مطالب میں انھوں نے شگفتہ شعر نکالے ہیں۔ یہی اس مجموعہ کا جواز ہے۔ یہاں کوثر صاحب کے نظریۂ شعری پر اس سے زیادہ بحث کا موقع نہیں ہے یا زندہ صحبت باقی۔

اثر صاحب نے "عروسِ فطرت" کی سدا بہار دوشیزگی کے اظہار کے لئے وادیٔ کشمیر کے حسنِ جاں فروز کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اگرچہ انداز بیانیہ ہے لیکن زبان اور طرزِ بیان کی لطافتوں نے سادگی میں بھی بناؤ کے لاتعداد پہلو نکالے ہیں۔ آخر میں مسلسل غزلوں اور قصاید کی چند تشبیہوں کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ آج کل کی شہری زندگی نے اہلِ نظر تک کو فطرت سے دور کر دیا ہے۔ وہ جادو جو پہاڑوں کے سکوت، آبشاروں کے ترنم، دریاؤں کی روانی، پھولوں کی مسکراہٹ اور حسن کی معصوم لگاوٹ میں پنہاں ہے اور جو ہمیں فطرت سے محبت کرنا سکھاتا ہے اس سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ اثر صاحب نے اپنی استادانہ شاعری سے ہمیں اس جادو کا ایک پہلو دکھلایا ہے۔ اور ان کی یہ سعی یقیناً مشکور رہے۔ وسیع کائنات کا اصلی حسن اس ربط میں پنہاں ہے جو انسان کا وجود کائنات کو عطا کرتا ہے۔ اس لئے فطری شاعری میں انسان کا متحرک وجود جو اثر پذیر ہی نہیں موثر بھی ہو، نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیئے۔ اثر صاحب نے

علی العموم اسی انسان کو دیکھا ہے جو حالات سے اور گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہے، لیکن کہیں کہیں ایسا ضرور محسوس ہوتا ہے کہ ایک قدم اور آگے جانے کی ضرورت تھی۔

۱۹۶۲ء کی شعری تصنیفات میں دو مجموعے ایسے بھی ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے خصوصی ذکر کے قابل ہیں۔ ایک تو عشرت کرتپوری کا "پاک زمین ناپاک قدم" اور انور صابری کا "چین چلو" ان دونوں مجموعوں میں ان وطنی ولولوں اور حوصلوں کی عکاسی کی گئی ہے، جو چین کے حملے کے بعد ملک کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں نمایاں ہیں۔ چینی جارحیت کے خلاف جس طرح ملک کا بچہ بچہ حوصلہ و دل آگے بڑھا ہے اور سارے ملک نے تمام اختلافات بھلا کے جس یک جہتی اور اتفاق کا مظاہرہ کیا ہے، یہ مجموعے اس کا آئینہ دار ہیں۔

قاضی غلام محمد کا "حرف شیریں" مزاحیہ ادب کا تنہا مگر وقیع نمائندہ ہے۔ غلام محمد صاحب، ریاضیات کے پروفیسر ہیں لیکن مذاق سلیم کے مالک اور بےحد زندہ دل ہیں۔ ان کا مزاج متانت و سنجیدگی کے باوجود بےحد شگفتہ ہے۔ ہمارے مزاحیہ ادب کی محفل میں غلام محمد کی آمد خوش آمدید کی مستحق ہے۔

اس بات کو دیکھتے ہوئے کہ یہ سب مجموعے صرف ایک سال کے وقفے میں شائع ہوئے ہیں اور اس میں اتنا متنوع ذخیرہ بہم ہو گیا ہے جس سے خوشی ضرور ہوتی ہے، پھر بھی یہی بات دہرانے کو جی چاہتا ہے کہ ہمارے ادب کی دنیا میں جس عدم توازن کی طرف اس مختصر سے جائزہ کی ابتداء میں اشارہ کیا گیا ہے اس کو دور کرنے کی تدبیریں اختیار کرنی چاہئیں۔

ہندوستان کے تصنیفی ادارے

عبداللطیف اعظمی

اس خصوصی شمارے کا مقصد ۱۹۶۲ء کی اردو مطبوعات کا جائزہ لینا ہے، لیکن اگر اس کے ساتھ ان اداروں پر بھی ایک اجتماعی سی نظر ڈال لی جائے جو تصنیف و تالیف اور طباعت و اشاعت کا کام کرتے ہیں تو اس سے جائزہ لینے میں اور اردو کی صحیح صورت حال کے تعین میں بڑی مدد ملے گی۔

انجمن ترقی اردو۔ علی گڑھ

انجمن ترقی اردو تاریخ قیام کے لحاظ سے موجودہ تمام اداروں سے قدیم ہے، مگر با قاعدہ تصنیف تالیف کا کام بہت بعد میں بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی کوششوں سے شروع ہوا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بابائے اردو نے اپنی تنہا کوششوں سے قابل قدر کتابیں شائع کیں اور تحقیقی و تنقیدی ادب کو بہت فروغ دیا، مگر آخری دور میں وہ سیاست کے شکار ہو گئے تھے، جس کی وجہ سے اس ادارہ کو خاصا نقصان پہنچا اور اس کا صحیح اندازہ اس وقت ہوا جب ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا، مگر مولانا ابوالکلام آزاد کی توجہ اور عنایت سے حکومت ہند کی سرپرستی اسے حاصل ہو گئی اور اطمینان و سکون کے ساتھ اس کا علمی کام پھر شروع ہو گیا۔ آزادیٔ وطن کے بعد اردو کے مشہور ادیب قاضی عبدالغفار مرحوم اس کے پہلے معتمد مقرر ہوئے، ان کی وفات کے بعد پروفیسر آل احمد سرور جیسے مشہور نقاد اور ادیب کی رہنمائی اسے حاصل ہوئی۔ اس کی مطبوعات کے معیار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ساہتیہ اکیڈمی کی طرف سے اردو کی جن کتابوں پر اب تک انعام ملے ہیں ان میں بیشتر کتابیں انجمن ترقی اردو کی ہیں۔ ۶۲ء میں اس نے حسب ذیل کتابیں شائع کی ہیں :-

(۱) فرانسیسی ادب (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) (۲) فن تحریر کی تاریخ (احمد اسحٰق صدیقی)۔
(۳) ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول (ڈاکٹر ایشور ٹوپا) (۴) انتخاب کلام آنند نرائن ملا۔

(۵) انتخاب کلام شفیق جونپوری۔ (۶) انتخاب کلام نشور واحدی۔ (۷) انتخاب کلام شمیم کرہانی۔ (۸) انتخاب کلام جوہر نظامی۔

موجودہ نامساعد حالات میں بھی خالص علمی اور ٹھوس تحقیقی کتابیں خاصی تعداد میں شائع ہو رہی ہیں مگر ایسے ادارے عام طور پر کسی مخصوص حلقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو صرف ایک ایسا ادارہ ہے جو ہندوستان گیر حیثیت کا مالک ہے، اگر اس کی تنظیم کو ذرا اور وسیع کر دیا جائے اور سارے دو کے چوٹی کے مصنفین کا تعاون حاصل کرنے کی منظم کوشش کی جائے تو ان بہت سے اداروں کی کمی پوری ہو جائے گی جو نئے حالات کا شکار ہو گئے ہیں۔

دار المصنفین۔ اعظم گڈھ

ہندوستان کے تصنیفی اداروں میں دار المصنفین کو ایک خاص حیثیت حاصل ہے۔ اس نے علمی موضوعات پر سنجیدہ اور ٹھوس کتابیں شائع کر کے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ اس کے بانی مولانا شبلی نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام کے برگزیدہ مصنفین میں سے تھے۔ ان کے شاگردوں نے تصنیف و تالیف کے بلند معیار سے اس کے بانی کے نام کو روشن کیا اور تصنیف و تالیف کی ایسی روایات قائم کیں، جو اس سے قبل بڑی حد تک ناپید تھیں۔ اس سے پہلے تاریخ اسلام، سیرت رسولؐ اور مختلف مذہبی موضوعات پر جو کتابیں شائع ہوتی تھیں، عام طور پر نہ تو زیادہ [illegible] تھیں، نہ ان میں جدید میلانات و رجحانات کا لحاظ رکھا گیا تھا نہ شکل و صورت کے لحاظ سے اچھی تھیں، مگر دار المصنفین نے ایسی کتابیں شائع کیں جو دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی معیاری کتابوں سے آنکھیں ملا سکتی تھیں۔ مثلاً شعر العجم، سیرۃ النبی، خیام، سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام وغیرہ، تاریخ ہند کے مختلف پہلوؤں پر بھی اس نے ایک اچھا اور مفید سلسلہ شروع کیا ہے، اس وقت تک ۵ جلدیں شائع ہو چکی ہیں ابھی سات جلدیں اور شائع ہوں گی۔ اس کے موجودہ کارکن نامساعد حالات کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ وہ سید سلیمان ندوی اور عبد السلام ندوی کے بدل تو مہیا نہیں کر سکتے، لیکن یہی کیا کم ہے کہ ان کی قائم کردہ روایات کو باقی رکھنے کی سعی و کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ حسب معمول ۱۹۶۲ء میں اس ادارہ نے دو نئی کتابیں شائع کی ہیں، ایک ہندوستان عربوں کی نظر میں (حصہ دوم) اور دوسری گجرات کی تمدنی تاریخ (مسلمانوں کے عہد میں) یہ دونوں کتابیں تاریخ ہند کے سلسلہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

ندوۃ المصنفین۔ دہلی

ندوۃ المصنفین کا ذکر عمر کے لحاظ سے بعد میں آنا چاہئے، مگر اپنے موضوع کے لحاظ سے دارالمصنفین سے قریب تر ہے، اس لئے اس کے ساتھ ہی اس کا ذکر بھی مناسب رہے گا۔ جس طرح دارالمصنفین ندوہ اسکول سے تعلق رکھتا ہے، اسی طرح ندوۃ المصنفین دیوبند اسکول سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے بانی دارالعلوم دیوبند کے مشہور فضلاء مولانا حفظ الرحمٰن مرحوم، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا سعید احمد اکبرآبادی ہیں، اس نے بھی تاریخ اسلام اور بعض مذہبی موضوعات پر معیاری اور مفید کتابیں شائع کرکے نام پیدا کیا ہے اس نے اپنے قاعدے کے مطابق ۶۲ء میں بھی حسب ذیل چار نئی کتابیں شائع کی ہیں :۔

(۱) اسلامی دنیا دسویں صدی عیسوی میں (مؤلفہ ڈاکٹر فاروقی) (۲) معارف الآثار (مؤلفہ ڈاکٹر خواجہ عبدالرشید) (۳) دہلی سے قرات تک (اقبال انصاری صاحب) (۴) تفسیر مظہری (اردو حصہ دوم) ترجمہ مولانا عبدالدائم)۔

ان کے علاوہ نہایت اہم اور ضخیم کتابوں کے دوسرے ایڈیشن بھی شائع کئے ہیں۔

مکتبہ جامعہ۔ دہلی

مکتبہ جامعہ کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے اردو ادب کو نئے رجحانات سے آشنا کیا، اس نے ٹھوس علمی موضوعات پر سہل اور آسان زبان میں لکھنے کی طرح ڈالی، سلیس اور رواں ترجموں کی بنیاد رکھی اور حسن طباعت کو رواج دیا۔ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب جیسے ماہرین تعلیم اور ادیبوں کی رہنمائی اور مشورہ اور جناب حامد علی خاں صاحب جیسے محنتی اور فن طباعت اور نشر و اشاعت سے دلچسپی اور تعلق رکھنے والے کی سربراہی حاصل تھی۔ اس سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ اس نے مختصر عرصے میں اردو ادب کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ افسوس کہ ۴۷ء کے فساد میں اس کا تمام سرمایہ جل کر خاک ہو گیا اور یہ دوبارہ اپنی پچھلی بنیادوں پر قائم نہ ہو سکا۔ اب یہ ایک لمیٹڈ کمپنی ہے اور اس کی زیادہ تر توجہ درسی کتابوں کی طرف ہے۔ غلام ربانی تاباں جیسے مشہور شاعر کی اسے رہنمائی حاصل ہے۔ ۶۲ء میں اس نے حسب ذیل نئی کتابیں شائع کی ہیں :۔

(۱) کچھ پرانے خطوط حصہ دوم (مرتبہ پنڈت جواہر لال نہرو) (۲) اردو مثنویاں (ڈاکٹر

گوپی چند نارنگ، (۳) تذکرۂ جگر (محمود علی خاں)، (۴) ایک چادر میلی سی (راجندر سنگھ بیدی)
(۵) دو ہاتھ (عصمت چغتائی)، (۶) سات سال (مالک راج آنند)۔

ادارۂ ادبیات اردو۔ حیدر آباد

حیدر آباد (دکن) کسی زمانے میں اردو کے بہترین مرکزوں میں سے تھا اور وہاں ترجمہ اور تصنیف و تالیف کا ٹھوس کام ہوا کرتا تھا، مگر انقلاب زمانہ نے اس کی مرکزیت کو بری طرح مجروح کر دیا ہے۔ اب جو ادارے وہاں کام کر رہے ہیں، ان میں ادبیات اردو کو سب سے زیادہ شہرت حاصل ہے۔ اس نے اپنی تیس سالہ مختصر عمر میں چھوٹی بڑی ۲۷۰ کتابیں شائع کی ہیں۔ اردو میں ایک انسائیکلوپیڈیا زیر ترتیب ہے، جو دس جلدوں پر مشتمل ہوگی۔ اس کے پاس ایک قیمتی کتب خانہ بھی ہے، جس سے تصنیف و تالیف اور تحقیق و تفتیش کا کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملتی ہے۔ ایوان اردو کے قیام سے مصنفین اور محققین کے لئے مزید آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی یادگار میں ان کے نام پر ایک انسٹی ٹیوٹ بھی منی ۱۹۵۹ء میں قائم کیا گیا ہے، جس میں ان تمام مشرقی علوم و فنون پر اعلیٰ تحقیقاتی کام کیا جائے گا جن سے مولانا مرحوم کو دلچسپی تھی۔

اس ادارہ کی تمام چہل پہل، ہماہمی اور علمی ترقیاں ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور کی مساعی کی رہین منت ہیں، جو اب ہم میں نہیں رہے۔ مگر امید ہے کہ ان کے رفقائے کار اور شاگرد، جنھیں مرحوم سے گہری اور پائدار محبت ہے، ان کی اس یادگار کو نہ صرف باقی رکھیں گے، بلکہ اس کو اور ترقی دیں گے۔

ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ

ساہتیہ اکادمی اور نیشنل بک ٹرسٹ دونوں حکومت ہند کے ادارے ہیں اور یہ ہندوستان کی تمام مسلمہ علاقائی زبانوں میں مختلف موضوعات پر خاص طور پر کلاسیکی کتابوں کے ترجمے شائع کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان اداروں نے اپنی مختصر عمر میں اردو میں نہایت اہم کتابوں کے ترجمے شائع کئے ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں رابندرناتھ ٹیگور کا صد سالہ یوم پیدائش منایا گیا تھا۔ اس موقع کی مناسبت سے ساہتیہ اکادمی نے ٹیگور کی اہم کتابوں کے ترجمے کا خاص طور پر پروگرام منایا تھا، چنانچہ زیر تبصرہ سال میں اس نے جس قدر کتابیں شائع کی ہیں، وہ ٹیگور ہی سے متعلق ہیں، مثلاً (۱) کلموہی (ناول) چوکھیر بالی

ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین، (۲) تین ناٹک (ڈاک گھر، راجا، لال کنیر) ترجمہ پروفیسر محمد مجیب (۳) ایک کہانیاں ترجمہ ابو الحیات بردوانی (۴) گورا (ناول) ترجمہ سجاد ظہیر (۵) سنجوگ (ناول) ترجمہ رضا مظہری (۶) ایک سو ایک نظمیں ترجمہ حضرت فراق گورکھپوری۔ (۷) ہمارا شاعر (ٹیگور پر ایک کتابچہ) ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین۔

نیشنل بک ٹرسٹ نے ۶۲ء میں "ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم" (سردار ولبھ بھائی پٹیل میموریل لکچرز از ڈاکٹر ذاکر حسین) ترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین، بھارت ــــ آج اور کل (مولانا ابوالکلام آزاد میموریل لکچرز از پنڈت جواہر لال نہرو) ترجمہ عبداللطیف اعظمی اور دو شہروں کی کہانی (مصنفہ چارلس ڈکنس) ترجمہ فضل الرحمٰن، شائع کی ہیں۔ آخر الذکر کتاب پر تاریخ طباعت جون ۶۱ء درج ہے، مگر شائع ۶۲ء میں ہوئی ہے۔

ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ

اب تک جن اداروں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ یا تو قومی ہیں یا سرکاری۔ ان کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں نجی اور شخصی ادارے ہیں جو اردو کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مگر موجودہ کساد بازاری میں ان میں سے بیشتر مالی مشکلات سے دوچار ہیں۔ یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ادارۂ فروغ اردو کچھ عرصے سے خاصی تعداد میں معیاری اور مفید کتابیں شائع کر رہا ہے۔ ۶۲ء میں اس نے حسب ذیل کتابیں شائع کی ہیں:-

(۱) عکس اور آئینے (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) پروفیسر سید احتشام حسین رضوی (۲) بابائے اردو مولوی عبدالحق (سیرت اور علمی کارناموں پر مشہور ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ) مرتبہ عبداللطیف اعظمی۔ (۳) اردو ناول کی تنقیدی تاریخ مرتبہ ڈاکٹر احسن فاروقی اور ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (۴) غالب نام آورم (نادر تحریرات) مرتبہ نادم سیتاپوری (۵) رابندر ناتھ ٹیگور از نادم سیتاپوری۔

ادارۂ تحقیقات اردو۔ پٹنہ

چند سال ہوئے اردو کے مشہور محقق اور تنقید نگار قاضی عبدالودود صاحب نے اس ادارہ کو قائم کیا ہے۔ موصوف اس کے صدر اور قاضی محمد سعید صاحب اس کے ناظم ہیں۔ اس ادارے کے اہتمام میں ۱۹۵۹ء میں بڑے پیمانے پر ایک ادبی نمائش ہوئی تھی، جس کا افتتاح جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے کیا تھا،

جو اس وقت صوبہ بہار کے گورنر تھے۔ خطبۂ افتتاحیہ اور فہرست نمائش جلد اول (مرتبہ قاضی محمد سعید صاحب) دونوں ادارے کی طرف سے شائع ہو گئی ہیں۔ ان سے نمائش کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ادارے نے جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے مشورے سے تصانیف غالب کا صد سالہ ایڈیشن کی اشاعت کی ایک اسکیم بھی تیار کی ہے۔ کوئی گیارہ بارہ جلدیں ہوں گی امید ہے یہ سب ۱۹۶۹ء کے آخر تک شائع ہو جائیں گی پہلی جلد جو قاطع برہان اور رسائل متعلقہ (یعنی لطائف غیبی، سوالات عبدالکریم، نامۂ غالب اور تیغ تیز) پر مشتمل ہے، قاضی عبدالودود صاحب نے مرتب کیا ہے اور مقدمے اور حواشی کے ساتھ مکتبہ جامعہ کے اہتمام میں شائع ہو رہی ہے۔ دوسری جلد زیر ترتیب ہے، اس میں وہ سب کچھ شامل ہوگا جسے غالب نے برہان قاطع وغیرہ کے حواشی میں لکھا ہے، نیز ان غالب اور حامیان برہان قاطع کے مابہ النزاع مسائل سے بھی بحث کی جائے گی۔ غرض اس ادارے کے سامنے ایسے ہی مفید اور ضروری کام ہیں، قاضی صاحب جیسے محقق اور تنقید نگار کی اسے رہنمائی حاصل ہے اس لئے یہ توقع بیجا نہیں کہ اس سے تحقیقی ادب کا معیار بلند ہوگا اور اس میں بیش از بیش اضافہ ہوگا۔

دوسرے ادارے

مذکورہ بالا اداروں کے علاوہ اور بہت سے ادارے اور مکتبے ہیں جو اردو ادب کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ ان میں بمبئی کا اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس نے اپنی مختصر عمر میں تحقیق کے شعبہ میں اچھا نام پیدا کیا ہے۔ زیر تبصرہ سال میں دو معیاری کتابیں شائع کی ہیں، لغات گجری (مرتبہ پروفیسر نجیب اشرف ندوی) اور دیوان عزلت (مرتبہ عبدالرزاق قریشی صاحب) کچھ ہی عرصہ ہوا ایک تحقیقی ادارہ مجلس تحقیقات اردو کے نام سے حیدرآباد میں قائم ہوا ہے اس نے پروفیسر عبدالقادر سروری کی رہنمائی میں کئی کتابیں مرتب اور شائع کی ہیں۔ حیدرآباد میں اندھرا ساہتیہ اکیڈیمی، کتب خانہ خواتین دکن، ادارۂ تحقیقات اور مکتبہ صبا، لکھنؤ میں نسیم بک ڈپو، کتاب محل اور صدق جدید، الہ آباد میں انیس اردو اور کتابستان، علی گڑھ میں کتاب گھر، دلی میں مکتبہ شاہراہ، حالی پبلشنگ ہاؤس، آزاد کتاب گھر، انڈین اکیڈیمی، نیشنل اکیڈیمی، نیز کتاب گھر، سری نگر میں کشمیر اینڈ جموں اکیڈمی اردو کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں ان کے علاوہ نہ جانے کتنے ادارے اور مکتبے ہیں جو اردو کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں۔

وفیات سنہ ۱۹۶۲ء

("سنہ ۱۹۶۲ء میں اردو کے جن مشہور ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کا انتقال ہوا ہے، ان کے مختصر حالات زندگی ذیل میں پیش کئے جاتے ہیں، مختلف اخبارات و رسائل میں جو مضامین یا نوٹ شائع ہوئے ہیں، انھیں کو اختصار کے ساتھ شائع کیا جا رہا ہے)

آغا محمد اشرف

لاہور میں ۱۰ فروری سنہ ۶۲ء کو اردو کے نامور ادیب آغا محمد اشرف کا انتقال ہوا۔ مرحوم مولانا آزاد کے نبیرہ تھے، لندن میں قیام کے دوران میں انھوں نے بی بی سی سے جو تقریریں نشر کی تھیں وہ بعد میں لندن سے آداب عرض کے نام سے شائع ہوئیں۔

حمید نظامی

۲۵ فروری کو حمید نظامی عارضۂ قلب میں دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اپنی زندگی میں صحافی خدا معلوم کتنے دیکھ ڈالے۔ گاندھی جی، محمد علی اور ابو الکلام کو اس صف میں نہ لایئے۔ یہ لوگ اصلاً و مستقلاً لیڈر رہتے، صحافت ان کے ہاں محض ضمنی و ثانوی حیثیت رکھتی تھی، پیشہ ور صحافیوں کو عموماً قلم کا تاجر ہی پایا۔ حمید نظامی اس کلیہ میں استثنا کی ایک روشن مثال تھے۔ صحافت ان کے یہاں پیشہ نہ تھا، تجارت نہ تھی، ایک خدمت تھی، زندگی کا ایک مشن تھا، ایک طریقۂ عبادت تھا، ملت کی ٹھوس تعمیری خدمت ان کی زندگی کا نصب العین تھا، بغیر کسی کی خوشامد کئے ہوئے، بغیر کسی کی خوشامد میں آئے ہوئے، بغیر کسی کے دباؤ میں آئے ہوئے بغیر کسی پر اپنا دباؤ ڈالے ہوئے، وہ ایک زندہ ضمیر کے ساتھ اسی خدمت میں لگے رہے۔ "سنسنی خیزی" کے فن سے نا آشنا تھے، شریفوں کی پگڑی اچھالنا ان کے قلم نے جانا ہی نہیں۔ خود شریف النفس تھے، شرافت پسند تھے، شرافت کی قدر و عزت ان کی نظر میں تھی اپنی قلمی صلاحیت کو دین و ملت کی خدمت کے لئے وقف رکھا، زبردست

سے ڈرے، نہ زبردست کو ڈرایا۔ کیا ہندوستان اور کیا پاکستان، کم ہی صحافی اس معیار پر پورے اتریں گے۔

(مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ صدق جدید ۹ مارچ ۶۲ء)

شعیب قریشی

۲۵ فروری کو شام کے پونے چھ بجے کراچی میں انتقال کیا۔ علی گڑھ کے رہنے والے اور نہ ہیں کے ایک ممتاز ترین گریجوایٹ۔۔ دلیر و بیباک، غیور و خوددار، ذہین و جفاکش شروع سے تھے اور خدمت ملک و ملت کے دلدادہ۔ ۱۲ء میں بسلسلہ جنگ بلقان ڈاکٹر انصاری کے طبی مشن میں شریک ہو کر ٹرکی روانہ ہو گئے۔ انگریزی تحریر و تقریر دونوں میں قادر۔ ۱۷ء میں جب غلام حسین مرحوم ایک حادثہ کا شکار ہو گئے تو ان کے انگریزی ہفتہ وار نیو ایرا کی ایڈیٹری انھیں کے حصے میں آئی، پھر کئی سال احمد آباد میں گاندھی جی کی غیر حاضری میں ان کے شہرۂ آفاق ہفتہ وار ینگ انڈیا کو بھی چلاتے رہے۔ بیرسٹری کی تعلیم کے سلسلہ میں لندن میں مسلم آوٹ لک کی ادارت میں بھی شریک رہے۔۔۔۔

(مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ صدق جدید۔ ۹ مارچ ۶۲ء)

مولانا محمد علی امیر الحسن خدام الدین

۲۳ اور ۲۴ فروری کی درمیانی شب میں الحاج مولانا محمد علی امیر الحسن خدام الدین صاحب کا لاہور میں انتقال ہوا۔ موصوف کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔

سید محمود طرزی

اردو کے مشہور شاعر اور ناول نویس سید محمود طرزی ایک طویل علالت کے بعد ۷ اپریل کو کلکتہ میں انتقال کر گئے۔ مرحوم ۱۸۹۱ء میں مغربی اترپردیش کے شہر میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم بھی میرٹھ ہی میں حاصل کی، پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سپاہی کی حیثیت سے داخل ہوئے اور قیصر ہند کا تمغہ حاصل کیا، پھر وہ کلکتہ چلے گئے، جہاں آغا حشر، رضا علی وحشت، اللہ ناطق لکھنوی کی صحبتوں نے ان کے شعری و ادبی ذوق کو جلا دی۔

(ہماری زبان، ۲۲ اپریل ۶۲ء)

حکیم فرید احمد عباسی

۷ اپریل کو حکیم فرید احمد عباسی صاحب کا لاہور میں انتقال ہوا۔ مرحوم نے طب پر متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی

علمی حلقوں میں یہ خبر انتہائی افسوس سے سنی جائے گی کہ ڈاکٹر صوفی کا طویل بیماری کے بعد کراچی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی زندگی کا سب سے نمایاں کارنامہ "تاریخ کشمیر" ہے جو دو ضخیم جلدوں میں ہے۔ مرتے وقت ان کی عمر ۷۶ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ مرحوم اپنے پیچھے چند اور کتابیں چھوڑ گئے ہیں جنھیں ان کے لائق صاحب زادے مسٹر احمد شائع کرا رہے ہیں۔[1]

ڈاکٹر زبید احمد

ڈاکٹر صاحب عربی زبان کے ماہر تھے۔ کئی برس تک الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے ان کی ساری عمر علمی خدمت میں صرف ہوئی۔ مئی میں انتقال کیا۔[2]

مولانا عبدالشکور

حضرت مولانا عبدالشکور ۸۹ برس کی عمر میں ہم سے جدا ہوگئے۔ مرحوم صاحب تصنیف تھے اور زبردست اہل علم۔ مدت تک رسالہ "النجم" کی ادارت کے فرائض ادا کرتے رہے۔ فقہ پر چھ سات جلدیں لکھی ہیں۔ سیرت نبوی اور قرآن پاک کی روشنی میں ایک معرکۃ الآرا کتاب بھی لکھی ہے، اس کے علاوہ متعدد رسالے بھی لکھے ہیں۔[3]

منوہر لال شارب

۱۰ مئی کی شام کو حیدرآباد کے مشہور اردو شاعر منوہر لال شارب کا انتقال ہوگیا۔ مرحوم کا مجموعۂ کلام "گل شرر" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

ڈاکٹر کنور محمد اشرف

۱۰ جون کے اخبار میں ایک چھوٹی سی خبر چھپی کہ ڈاکٹر اشرف کا مشرقی برلن میں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوگیا۔ جو لوگ ڈاکٹر اشرف سے واقف تھے ان کے لئے یہ خبر ایک بہت

---

[1] ۱۸؍ اپریل ۱۹۶۲ء کو رات کے سوا بارہ بجے انتقال کیا۔

[2] مئی میں انتقال ہوا۔

[3] آخر اپریل یا پہلی مئی کو انتقال ہوا۔

بڑے سانحے کا اعلان تھی۔ اخبار والے تو ان کو صرف ایک مشہور کمیونسٹ لیڈر کی حیثیت سے جانتے تھے۔ مگر ہندوستان کے علمی حلقوں میں وہ اور بھی بہت کچھ تھے۔ تاریخ کے ایک ممتاز استاد اور ایک بلند پایہ محقق اردو کے بہت اچھے ادیب، شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھنے والے، بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک افسوس انھوں نے وطن سے اتنی دور پردیس میں جان دی۔

.... اشرف علی گڑھ کے ان فرزندوں میں سے تھے جن کی قابلیت اور صلاحیت کا دوست دشمن سب کو اعتراف تھا۔ معلوم نہیں عملی سیاست میں اشرف کا کیا کارنامہ ہے، لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر وہ اپنی ذہانت اور قابلیت کو علمی کاموں ہی میں صرف کرتے تو ہندوستان کو ایک اور بڑا مورخ مل سکتا تھا۔ ... گو ایک مقالے کے علاوہ اشرف کا کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ مگر ان کے انگریزی اور اردو کے مضامین اگر جمع کئے جائیں تو دو قابل قدر کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ مسلم فرقہ پرستی پر اشرف کے مدلل مضامین پوری کتابوں پر بھاری رہیں۔ وہ بڑی گٹھی ہوئی، جاندار اور پر زور نثر لکھتے تھے، انھوں نے فارسی اور اردو کے کلاسیکی ادب کا بڑا رچا ہوا مذاق پایا تھا۔

(پروفیسر آل احمد سرور۔ ہماری زبان ۱۵ جون ۱۹۶۲ء)

شاھد صدیقی

اردو کے مشہور شاعر شاھد صدیقی ۳۱ جولائی (۶۲ء) کو حیدرآباد (دکن) میں حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال فرما گئے۔ ... شاھد صدیقی میں یہ خوبی تھی کہ وہ ان جذبات کو جو کئی اشعار میں ادا کئے جائیں ایک شعر میں ادا کرتے تھے۔ ان کا نام عبدالمتین تھا اور وہ آگرہ میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے تھے، اور ۱۹۳۲ء سے حیدرآبادی ہو گئے تھے۔ کچھ عرصہ تک وہ سالار جنگ میوزیم میں اردو کے ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے بھی کام کر چکے تھے۔ ان کی موت سے اردو کا ہونہار شاعر اٹھ گیا۔

(کتابی دنیا۔ کراچی۔ ستمبر ۱۹۶۲ء)

مولانا حفظ الرحمن [۱]

مولانا حفظ الرحمن یوں ہونے کو کیا نہیں تھے۔ علوم و فنون اسلامیہ کے بلند پایہ عالم، نامور مصنف، ولولہ انگیز

---

[۱] مولانائے محترم کا انتقال ۲؍ اگست ۶۲ء کو ہوا۔ مرحوم پر مفصل مضمون جامعہ بابتہ ستمبر ۶۲ء میں شائع ہو چکا ہے۔ (اعظمی)

خطیب اور مقرر، جنگ آزادی کے سپہ سالار اور بیرو، مخلص اور بے لوث خادم ملک و ملت سبھی کچھ تھے۔ مگر ملک کی آزادی کے بعد انھوں نے جو رول ادا کیا اس کی تاریخ اس قدر شاندار ہے کہ اس میں کوئی ایک شخص بھی ان کا حریف و سہیم نہیں ہو سکتا۔ ... حقیقت یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے بعد یہ دوسرے شخص تھے جنھوں نے مدرسے کے بوریوں پر بیٹھ کر قدیم تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عام ہندو اور مسلمانوں کے علاوہ انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کو بھی اپنی ذہانت و ذکاوت، معاملہ فہمی و دور اندیشی اور قوت عمل سے اس درجہ غیر معمولی طور پر متاثر کیا۔ (مولانا سعید اکبر آبادی۔ برہان اگست ۶۲ء)

پروفیسر مرزا محمد سعید[1]

... مرزا صاحب بہت ہی خاموشی کام کرنے والوں میں سے تھے یعنی اتنے خاموش کہ خود ان کے زمانے کے اکثر لوگ بھی ان کے علمی اور ادبی کارناموں سے واقف نہیں ہوئے۔ دراصل خود مرزا صاحب شہرت سے گھبراتے تھے اور پبلک پلیٹ فارم پر آنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا سے بے نیاز ہو کر کام کرتے تھے اپنی تسکین کے لئے کام کرتے تھے اس لئے کہ انھیں کام کرنا ہوتا تھا۔ فرمائشی کام انھوں نے ساری عمر نہیں کئے۔ انھوں نے اب سے ۵۵ سال پہلے سر عبدالقادر کے رسالے "مخزن" میں مضامین لکھے، مگر شیخ صاحب کی فرمائش پر نہیں بلکہ جب خود ان کا جی لکھنے کو چاہا۔ مرزا صاحب کسی کو خوش کرنے کے لئے نہیں لکھتے تھے، مرزا صاحب پیسے کے لئے بھی نہیں لکھتے تھے۔ پیسے کی تو انھوں نے کبھی پرواہی نہیں کی۔ ... جب اپنا پہلا ناول "یاسمین" لکھا تو اپنے ایک شاگرد پبلشر کو بے مزد دے دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرا ناول "خواب ہستی" لکھا۔ اسے بھی بغیر کچھ لئے دئے چھپوا دیا ...(ان کی معرکۃ الآرا کتاب "مذہب اور باطنیت" مکمل ہوئی تو) ان کے دوست پروفیسر تاجور نجیب آبادی ان سے لے گئے اور لاہور سے وہ کتاب شائع ہوئی۔ مرزا صاحب کا یہی صرف ایک علمی کارنامہ ہے، مگر ایسا کارنامہ کہ اردو کی اگر سو عمدہ کتابیں چھانٹی جائیں تو ان میں "مذہب اور باطنیت" کو ضرور شریک کرنا پڑے گا۔ (شاہد احمد دہلوی۔ گنجینۂ گوہر ص ۱۷۲-۱۷۱)

---

[1] ۶ر جون ۱۹۶۲ء کو انتقال کیا۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور

۲۴ ستمبر کو اردو کے مشہور محقق، معلم اور ممتاز کارکن ڈاکٹر محی الدین قادری زور، ۵۸ سال کی عمر میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے سری نگر میں انتقال کر گئے۔

ڈاکٹر زور دو سال ہوئے چادر گھاٹ کالج حیدر آباد کی پرنسپلی سے سبکدوش ہوئے تھے کچھ دن کے بعد وہ جموں و کشمیر یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں کو تیز کیا اور سری نگر کی ادبی فضا میں اور حرکت پیدا کی۔ حیدر آباد کے قیام کے زمانے میں نہ صرف انھوں نے خود بہت سی کتابیں لکھیں بلکہ نئے ادیبوں کی ہمت افزائی کر کے ان کے کارناموں کو بھی منظر عام پر لائے۔ انھوں نے دکنی ادب کے متعلق تحقیق و تدقیق کا ایک قابل قدر ذخیرہ پیش کیا، دکن کے مشاہیر کے کلام کو ایڈٹ کر کے عوام کے سامنے لائے، لسانیات پر جدید اصولوں کی روشنی میں سب سے پہلے کتابیں لکھیں، ادارۂ ادبیات اردو کے نام سے ایک شاندار ادبی ادارہ قائم کیا، جس کی آج اپنی ایک شاندار عمارت ہے اور جس میں مخطوطات، مطبوعات، خطوط، رسائل اور دوسرے نوادر کا ایک یادگار ذخیرہ ہے۔ اپنے شاگردوں اور رفیقوں کو تصنیف و تالیف کا ایسا شوق دلایا کہ لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام پر ایک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ محمد قلی قطب شاہ کی یاد میں ایسے جلسے کئے کہ اب ان کی حیثیت ایک قومی میلے کی ہو گئی۔ (پروفیسر آل احمد سرور۔ ہماری زبان، ۸ اکتوبر ۶۲ء)

قابل اجمیری

۲ اکتوبر کو حیدر آباد میں پاکستان کے مشہور شاعر قابل اجمیری رحلت فرما گئے۔ موصوف نے کم عمری میں اپنی شاعرانہ حیثیت منوالی تھی۔ اردو غزل کے اس جواں مرگ شاعر سے بڑی امیدیں تھیں۔ (کتابی دنیا کراچی، اکتوبر ۶۲ء اور صبا حیدرآباد دکن، اکتوبر و نومبر ۶۲ء)

حضرت نوح ناروی

۱۲ اکتوبر کی رات کو اردو کے مشہور کہن سال شاعر حضرت نوح ناروی الہ آباد میں انتقال کر گئے۔ موصوف کے انتقال سے ایک مخصوص طرز، ایک مخصوص انداز کا خاتمہ ہو گیا۔ حضرت نوح نے بہت کہا

بہت سے شاگرد چھوڑے اور ہر صنف شاعری میں طبع آزمائی کی، لیکن اپنی پوری شاعری میں وہ ایک مخصوص رنگ ایک مخصوص مزاج کے نمائندے رہے۔ ہماری شاعری کا یہ رنگ، یہ مزاج ان کے ساتھ ختم ہو گیا۔

پہلے پہلے شاعروں میں انھوں نے میر نجف علی نجف سے اصلاح لی پھر انھیں کے کہنے پر متعدد اساتذہ سے خط و کتابت کی، آخر میں حضرت داغ دہلوی کے شاگرد ہوئے اور ایسے شاگرد ہوئے کہ اپنے استاد کے نام کو بھی اپنے نام کے ساتھ روشن کر دیا۔

.. حضرت داغ کی صحبت میں جہاں اور بہت سی باتیں انھیں معلوم ہوئیں وہاں اصلاح دینے کا ملکہ بھی حاصل ہوا۔ ان کی اصلاح میں یہ خاص خوبی تھی کہ مضمون وہی رہتا ہے، لیکن دو ایک الفاظ کے الٹ پھیر اور مقدم مؤخر کے تغیر و تبدل سے شعر کچھ سے کچھ ہو جاتا تھا۔

• "گنجینۂ نوح" دیوان اول میں ۲۲۵ صفحے، ۲۶۴ غزلیں اور ۳۱۷۶ اشعار ہیں۔ اگرچہ یہ ابتدائی زمانہ کا یہ کلام ہے، مگر اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچپن ہی سے انھوں نے کیسے اچھے اچھے شعر کہے ہیں۔ دوسرا دیوان "طوفان نوح" بہت دنوں کے بعد شائع ہوا۔ پہلے دیوان میں استاد کا تصرف تھا، دوسرے میں خاص انھیں کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے۔ تیسرے دیوان "اعجاز نوح" میں شاعری کے جامع محاسن موجود ہیں۔ محاسن شعری میں سب سے زیادہ قابل تعریف سہل ممتنع ہے، اس کی نظیریں کثرت سے دیکھنے والوں کو ملیں گی۔ ان کے قلم سے بیشتر ایسے شعر نکلے ہیں جن کے لئے دوسرے الفاظ نہیں مل سکتے۔ اگر کوئی مکرر نظم کرنا چاہے تو وہی الفاظ سامنے آئیں گے جو استعمال ہو چکے ہیں۔ حضرت نوح ناروی ۱۸۷۹ء میں پیدا ہوئے۔ (قومی آواز، لکھنؤ)

مولانا سعید انصاری[1]

علمی حلقوں میں یہ خبر یقیناً رنج و افسوس کے ساتھ سنی جائے گی کہ مشہور مصنف مولانا سعید انصاری کا انتقال ہو گیا۔ مولانا مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی کے تربیت یافتہ تھے۔ ان ہی کے دامن فیض نے انھیں ایک بلند پایہ مصنف بنا دیا۔ ان کی کتاب "سیر الصحابیات" علمی حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھی گئی۔ تقسیم ہند کے بعد مولانا کچھ عرصہ تک ہندوستان رہے، پھر پاکستان تشریف لے آئے۔ یہاں انھیں ان کے مذاق کا کام مل گیا، یعنی پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ انسائیکلو پیڈیا سے وابستہ ہو گئے اور اپنی ساری سرگرمیاں

---

[1] وفات معلوم نہ ہو سکی۔ نومبر کے پرچے میں یہ خبر شائع ہوئی ہے اس لئے قیاس ہے کہ اکتوبر میں انتقال ہوا ہوگا۔ (اعظمی)

اسی کام پر مرکوز کر دیں ۔ (مولانا رئیس احمد جعفری ۔ ثقافت (لاہور) نومبر ۱۹۶۲ء)

ڈاکٹر غلام یزدانی [۱]

۲؍ نومبر کی رات کو ڈاکٹر غلام یزدانی اس جہاں سے سدھار گئے ۔ ڈاکٹر یزدانی کا وطن یوں تو دہلی تھا لیکن وہ تقریباً پچھلے پچاس سال سے حیدرآباد میں رہ رہے تھے اور حیدرآباد کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر یزدانی ایک ماہر آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر تھے۔ ان کی علمی، ادبی اور تہذیبی خدمات کے اعتراف کے طور پر ایڈورڈ ہشتم کی سالگرہ کے موقع پر انھیں او۔بی۔ای کا خطاب دیا گیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی اور عثمانیہ یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دی اور ۱۹۵۸ء میں حکومت ہند نے انھیں پدما بھوشن کا اعزاز عطا کیا تھا۔ یزدانی صاحب نے اپنے فن پر اردو اور انگریزی میں کئی بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں، جن کو اہل نظر اپنی آنکھوں کا سرمہ سمجھتے ہیں۔ انتقال کے وقت یزدانی صاحب کی عمر پورے اسّی سال تھی۔

(ساباں ادیب، صبا، اکتوبر و نومبر ۶۲ء)

سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ

۲۶ دسمبر ۱۹۶۲ء کو سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا حرکتِ قلب بند ہو جانے سے دلّی میں انتقال ہو گیا۔ مرحوم کی تعلیمی اور علمی خدمات کا سلسلہ بیسویں صدی کے آغاز سے شروع ہوتا ہے۔ ۷۰ سال تک آپ رسالہ "رہنمائے تعلیم" کی پرورش کرتے رہے۔ یہ رسالہ کہنے کو تعلیمی تھا لیکن ایک زمانے میں اس کی ادبی اور ثقافتی حیثیت ایسی تھی کہ اس پایے کے رسالے ملک میں کم تھے۔ ڈاکٹر اقبال، منشی پریم چند، غلام بھیک نیرنگ، فصاحت جنگ جلیل، حسرت موہانی ایسے باکمال اس رسالے میں لکھتے تھے۔ اور متواتر لکھتے تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جوبلی نمبر شائع ہوا تو صحافتی دنیا میں ایک انقلاب رونما ہوا۔ اس کے بعد فسانہ نمبر، ریڈ کراس نمبر اور نہ جانے کتنے نمبر شائع ہوئے۔ ۱۹۴۵ء میں ریڈ کراس نمبر شائع ہونے کے بعد حکومت وقت نے انھیں سردار صاحب کے خطاب سے نوازا۔

(عرش ملسیانی ۔ آج کل، فروری ۱۹۶۳ء)

(بقیہ وفیات ملاحظہ ہو صفحہ ۶۰)

---

[۱] مرحوم پر ایک مفصل مضمون جامعہ کی اگلی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔

۱۹۶۲ء کی مطبوعات پر ایک سرسری نظر

(اس مرتبہ ۱۹۶۲ء کی مطبوعات کی ایک مکمل فہرست شائع کرنے کا ارادہ تھا مگر بڑی کوششوں کے بعد جو فہرست مرتب ہوئی اسے کسی طرح مکمل نہیں کہا جا سکتا تھا، اس لئے اب صرف ان کتابوں کی فہرست شائع کی جاتی ہے، جو ہمیں تبصرہ کے لئے وقتاً فوقتاً موصول ہوتی رہیں)

نام کتاب	مصنف	ناشر
	تاریخ	
گجرات کی تمدنی تاریخ (مسلمانوں کے عہد میں)	مولانا ابوظفر ندوی مرحوم	دار المصنفین - اعظم گڑھ
ہندوستان عربوں کی نظر میں (جلد دوم)	. . . . .	"
فن تحریر کی تاریخ	محمد اسحاق صدیقی	انجمن ترقی اردو - علی گڑھ
ہندی مسلمان حکمرانوں کے سیاسی اصول	ڈاکٹر ایشور ٹوپا	"
	مذہب	
سرچشمۂ قرآن	ابو الفدا محمد عبد القادر	حیدر اینڈ سنز، چار کمان، حیدرآباد
	تعلیم	
ہندوستان میں تعلیم کی از سر نو تنظیم	ڈاکٹر ذاکر حسین (ترجمہ: ڈاکٹر سید عابد حسین)	نیشنل بک ٹرسٹ - نئی دہلی
تدریس اردو	فرمان فتحپوری	مکتبہ جامعہ تعلیم ملی - ملیر - کراچی
	سیاسیات	
بھارت - آج اور کل	پنڈت جواہر لال نہرو، ترجمہ: عبد اللطیف اعظمی	نیشنل بک ٹرسٹ - نئی دہلی

سوانح حیات اور خاکے

مولانا محمد علی	مرتب پروفیسر محمد سرور	سندھ ساگر اکادمی ۔ لاہور
بابائے اردو مولانا عبدالحق	مرتب عبداللطیف اعظمی	ادارۂ فروغ اردو۔ لکھنؤ
گنجینۂ گوہر	شاہد احمد دہلوی	مشتاق بک ڈپو۔ شلٹن روڈ۔ کراچی
لینن	. . . . . .	سول ایجنسٹ، آزاد کتاب گھر، کلاں محل دہلی
اہل سیف	برہما ناتھ دت	مولف ۔ ۱۷۔ کرشنا مارکٹ ۔ امرتسر
امام الہند (تعمیر افکار)	ابوسلمان الہندی	مکتبۂ اسلوب ۔ کراچی
تذکرہ حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت	سخاوت مرزا	انسٹی ٹیوٹ آف انڈو ایسٹ کلچرل اسٹڈیز ۔ حیدر آباد ۔
یاد جگر	درگا پرشاد شاد سلطان پوری	مولف ٹیچر ماڈل ہائر سکنڈری اسکول بھوپال
یاد امجد	ادارۂ "سب رس"	ادارۂ ادبیات اردو ۔ حیدر آباد ۔
تاریخ ناصری (تذکرۂ آل پاک)	سید حامد علی نقوی	مولف ۔ کراچی

تاریخِ ادب، مقالے اور تنقیدی مضامین

فرانسیسی ادب	ڈاکٹر یوسف حسین خاں	انجمن ترقی اردو ۔ علی گڑھ
آندھی میں چراغ	ڈاکٹر خواجہ غلام السیدین	انڈین اکیڈمی ۔ نئی دہلی
انشائے ماجد (دوم) دوسرا ایڈیشن	مولانا عبدالماجد دریا بادی	صدق جدید بک ایجنسی ۔ لکھنؤ
افکار نو (تنقیدی مضامین)	فیض الرحمٰن اعظمی	اردو مرکز ۔ دہلی

تحقیقی ادب

تاریخ صحافت اردو (جلد دوم کا پہلا حصہ) مولانا امداد صابری حسن زماں ۔ تالی گنج کلکتہ ۔

(بقیہ کتابوں کی فہرست مضمون "تحقیقی ادب" میں ملاحظہ ہو۔ مذکورہ بالا کتاب بعد میں موصول ہوئی اس لئے جائزہ میں اسے شریک نہیں کیا جا سکا ۔)

ناولٹ، ناول اور مزاحیہ ناول

ایک چادر میلی سی	راجندر سنگھ بیدی	مکتبہ جامعہ - دہلی
امر جوت (سماجی ناول)	نکٹ پرشاد	کتاب خانہ - عابد روڈ - حیدرآباد
پاندان والی خالہ (طنزیہ مزاحیہ ناول)	مخلص بھوپالی	پنج بھوت پبلیکیشنز جہانگیر آباد بھوپال

بچّوں اور نو سکھ بالغوں کی کتابیں

برف کا گھر	محمد حسین حسان	ادارۂ تعلیم و ترقی جامعہ ملیہ - دہلی
موسم کے بارے میں (دس سوالات اور ان کے جوابات)	محمد امین	" " " "
برف کے پتھر تے پہاڑ	مجیب احمد خاں	" " " "
مہینوں کی کہانیاں	جیب ابراہیم	ادارۂ ادبیات اردو - حیدرآباد

متفرقات

خدا اور دیوتا	جبران خلیل جبران	مکتبہ ماحول - کراچی
بلوچوں کے درمیان (لوک کہانیاں اور شخصیات)	انجم قزلباش	قلات پبلیشرز مستونگ
فرشتے کہہ رہے ہیں	طاہر	طاہر بک ڈپو - بمبئی

نظم

شاد عارفی (انتخاب غزل)	مرتب عابد رضا بیدار	نیا خواب رام پور
برگ و بار	برہم ناتھ دت قاصر مولف	۷ اکرشنا مارکٹ امرتسر

(بقیہ کتابوں کی فہرست مضمون "شعری ادب" میں ملاحظہ ہو۔ ہمیں افسوس ہے کہ یہ دونوں کتابیں، تاخیر سے موصول ہونے کی وجہ سے، جائزہ میں شریک نہ کی جا سکیں۔)

عرض مرتب

جائزہ نمبر آپ کی خدمت میں حاضر ہے، پچھلے سال کے جائزہ نمبر کو اہل نظر نے عام طور پر پسند کیا تھا۔ مگر چند ادیبوں نے یہ شکایت بھی کی تھی کہ بعض مضامین میں جائزے اور تبصرے میں فرق نہیں کیا گیا ہے اور بعض کتابوں کے متعلق اظہار رائے میں انتہا پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ امسال ہم نے اپنے مقدور بھر کوشش کی ہے کہ اظہار رائے میں اعتدال اور توازن سے کام لیا جائے اور یہ شمارہ ۱۹۶۲ء کی ادبی رفتار کا مکمل آئینہ دار ہو۔ یہ پہلی کوشش ہے، جہاں تک ہمارا خیال ہے پوری طرح کامیاب ہوئی ہے مگر دوسرے معاملے میں خود ہمیں اطمینان نہیں ہے۔ پاکستانی مطبوعات کے متعلق ہم ہندوستانیوں کی واقفیت محدود ہوتی ہے اس مرتبہ یہ مضمون اس قدر تفصیل سے لکھا گیا ہے کہ وہاں کی ادبی رفتار کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے مگر افسوس کہ ہندوستانی مطبوعات کا جائزہ کچھ تشنہ رہا۔ طوالت سے بچنے کے لئے ہم نے صرف ان ہی اصناف ادب پر لکھنے کی دعوت دی تھی، جن پر زیادہ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ بدقسمتی سے مجوزہ مضامین میں سے بھی ایک مضمون جو بہت ضروری تھا، بار بار کے وعدہ کے باوجود تادم تحریر موصول نہیں ہوا، حالانکہ اسی کی خاطر یہ شمارہ ایک ماہ کے لئے موخر کرنا پڑا۔ اور دو ماہ کا مشترک نمبر شائع کرنا پڑا۔ ہماری خواہش تھی کہ ۶۲ء کی مطبوعات کی مکمل فہرست شائع کی جائے، بڑی کوشش اور محنت کے بعد جو فہرست تیار ہوئی اس کے صحیح اور مکمل ہونے کا یقین نہیں تھا اس لئے اس کو چھوڑنا پڑا۔ مگر جہاں ان خامیوں پر ہمیں افسوس ہے وہاں اس کی خوشی بھی ہے کہ "دینیات" پچھلے سال کے مقابلہ میں زیادہ بہتر اور مکمل ہے۔ نیز "ہندوستان کے تصنیفی ادارے" کے عنوان سے ایک مضمون کا اضافہ کیا گیا ہے، چونکہ اس کے لکھنے کا ارادہ عین وقت پر کیا گیا، اس لئے بہت ممکن ہے کہ بعض اداروں کے بارے میں ضروری معلومات رہ گئی ہوں اور ممکن ہے کوئی ادارہ اہم کام کر رہا ہو اور ہمارے علم میں نہ ہو۔ آئندہ سال ہم اس کمی کی تلافی

کرنے کی کوشش کریں گے اور پاکستان کے تصنیفی اداروں پر خاص طور پر مضمون لکھوانے کی کوشش کریں گے۔

بہرحال یہ جائزہ نمبر جیسا بھی ہے آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ تبصرہ نگار اور اصحاب نظر اپنی بے لاگ رایوں سے آگاہ فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ اظہار رائے کرتے وقت، بڑا کرم ہوگا، اگر وہ اسے بھی پیش نظر رکھیں کہ جو ادیب جتنا مشہور اور بڑا ہے اتنا ہی مصروف اور بے نیاز بھی ہے، اردو کے ناشروں کو اس طرح کے منصوبوں میں، اپنے فائدے کی خاطر بھی، تعاون کرنے کی کچھ زیادہ خواہش نہیں، کتابوں پر تاریخ طباعت عام طور پر درج نہیں ہوتی، تبصرہ نگار کتاب کی ضخامت، سائز اور قیمت وغیرہ لکھیں گے، لیکن اگر تاریخ طباعت درج ہو تب بھی اس کا ذکر نہیں کریں گے، عام طور پر ان ہی ادیبوں اور شاعروں کی وفات کی خبریں شائع کی جاتی ہیں جو غیر معمولی شہرت کے مالک ہوں یا کسی مدیر سے ذاتی تعلقات ہوں، لیکن ایسی خبریں بہت کم ہوتی ہیں، جن میں تاریخ وفات درج ہو۔ اس نمبر میں "وفیات" کے تحت جو نوٹ اور خبریں شائع کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر میں بعد میں تحقیق کر کے تاریخ وفات کا اضافہ کیا گیا ہے بعض کی تاریخ وفات باوجود کوشش کے معلوم ہی نہ ہو سکی۔ ہم نے جب یہ صورت حال ایک مخدوم اور بزرگ سے بیان کی تو انھوں نے فرمایا 'شعر گفتن چہ ضرور؟' اگر یہی رائے ہمارے خریداروں اور تبصرہ نگاروں کی بھی ہو تو ہمیں اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔

عبداللطیف اعظمی

۳ جون ۱۹۶۳ء
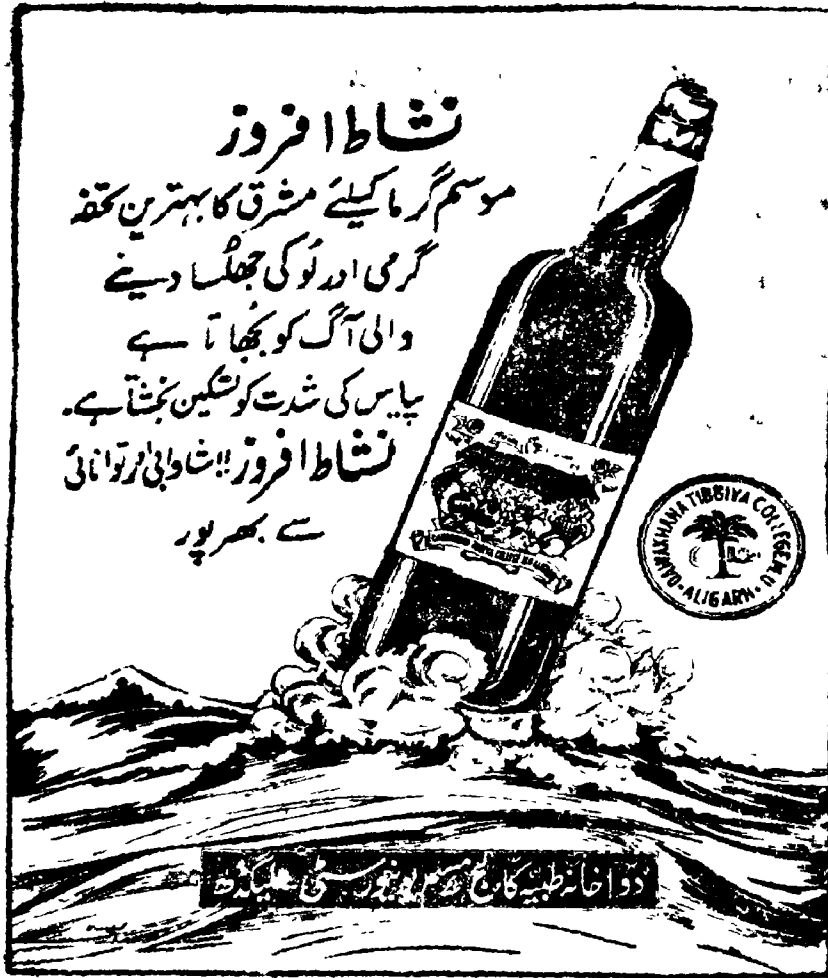
ماہنامہ جامعہ کی تاریخ روانگی

ماہنامہ جامعہ ہر ماہ کی پانچ یا چھ کو پوسٹ کیا جاتا ہے۔ رسالہ نہ ملنے کی شکایت کی تعمیل اگلے ماہ کی انیس تاریخوں میں سے کسی کو کی جائے گی۔

طابع و ناشر: عبداللطیف اعظمی　　مطبوعہ: یونین پریس دہلی　　ٹائیٹل: دیال پریس دہلی

Regd. No. D-168

ANNUAL NUMBER

THE MONTHLY JAMIA, - NEW DELHI-25

June 19